انسانی دنیا پر
مسلمانوں کے عروج و زوال
کا اثر
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
مجلس نشریات اسلام
۱۔ کے۔ ۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد، کراچی ۱۸

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ

مجلس نشریات اسلام
ا۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

- ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
- رکن مجلس انتظامی و مجلس علمی دار المصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی

نام کتاب ———— انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
تصنیف ———— مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ
طباعت ———— احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی
ضخامت ———— ۴۰۰ صفحات

ٹیلیفون : 6601817

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

۱۔ عربی	(کویت)	چودھواں ایڈیشن
۲۔ انگریزی	(لکھنؤ)	چھٹا 〃
۳۔ اردو	(لکھنؤ)	گیارہواں 〃
۴۔ فارسی	(ایران)	دوسرا 〃
۵۔ ترکی	(انقرہ)	دوسرا 〃

۶۔ فرنچ اور جنوبی ایشیاء کی بعض دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

فہرست مضامین

"انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

باب دومؑ

بعثتِ محمدی کے بعد

باب سوم

مسلمانوں کا دورِ قیادت ۱۳۲-۱۵۷

باب چہارم

مسلمانوں کا تنزل ۱۵۸-۱۹۵

دیباچہ طبع یازدہم

الحمد للہ کہ کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے گیارہویں بار شائع ہونے کی نوبت آئی، علاوہ متعدد بار شائع ہونے کے اس کو اہلِ علم اور مصنفین کے حلقہ میں جو قبولیت اور وقعت حاصل ہوئی ناچیز مصنف کو اس کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا۔[1]

کتاب کا انگریزی ترجمہ (ISLAM & THE WORLD) (اسلام اینڈ دی ورلڈ) کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، اس سلسلہ میں قارئین کو یہ معلوم کر کے دلچسپی اور خوشی ہوگی کہ جب اس کتاب کو اس ادارہ نے اپنے علمی مبصروں اور ماہرینِ فن کے سامنے اظہار رائے کے لئے پیش کیا تو ڈاکٹر بکنگھم (لندن یونیورسٹی میں "ادارۂ مشرق وسطیٰ" (MIDDLE-EAST SECTION) کے چیرمین نے ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا کہ کتاب کو

---

[1] اصل کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، وہ عرب دنیا میں جتنی مقبول ہوئی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے چودہ قانونی ایڈیشن نکل چکے ہیں، غیر قانونی ایڈیشن جو مصنف کی اجازت اور علم کے بغیر شائع ہوئے وہ بیش سے زیادہ ہوں گے، بعض (قانونی) ایڈیشن ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوئے اور جلد نکل گئے۔

برطانیہ سے شائع ہونا چاہئے، کیونکہ اس صدی میں عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جو کوشش بہتر سے بہتر طریقہ پر ہوئی ہے، اس کا یہ نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے" ادارہ نے اس کو ایک دوسرے صاحب نظر اور ماہر اسلامیات نامور مستشرق پروفیسر مونٹگمری واٹ صدر شعبۂ اسلامیات ایڈنبرا یونیورسٹی کے حوالہ کیا کہ وہ اپنی فیصلہ کن رائے دیں، انھوں نے اس کتاب کو اشاعت کا مستحق قرار دیا اور اس کی طباعت کی تائید کی۔

ایران کے ایک سنجیدہ اور باوقار اسلامی ادارہ "جلسات علمی اسلام شناسی" (قم) نے اس کا فارسی ترجمہ "یا صحت طلبین دنیا در خطر سقوط" کے نام سے شائع کیا ہے، معلوم ہوا ہے کہ وہ ایران میں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے، ترکی میں وہ کئی بار شائع ہوئی، اور ذوق و شوق سے پڑھی گئی، فرنچ میں بھی اس کے ترجمہ کی اجازت مانگی گئی اور مصنف کی طرف سے اجازت دی گئی، جنوبی ایشیا کی بھی مختلف زبانوں میں کتاب کا ترجمہ ہوا۔

کتاب کی کمیابی کی وجہ سے کتاب کی جو طلب و خواہش پیدا ہو گئی تھی امید ہے کہ اس جدید اشاعت سے اس کی تکمیل ہوگی۔

ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۷ھ

۵ جولائی سنہ ۱۹۵۷ء

کچھ کتاب کے متعلق

الحمد للہ رب العالمین، وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

پیش نظر کتاب کا ابتدائی تخیل ایک مضمون سے زیادہ نہ تھا، ابتدا میں خیال تھا کہ اجمالی طور پر ان نقصانات کی نشان دہی کی جائے جو مسلمانوں کے تنزل وزوال اور دنیا کی قیادت و رہنمائی سے کنارہ کش ہو جانے سے انسانیت کو پہونچے اور دکھایا جائے کہ زندگی کے نقشہ میں ان کی جگہ اور قوموں کی صف میں ان کا مقام کیا ہے؟ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مجرمانہ کوتاہی کا احساس ہو جو انھوں نے انسانیت کے حق میں کی اور اس کی تلافی اور اصلاحِ حال کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو، اسی کے ساتھ دنیا کو اپنی اس بد قسمتی کا بھی علم ہو جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بنا پر دوچار ہونا پڑا، اس کو محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخدا ترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر ان خدا شناس اور خدا ترس انسانوں کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے پاس آخری پیغمبر کی شریعت اور دین و دنیا کی رہنمائی کا مکمل دستور موجود ہے۔

اس مقصد کے لئے عام انسانی تاریخ، نیز اسلامی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا گیا اور دکھایا گیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس جاہلی ماحول میں ہوئی، انسانیت کس پستی کو پہونچ چکی تھی، آپ کی دعوت اور تربیت نے کس طرح کی امت تیار کی، اس امت کے عقائد و اخلاق اور سیرت و تربیت کیا تھی، اس نے کس طرح دنیا کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی، اس کے اقتدار اور امامت کا دنیا کی تہذیب اور زندگی اور لوگوں کے رجحانات اور کردار پر کیا اثر پڑا، کس طرح دنیا کا رخ ہمہ گیر خدا فراموشی اور مجموعی جاہلیت سے ہمہ گیر خدا پرستی اور اسلام کی طرف تبدیل ہوا، پھر کس طرح اس امت میں انحطاط اور زوال کا آغاز ہوا اور اس کو دنیا کی امامت اور قیادت سے علیحدہ ہونا پڑا، اور کس طرح یہ قیادت کمزور و غافل خدا شناسوں کے ہاتھ سے نکل کر طاقتور ناخدا شناس اور مادہ پرست یورپ کی طرف منتقل ہوئی، خود یورپ میں اس مادہ پرستی اور مذہب بیزاری کا کس طرح ظہور اور ارتقا ہوا، مغربی تہذیب کا اصلی مزاج کیا ہے، اور اس کا خمیر کن عناصر و اجزا سے تیار ہوا ہے، یورپ کے اقتدار اور اس کی قیادت نے دنیا پر کیا اثر ڈالا اور زندگی کو کس طرح متاثر کیا، دنیا کا رخ کیا ہے، اور مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے اور وہ اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

تحریر کے دوران ہی میں مصنف کو محسوس ہو گیا کہ یہ مضمون ایک مقالہ کا نہیں بلکہ مبسوط کتاب کا ہے، اور اس کتاب کی تالیف وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، خود مسلمانوں کا ذہن اس بارہ میں صاف نہیں ہے، وہ اپنا زندگی سے کوئی تعلق اور ربط محسوس نہیں کرتے اور اس دنیا کی اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کے زوال کو ایک قومی حادثہ اور مقامی واقعہ سمجھتے ہیں، اور ان کو مطلقاً اس کا احساس نہیں کہ یہ کتنا بڑا عالمگیر سانحہ اور انسانیت کی کیسی بڑی بدقسمتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظر انداز

کر کے ہم نہ اسلامی تاریخ کو سمجھ سکتے ہیں، نہ انسانی تاریخ کو، نہ اس دور کی صحیح تشخیص کر سکتے ہیں جو ابھی دنیا میں قائم ہے، نہ اس عالمگیر انقلاب کے صحیح اسباب متعین کر سکتے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں رونما ہوا، اور وہ اسلامی انقلاب کے بعد سب سے بڑا انقلاب ہے، فرق یہ ہے کہ پہلا انقلاب شر سے خیر کی طرف تھا، یہ خیر سے شر کی طرف ہے، پہلا انقلاب بعثتِ محمدی اور دعوتِ اسلامی کے عروج کا نتیجہ تھا، دوسرا انقلاب امتِ محمدی کے انحطاط اور دعوتِ اسلامی سے تغافل کا نتیجہ ہے، مسلمانوں میں خود اعتمادی کی روح اسلام کی طرف بازگشت کا جذبہ اور جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان کو اپنا مقام یاد دلایا جائے اور جتلایا جائے کہ وہ دنیا کی تعمیر و تشکیل کے اہم اور مقدس کام میں ایک موثر و فعال عنصر (FACTOR) ہیں، کسی چلتی ہوئی مشین کا پرزہ اور کسی اسٹیج کے بازی گر اور نقال (ACTOR) نہیں ہیں۔

جس ملک و ماحول سے مصنف کا تعلق تھا، اور جہاں اس کتاب کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا تھا، اس کا اقتضا تھا کہ یہ کتاب اس ملک کی زبان (اردو) میں تصنیف کی جائے لیکن ایک خاص خیال کے ماتحت اس کتاب کی تصنیف کے لئے اردو کے مقابلہ میں عربی کو ترجیح دی گئی۔

عربی زبان کی ترجیح و انتخاب کا محرک باعث یہ احساس تھا کہ عرب ممالک اس احساسِ کمتری اور مرضِ خود فراموشی کا سب سے زیادہ شکار ہیں، دنیا نے اگرچہ انھیں سے نئی زندگی اور نیا ایمان پایا ہے لیکن آج انھیں کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور انھیں کا سمندر سب سے زیادہ پُرسکون ہے، اقبال نے آج سے چند برس پہلے ان ملکوں کو دیکھ کر بجا نہیں کہا تھا کہ ؎

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے | دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی | اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

یورپ کے قرب مخصوص سیاسی حالات اور ان دیوانوں کی کمی سے جو خوش قسمتی سے ہندستان کی

سرزمین میں برابر پیدا ہوتے رہے اور عرب کی مقدس سرزمین عرصہ سے ان کے وجود سے محروم تھی عرب کو یورپ کی شیشہ گری اور فرزانگی کا آسانی سے شکار بن جانے دیا، شیخ حسن البناء مرحوم اور ان کی تحریک اور جماعت الاخوان المسلمون سے پہلے پورے مشرقِ اوسط میں کوئی طاقتور اسلامی تحریک اور جدوجہد نہیں تھی اور کہیں بے چینی اور اولوالعزمی کے آثار نظر نہیں آتے تھے لوگوں نے یا تو زمانہ سے صلح کر لی تھی یا مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے یا بہاؤ پر اپنی کشتی ڈال دی تھی، ان ممالک کے حالات پر نظر رکھنے والا اور ان کے ماضی و حال کا موازنہ کرنے والا بڑے درد و حسرت سے کہہ رہا تھا ؎

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں ۔۔۔ گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس تکلیف دہ احساس نے قلم کا رُخ اردو سے عربی کی طرف موڑ دیا، عرب اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیہ کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں کہ بین الاقوامی سیادت سنبھالیں اور پوری متمدن دنیا پر اثر ڈالیں ان کے ممالک بحرِ احمر اور بحرِ متوسط کے کنارے واقع ہیں وہ مغرب و مشرقِ بعید کے درمیان میں ہیں، نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے عرب ممالک اور مشرقِ اوسط سے زیادہ موزوں سرزمین کوئی اور نہیں ہو سکتی، یہ سب اسباب و محرکات تھے جن کی بنا پر ہندی نژاد مصنف نے عربی زبان کو اس اہم موضوع کے لئے انتخاب کیا اور یہ کتاب سب سے پہلے عربی میں لکھی گئی جس کا نام "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" تھا۔

اسی عرصہ میں (۱۹۴۷ء میں) حجاز کا پہلا سفر پیش آیا وہاں پہلی بار مصنفِ کتاب کو اس ملک اور اہلِ ملک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جن کے لئے یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی حجاز کے قیام اور عالمِ عربی کے لوگوں سے تعارف نے اس خیال کو اور تقویت پہونچائی اور اس کتاب کے جلد سے جلد شائع ہونے کی ضرورت کا احساس بشدت پیدا ہوا مکہ معظمہ کے دورانِ قیام میں مصنف کو محسوس ہوا کہ کتاب کا پہلا باب بہت تشنہ ہے ضرورت ہے کہ جاہلیت کے خدوخال کو پوری وضاحت سے پیش کیا جائے اور پوری تفصیل سے دکھایا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت

دنیا کی حالت کیا تھی، اور وہ کیا دینی و اخلاقی، اجتماعی، سیاسی و معاشی ماحول تھا جس میں اسلام کی دعوت نمودار ہوئی، اسلامی انقلاب کی عظمت اور اس کا محیر العقول کارنامہ اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ جاہلیت کا پورا ماحول اور اس کا نقشہ سامنے نہ ہو، اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جاہلیت کا پورا مرقع پیش کیا جائے اس موقع پر یہ معلوم ہو کہ جاہلیت کے متعلق بہت کم مواد یکجا ملتا ہے کچھ منتشر معلومات ہیں جو ہزاروں صفحات اور بیسیوں کتابوں میں متفرق ہیں، اس کو جمع کرنا اور ان منتشر و متفرق اجزاء سے جاہلیت کا پورا مرقع تیار کرنا جس سے اس دور کی پوری زندگی سامنے آجائے سیرت نبوی کی بہت بڑی خدمت ہے مکہ معظمہ میں مصنف کو قدیم و جدید عربی مطبوعات کا ایسا ذخیرہ ملا جس سے اس مرقع کی تیاری میں بڑی مدد ملی، ہندوستان میں بھی مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا[1] اور یہ باب تکمیل کو پہونچ کر کتاب میں شامل ہوا اور اس سے کتاب میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال پیدا ہوا کہ بعثتِ محمدی کے اثرات اور دعوتِ اسلام کے امتیازات و خصوصیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے اس دعوت کا مزاج اور اس کا طریق کار کیا ہے انبیاء علیہم السلام اپنے زمانہ کی بگڑی ہوئی دنیا کی کس طرح اصلاح کرتے ہیں، ان کی دعوت اور جد و جہد کا انداز دوسرے مصلحین و قائدین سے کس قدر مختلف ہے، ان کی دعوت کا رد عمل و استقبال کس طرح ہوتا ہے، جاہلیت کس طرح ان کے مقابلے پر آتی ہے اور کیا حربے استعمال کرتی ہے وہ کس طرح اپنے متبعین کی تربیت کرتے ہیں، پھر ان کی دعوت کس طرح فتح حاصل کرتی ہے اور کس طرح کے اثرات و نتائج ظہور میں آتے ہیں، یہ کتاب کا ایک ضروری باب ہے جس کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہتی۔

مصنف کو اس کا انتظار اور اہتمام تھا کہ یہ کتاب مصر میں کسی وقیع ادارہ کی طرف سے

---

[1] مکہ معظمہ میں حاجی عبد الوہاب صاحب دہلوی کا قیمتی کتب خانہ اور ہندوستان میں مولانا عبد الماجد دریابادی کا منتخب ذخیرۂ کتب اس باب کی ترتیب میں مصنف کے لئے بہت مددگار ثابت ہوا۔

شائع ہو اور اس کا شایانِ شان تعارف ہو تاکہ اس سے وہ مقصد حاصل ہو جو مصنف کے پیشِ نظر
تھا عرصے کے انتظار کے بعد کتاب کی اشاعت کے لئے "لجنة التاليف والترجمة والنشر" کو انتخاب کیا گیا جو
مصر کا ایک سنجیدہ اور باوقار تصنیفی ادارہ اور دارالاشاعت ہے اور جو اپنی بلند پایہ علمی مطبوعات
وتالیفات کی وجہ سے پورے مشرقِ اوسط میں شہرت اور وقعت حاصل کر چکا ہے کتاب پر مقدمہ
لکھنے کے لئے اسی ادارہ کے صدر ڈاکٹر احمد امین (سابق پرنسپل کلیۃ الآداب جامعۂ مصریہ) کو
زحمت دی گئی جو اپنی مشہور تالیفات "فجر الاسلام" "ضحی الاسلام" کی بنا پر عالمگیر شہرت حاصل کر چکے
ہیں، مصنفِ کتاب پر ان کی سلامتِ فکر، دقتِ نظر اور اصابتِ رائے کا اچھا اثر تھا، کتاب کا مسودہ
ان کی خدمت میں بھیجا گیا اور ان سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی گئی، انھوں نے کمیٹی سے اس کتاب کی
اشاعت کی پرزور سفارش کی اور مصنف سے مقدمہ لکھنے کا وعدہ کیا، کتاب کی اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ
مصنف نے مقدمہ نگار کے انتخاب میں غلطی کی تھی کسی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے مقدمہ نگار کا سلیم الفکر
دقیق النظر اور وسیع المطالعہ ہونا کافی نہیں، اس کی بھی ضرورت ہے کہ مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع سے
ہمدردی اور اس کے نتائجِ بحث سے اتفاق ہو اور وہ مصنف کے مقصد کا پرجوش داعی اور وکیل ہو اس پر
پورا یقین رکھتا ہو اور اس کی کامیابی کا دل سے متمنی ہو، مقدمہ نگار میں اس خصوصیت کی کمی تھی وہ بعض
مصنف و مفکر اور ایک کامیاب مؤرخ ہیں، اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اس کی عالمی قیادت کی طرف سے وہ کچھ
زیادہ پُرامید نہیں، وہ اس کو بھی ایک علمی اور تاریخی مسئلہ کی طرح سوچ سکتے ہیں مگر اس کے لئے اپنے دل میں
کوئی خاص جذبہ اور ولولہ نہیں رکھتے اس طرح ان کو دراصل کتاب کی اصل روح سے کوئی خاص مناسبت
نہیں تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا مقدمہ روح اور تاثیر سے خالی اور ایک ضابطہ کی خانہ پری سے زیادہ
نہ تھا مصر و شام فلسطین و حجاز میں ہر جگہ یہ محسوس کیا گیا کہ مقدمہ نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ
کرنے کے بجائے اس کی روح کو نقصان پہنچایا ہے اور کتاب کو ہلکا کر دیا ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا

اور مصنف کو اپنی غلطی کا احساس تھا، بایں ہمہ کتاب کا "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کی طرف سے شائع ہو جانا کتاب کے لئے مفید ہوا کہ کتاب ان حلقوں میں بھی پہونچ گئی جہاں خالص دینی کتابیں اور اسلامی دعوت کے سلسلہ کی چیزیں آسانی سے بار نہیں پاتیں، ۱۹۵۱ء میں جب مصنف کتاب کو شرق اوسط کی سیاحت کا موقع ملا تو اس کو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ کتاب بڑے شوق سے پڑھی گئی تھی اور بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال ہوا تھا، کتاب کی اشاعت کے دو تین مہینے کے اندر اندر وہ تمام عرب ملکوں میں پہونچ گئی تھی اسلامی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی اور اسلامی فکر کے حلقوں نے بطور خود اس کی اشاعت اور تبلیغ کی تھی مصر میں اخوان کے ذمہ داروں نے اس کو اپنے تعلیمی و تربیتی سلسلہ میں شامل کیا تھا، اور مطالعہ و تربیت کے حلقوں سے لے کر جیل خانوں تک اس کی اشاعت کی تھی عدالت کی بحثوں اور پارلیمنٹ کی تقریروں تک میں اس سے استفادہ و اقتباس کیا گیا تھا، جدید و قدیم دونوں حلقوں نے اس کی پذیرائی کی، جہاں یہ بات مصنف کے لئے سرمایۂ سعادت اور موجب شکر ہے وہاں عربوں کی فراخدلی، عالی حوصلگی اور حق پرستی کا بیّن ثبوت ہے کتاب کی جو پذیرائی اور اس کے گمنام اور بعید الوطن مصنف کی جو حوصلہ افزائی ان عرب ملکوں میں ہوئی اس کی توقع اپنے ملک میں بھی نہیں کی جا سکتی۔

مصر کے دوران قیام ہی میں کتاب کی دوسری اشاعت کی نوبت آ گئی اس موقع پر مصنف کے مخلص دوست اور کتاب کے خاص قدردان ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مرحوم (سابق استاذ جامع ازہر و پروفیسر اسلامی قانون قاہرہ یونیورسٹی) نے اپنی کمیٹی "جماعۃ الأزھر للنشر والتالیف" کی طرف سے طبع ثانی کی پیشکش کی اور مصنف کے ایما سے ڈاکٹر احمد امین سے اس کی اجازت حاصل کر لی اس موقع پر سابق غلطی کی تلافی کا امکان پیدا ہوا، اب اس کا موقع تھا کہ مقدمہ کے لئے ایسے موزوں شخص کا انتخاب کیا جائے جو کتاب کے مقصد اور روح پر پورا یقین رکھتا ہو اور اس کا پرجوش وکیل اور داعی ہو، اس مقصد کے لئے موزوں ترین شخصیت سید قطب کی ہو سکتی تھی، سید قطب عصر جدید میں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے سب سے بڑے

علمبردار ہیں، ان کا قلم ادھر چند برسوں سے نوجوانوں میں اسلامی روح اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے وقف ہے۔ ان کی ذات میں وسیع النظر عالموں کا مطالعہ، جدید ادیبوں کا زورِ قلم اور اسلوب، داعی کا جذبہ، اور اخلاص اور نومسلموں کا جوش جمع ہے۔ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود مسلم ہی ہیں، تعلیم و تربیت اور ماحول نے ان کو اسلام سے بہت دور اور بیگانہ کر دیا تھا، قرآن مجید کے مطالعہ اور تفکر اور مغربی تہذیب کی ناکامی اور افلاس نے ان کو پھر اسلام کی طرف واپس کیا اور وہ نئے جوش و خروش اور اعتماد و یقین کے ساتھ اسلام کی طرف آگئے، وہ دار العلوم مصر کے فاضل ہیں، ان کی ادبی زندگی تنقید ادب سے شروع ہوئی جس میں انھوں نے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ "النقد الادبی" اور "التصویر الفنی فی القرآن" اور "مشاھد القیامۃ فی القرآن" اس زمانہ کی یادگار اور ادبی حلقوں کی مقبول اور کامیاب کتابیں ہیں، عرصہ تک محکمۂ تعلیم سے متعلق رہے، اسی سلسلہ میں بعض تعلیمی نظریات کے مطالعہ کے لئے ان کو امریکہ میں کچھ عرصہ قیام کرنا پڑا، وہاں مغربی زندگی کے تاریک پہلو کھلے طریقہ پر ان کی نظر کے سامنے آگئے اور مغربی تہذیب اور فلسفۂ زندگی کی ناکامی کو انھوں نے بچشم خود دیکھ لیا اس سے ان کے ایمان و یقین اور اسلام کے تعلق میں بڑا اضافہ ہوا اور اسلامی دعوت کا نیا جوش پیدا ہوا، امریکہ سے آنے کے بعد وہ اسلام کے ایک پرجوش داعی اور مغربی تہذیب کے بصیر ناقد بن گئے اور ہمہ تن جدید اسلامی ادب کی ترتیب میں منہمک ہو گئے، ان کے فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ابدی اور عالمگیر پیغام مانتے ہیں جس کے بغیر دنیا کی نجات اور سلامتی نہیں، ان کے اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معذرت اور مدافعت کے قائل نہیں، وہ مغربی تہذیب کی بنیادوں پر تیشہ چلاتے ہیں اور اپنے حریف پر بڑھ کر حملہ کرتے ہیں، ان کو اسلام میں کوئی کمزوری اور کمی محسوس نہیں ہوتی اور وہ اس کو ایک مکمل اور جامع دستورِ حیات کی طرح پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس لئے ان کی تحریریں پڑھنے والوں میں اعتماد و یقین کی ایک نئی روح اور مغربی نظامِ فکر کی حقارت پیدا کر دیتی ہیں، اور نوجوان ان کی تصنیفات، مقالات کے

بہت متاثر ہوئے ہیں، ان کی کتاب "العدالة الاجتماعية في الاسلام" (اگرچہ مصنف کو اس کے بعض مقامات سے اختلاف ہے) اس طرزِ فکر اور اس طرزِ تحریر کا کامیاب نمونہ ہے اور جدید اسلامی ادب میں خاص مقام رکھتی ہے۔

سید قطب نے کتاب کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا، اور ان کی ہفتہ وار مجلس مذاکرہ میں اس کتاب کی تلخیص اور اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا تھا جس میں مصنف کو بھی حصہ لینے کا اتفاق ہوا تھا، مقدمہ کی فرمائش کو انھوں نے بمسرت قبول کیا اور ایسا مقدمہ لکھا جس میں کتاب کی پوری روح کھینچ لا[illegible] یہ مقدمہ جو اب کتاب کی زینت ہے کتاب میں ایک مستقل باب کا اضافہ کرتا ہے اور اس کا ایک اچھا خلاصہ ہے، سید قطب کے فاضلانہ مقدمہ کے علاوہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مرحوم نے بھی ازراہِ کرم ایک مقدمہ یا پیش لفظ تحریر فرمایا جس میں کتاب کے متعلق اپنے قلبی تاثرات اور علمی خیالات کا اظہار کیا، علاوہ بریں مصنف کے بے تکلف دوست ڈاکٹر شیخ احمد الشرباصی (استاذ جامع ازہر) نے مصنف کی لاعلمی میں اپنے مخصوص انداز میں صاحبِ کتاب کا تعارف کرایا اور اس کے مختصر حالات زندگی لکھے، ان دونوں مقدموں کے ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

سنہ [illegible]ء میں یہ خیال کرکے کہ اصل عربی کتاب کی اشاعت میں معلوم نہیں کتنی تاخیر ہو، خود مصنف نے اس کو اردو میں منتقل کر دیا تھا، یہ ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" کے نام سے شائع بھی ہو گیا، اس کتاب کی کتابت و طباعت اور کاغذ موضوع کی اہمیت اور کتاب کی حیثیت کے شایانِ شان نہ تھا، اس میں ابتدائی دونوں باب "بعثتِ محمدی سے پہلے" اور "بعثتِ محمدی کے بعد" (جو سنہ [illegible]ء کے بعد اضافہ کئے گئے تھے) اور متعدد اہم اضافے جو عربی اصل کی اشاعت کے وقت تک ہوتے رہے موجود نہیں تھے، اب جب کہ کتاب کے مصر میں دو ایڈیشن نکل چکے ہیں اور تیسرے کی تیاری ہے اور کتاب اپنے مضامین اور اضافات کی بنا پر دوچند ہو چکی ہے، اردو میں اس کی ازسرِنو اشاعت کا خیال پیدا ہوا، ان نئے ابواب اور اضافوں کے ترجمے کی فرصت مصنفِ کتاب کو ملنی بہت مشکل تھی اس لئے یہ خدمت اس نے اپنے عزیز رفیقوں کے سپرد کی، خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے بڑی خوبی سے یہ خدمت

انجام دی اس خدمت میں سب سے بڑا حصہ مولوی عبداللہ صاحب پھلواروی ندوی استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء[1] اور ان کے بعد مولوی محمد رابع ندوی استاذ ادب دار العلوم کا ہے کچھ مضامین اور حصے برادر زادہ عزیز محمد حسنی سلمہ[2] کے قلم سے ہیں مصنف ان تینوں عزیزوں کا شکر گذار اور دعا گو ہے کہ ان کی محنت سے یہ کتاب اشاعت کے قابل ہوئی اور اب اردو میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

مصنف اس کتاب میں کسی انکشاف خاص تحقیق اور اجتہاد کا مدعی نہیں نہ اپنے بارہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے کتاب ایک "استدلالی تاریخی جائزہ" ہے اور ایک قدرتی سوال کا معقول اور علمی جواب جو ممکن ہے یہ سوال بہت سے دماغوں میں آیا ہو اور مختلف طریقوں پر اس کا جواب دیا گیا ہو مصنف کا کام یہ ہے کہ اس نے اس سوال کو ابھار دیا ہے اور اس کو ایک مستقل موضوع بنا کر اس پر تاریخی مواد جمع کر دیا ہے اگر اس سے کسی ضمیر میں نیا شعور اور کسی دل میں نئی خلش پیدا ہو جاتی ہے تو مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے ہر صالح انقلاب اور نئی تعمیر کے لئے ضمیر کی بیداری اور ذہن کی تیاری ضروری ہے اس کے لئے تاریخ کی بامقصد ترتیب اور ایسی کتابوں اور مباحث کی ضرورت ہے جو ایک طرف علمی اطمینان اور قلبی انشراح پیدا کریں دوسری طرف پڑھنے والوں میں نیا حوصلہ نیا یقین اور جوشِ عمل پیدا کر دیں مبالغہ اور تواضع دونوں سے الگ ہو کر یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس سلسلہ کی ایک مفید اور اہم کڑی بن سکتی ہے اور اس سے اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے تمام حلقے بلا اختلاف فائدہ اٹھا سکتے ہیں: "وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب"

١٥ ربیع الثانی ١٣٧٣ھ — ابوالحسن علی

[1] حال ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی سابق پروفیسر جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ۔
[2] افسوس ہے کہ ١٣ جون ١٩٧٩ء کو عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مقدمہ

مصر کے نامور اہل قلم سیّد قطب کے قلم سے

عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے ان میں اسی پر اعتماد مستقبل کے بارہ میں امید اور حوصلہ پیدا ہو اس دین پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے ناآشنا ہیں ان کا تعلق اس دین سے زیادہ تر نسلی اور موروثی ہے اور انھوں نے اس کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟) خاص مقام رکھتی ہے۔

اسلام کی تعلیم سروری و جہانبانی کی تعلیم ہے اس کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ دین اپنے ماننے والوں میں بغیر کسی شائبۂ تکبر کے خودداری بغیر کسی فریب نفس کے اعتماد و یقین اور بغیر دوسرے پر اعتماد و در ضعت کے یقین و توکل کی روح پھونکتا ہے یہ عقیدہ انھیں متنبہ کرتا ہے کہ ان کے کاندھوں پر پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے روئے زمین پر بسنے والی انسانی جماعت کی تولیت (TRUSTEESHIP) ان کے سپرد ہے اور ان کا فرض منصبی ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے انسانی گلہ کی پاسبانی کریں اور انسانوں کو دینِ محکم اور صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کا فرض

انجام دیں اور اس روشنی اور ہدایت کے ذریعہ جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں :۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ	اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان
(سورۂ آل عمران ۔ ۱۱۰)	رکھتے ہو۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	بنا دیا ہے تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (سورۂ بقرہ ۱۴۳)	رسول گواہ رہیں تم پر۔

پیش نظر کتاب اپنے ناظرین کے دل میں انھیں تمام احساسات کو ابھارتی ہے اور ان تمام حقائق کو دل میں اتارتی چلی جاتی ہے لیکن کتاب کا اسلوب یہ نہیں ہے کہ صرف جذبات ابھار دے یا عصبیت کا جوش پیدا کر دے اس میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان و شعور اور فکر و نظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں تاریخی واقعات اور اس عصر کے ماحول و متعلقات ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کئے گئے ہیں، جس میں مصنف کی روشن اتنی صاف جھلکتی ہے پھر فیصلہ واقعیت و صداقت اور قلب و ضمیر کی بصیرت کے سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط اور ایک دوسرے سے پیوست نظر آتی ہیں اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقفیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا، یہ اس کتاب کی اوّلین خصوصیت ہے۔

اسلام سے پہلے اس دنیا کا کیا حال تھا مشرق و مغرب شمال و جنوب کا کیا نقشہ تھا،

چین و عرب اور ہند سے لے کر روم و فارس تک معاصر دنیا کا عقلی و فکری مزاج کیا تھا، اس وقت کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا؟ جن مذاہب پر دینِ سماوی کا اثر تو تھا مثلاً یہودیت و نصرانیت یا جو بت پرست مذاہب تھے مثلاً ہندومت، آتش پرست ان کا کیا حال تھا؟ ان تمام باتوں کی اس کتاب میں مختصر لیکن بہت جامع اور واضح تصویر کشی کی گئی ہے، اور یہیں سے کتاب شروع ہوتی ہے۔

درحقیقت یہ بہت ہی جامع مرقع ہے جو خطۂ ارضی کے صحیح خد و خال نمایاں کرتا ہے، اس مرقع کی ترتیب میں مؤلف نے کسی خود رائی اور ضد کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ اپنے جلو میں غیر مسلم قدیم و جدید مصنفین کو بھی لئے ہوئے ہیں جو قدرتاً اسلام کے معاند اور اس عہد کو بدنما کر کے پیش کرنے والے ہیں یا جو اسلام کی طرف منسوب ہیں، مؤلف اس دنیا کی تصویر پیش کرتے ہیں جس پر جاہلی روح مسلط تھی اور اس وقت کا انسانی ضمیر گندہ اور روح متعفن ہو چکی تھی، معیار اور قدریں بگڑ چکی تھیں، غلامی اور ظلم کا دور دورہ تھا اور انسانیت کی جڑ ایک طرف مجرمانہ عشرت پسندی اور دوسری طرف نامرادی و محرومی کے ہاتھوں کھوکھلی ہو رہی تھی، مزید برآں کفر و جہالت اور ظلمت و ضلالت کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے، مذاہب لاچار و بے بس تھے، ادیانِ سماوی پہلے ہی سے تحریف کا شکار ہو چکے تھے اور ان کو گھن لگ چکا تھا، دلوں سے ان کی عظمت نکل چکی تھی، یہ مذاہب (خصوصاً نصرانیت) مذہب کے ڈھانچے رہ گئے تھے جن میں نہ کوئی روح تھی، نہ کوئی زندگی، صرف چند بے جان، بے روح مراسم کا نام مذہب رہ گیا تھا۔

زمانۂ جاہلیت کے اس نقشہ کو پیش کرنے کے بعد مؤلف نے دکھایا ہے کہ تعمیرِ انسانیت کے سلسلہ میں اسلام نے کیا کارنامہ انجام دیا اور جب اس کو کچھ کرنے کا موقع ملا تو کس طرح انسانی روح کو اوہام و خرافات سے نجات دلائی، ذلت و غلامی سے کس طرح انسانیت کی گلو خلاصی کرائی، امراض و فساد، ناپاکیوں اور گندگیوں، کمزوریوں اور ناتوانیوں سے کس طرح انسان کو نکالا، اور اپنے وقت میں اسلام نے کس طرح انسانی معاشرے کو ظلم و سرکشی اور انسانی تہذیب کو انتشار و تباہی سے بچایا،

سماجی طبقہ داریت، سلاطین کے جورِ ستم سے اور مذہبی طبقہ (PRIEST HOOD) اور مہنتوں کی غلامی سے آزاد کیا، اسلام نے نئی بنیادوں پر دنیا کی تعمیر کی عقیدۂ اخلاق وضمیر کو طہارت و پاکیزگی عطا کی تعمیر و ایجاد کی بلند قدریں بخشیں، حریت پسندی اور اختراعی صلاحیتیں پیدا کیں یقین و معرفت وثوق و اعتماد، عدل و انصاف اور خودداری عطا کی اور دنیا کے صحیح نشو و نما اور متوازن ارتقا کے لئے عمل پیہم اور سعی مسلسل پر آمادہ کیا کہ زندگی کی پوشیدہ طاقتیں بروئے کار آئیں اور پھولیں پھلیں صحیح مردم شناسی سے کام لے کر دنیا کی تعمیر و ترقی کے کام میں ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھا اور اس سے وہ کام لیا جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا۔

یہ سب اس وقت کی بات ہے جب کہ عالم کی زمام کار اسلام کے ہاتھوں میں تھی اس کو اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے ڈھنگ سے کام کرنے کا موقع حاصل تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جوہر اسی وقت کھلتے ہیں جب اس کے ہاتھوں میں قیادت ہو، اس لئے کہ اسلام کا عقیدہ سروری وجہانبانی کا عقیدہ ہے، وہ قیادت کا ایک نظام ہے، وہ انسانی قافلے کی سربراہی کر سکتا ہے کسی کا دریوزہ گر نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب زمام قیادت اسلام کے ہاتھوں سے نکل گئی جس کا سبب یہ تھا کہ خود مسلمانوں میں زوال آگیا اور وہ اس عالمی قیادت سے دستبردار ہو گئے جس کی ذمہ داری ان پر اسلام کی طرف سے عائد ہوتی تھی اور انسانیت کی تولیت (TRUSTEESHIP) اور ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے جو زندگی کے ہر موڑ پر ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔

اس جگہ مؤلف نے اس روحانی و مادی زوال کے اسباب بیان کئے ہیں اور ان نقصانات کو واضح کیا ہے جو خود مسلمانوں کو اٹھانے پڑے جب کہ وہ اپنے دین کے اصول سے منحرف ہو گئے اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہونے لگے پھر اس مبارک قیادت

محروم ہونے اور پہلی جاہلیت کی زندگی اختیار کرلینے کے بعد دنیا پر کیا گزری؟ یہاں مؤلف نے اس ہولناک پستی کی نشاندہی کی ہے جس کے ہیبت ناک غار میں انسانیت اپنے سر کے بل گر گئی تھی، یہ اس پستی کا زمانہ وہی زمانہ ہے جس میں علم و فن کی راہیں کھلیں اور انسانیت نے مادّی میدان میں بڑی ترقی حاصل کی، مؤلف محترم نے اس پستی کی نشاندہی کرنے میں آتش بیانی یا سنسنی پیدا کرنے والا طرز نہیں اختیار کیا ہے بلکہ بحث و نظر سے کام لیا ہے اور واقعات کو پیش کر دیا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں جن حقائق کو پیش کیا ہے، وہ خود ہر طرح کی مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی سے بے نیاز ہیں۔

اس تاریخی جائزہ کے وقت کتاب کا پڑھنے والا بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ موجودہ قیادت بدلنے کی سخت ضرورت ہے، اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسانیت کو پھر اسی سرچشمۂ ہدایت پر لاکر کھڑا کر دیا جائے جس ہدایت کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف اور جاہلیت سے نجات دلا کر علم و معرفت کی طرف لائے، اس کتاب کے پڑھنے والے کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس قیادت کی کیا عالمگیر اہمیت ہے، اور اسے کھو کر انسانیت کو کتنا بڑا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے، اور اس خسارہ میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا شریک ہے، یہ اتنا وسیع خسارہ ہے جو ماضی و حال اور مستقبل قریب و بعید سب پر حاوی ہے، اس کے ساتھ ہی مسلمان کے دل میں ندامت و شرمندگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس نے کیسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا، دوسری طرف اس کے اندر یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ اسے کیسی عظیم الشّان صلاحیتیں بخشی گئی ہیں، پھر اس عالمی قیادت کو دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ بھی پیدا ہوتی ہے جو اس نے اپنی غفلت و ناقدری سے کھو دی ہے۔

اس کتاب کی ایک قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ مؤلف جہاں کہیں انسانیت کی پستی کا

ذکر کرتے ہیں (وہ پستی جو تمام انسانوں پر محض اس وجہ سے آئی کہ مسلمان ان کی قیادت سے ہٹ گئے تھے)
وہاں مؤلف اس پستی کو جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اسلوب بیان بہت خوبی کے ساتھ مؤلف محترم
کے انداز فکر کو واضح کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی رنگ اور اس مادہ پرستی کی رنگ (جو اسلام
سے قبل دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور اسلام کی قیادت سے دستبرداری کے بعد آج بھی چھائی
ہوئی ہے) کے درمیان کیا فرق ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت اپنے مزاج اور روح کے اعتبار سے
ایک ہی ہے۔ جاہلیت کسی محدود زمانہ کے کسی خاص وقفہ کا نام نہیں ہے بلکہ عقل و فکر کی ایک
خاص اور متعین ساخت کا نام ہے۔ وہ فکری ساخت اس وقت ابھرتی ہے جب کہ انسانی زندگی
کے وہ حدود اور وہ معیار باقی نہیں رہتے جو خدا نے مقرر کئے ہیں۔ اور ان کی جگہ بنائے ہوئے
وہ مصنوعی معیار آجاتے ہیں جن کی بنیاد وقتی خواہشات پر ہوتی ہے جس کو آج دنیا اپنے
ارتقائی دور میں بھی اسی طرح جھیل رہی ہے جس طرح اپنے بربریت اور جہالت کے ابتدائی
زمانہ میں جھیل رہی تھی۔ فاضل مؤلف کتاب کے آخری باب میں تحریر فرماتے ہیں:—

"عالم اسلامی کا پیغام اللہ، رسول اور اس کی قیادت پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔
اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو بندگی سے نکال کر خدائی کی طرف، انسان کی عبادت سے نجات
دلا کر اللہ کی عبادت کی طرف، دنیا کی تنگنائی سے نکال کر عالم کی وسعت کی طرف،
مذاہب کے جور و ستم سے بچا کر عدل اسلامی کی طرف آنا نصیب ہوگا۔ اس پیغام کی اہمیت
سامنے آچکی ہے اور اس زمانہ میں اس کا سمجھنا دوسرے زمانہ کی نسبت زیادہ
آسان اور سہل ہے۔ آج جاہلیت سر بازار رسوا ہو چکی ہے۔ اس کے چھپے ڈھکے
عیب ننگا ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ دنیا اس سے عاجز آچکی ہے لہذا جاہلی
قیادت کو چھوڑ کر اسلامی قیادت کی طرف منتقل ہونے کا یہ خاص وقت ہے۔"

بشرطیکہ عالمِ اسلامی اس کے لئے کھڑا ہو اور اس پیغام کو پورے عزم و اخلاص اور جرأت و ہمت کے ساتھ اپنائے اور اس پیغام کو دنیا کا نجات دہندہ باور کرے اور یقین کرے کہ پستی و تباہی سے دنیا کو صرف یہی پیغام نجات دلا سکتا ہے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے اس بنا پر نہ صرف یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیقِ علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہیے۔

علمائے مغرب نے دنیا کی تاریخ مغربی نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور وہ قدرتاً اپنی مادی تربیت، مادی فلسفے اور پھر مذہبی و قومی تعصب کے اثرات سے خالی نہیں تھے چنانچہ دانستہ یا نادانستہ ان کی تاریخ میں اغلاط اور جا بجا بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں کیونکہ انھوں نے انسانی زندگی کی بہت سی اہم قدروں کو فراموش کر دیا ہے حالانکہ انسانی زندگی کی تاریخ ان کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ان قدروں کے جانے بغیر واقعات کی صحیح توجیہ ممکن ہے اور نہ نتائج اخذ کرنا درست ہو سکتا ہے نیز یورپین مورخین عموماً اپنے قومی و مذہبی تعصب کی بنا پر دنیا کا مرکز یورپ ہی کو سمجھ لیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے اہم مؤثرات اور محرکات کو صرف اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یورپ ان کا ماخذ نہیں ہے یا کم از کم بہت گھٹا کر اور ان کی اہمیت کو کم کر کے پیش کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہم لوگ عرصہ سے اس کے عادی چلے آرہے ہیں کہ جس طرح دوسری اشیاء یورپ سے منگاتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی یورپ ہی کے ہاتھوں حاصل کریں اور ان تمام کمزوریوں کے ساتھ اس کو جوں کا توں لے لیں حالانکہ ان کا طریقۂ تصنیف اور طریقِ فکر ہی سرے سے ناقص اور پُر از اغلاط ہے کیونکہ انھوں نے انسانی زندگی کو ایک محدود زاویہ سے دیکھا ہے اور اس غلط اور محدود زاویۂ نگاہ سے وہ غلط

نتائج کا شکار ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے جب مقدمات ہی درست نہ ہوں گے تو نتیجہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

پیشِ نظر کتاب تاریخ کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ان تمام امور پر نگاہ رکھی گئی ہے اور تمام محرکات اور مختلف قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہے کتاب کے پڑھنے والے غالباً اس کے متوقع نہ ہوں گے کہ ایک صاحبِ بیان مؤلف جو اسلام کی روحانی طاقت پر یقینِ کامل رکھتے ہیں اور عالمی قیادت کو اسلام کے سپرد کرنے کا پُرجوش جذبہ ان کے دل میں موجزن ہے، جہاں قیادت کی صلاحیتوں پر گفتگو کریں گے وہاں روحانی قوت کے ساتھ ساتھ صنعتی و حربی صلاحیت کا بھی تذکرہ کریں گے اور جدید تعلیمی نظام اور اقتصادی و تجارتی خود کفالتی پر بھی سیر حاصل بحث کریں گے لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

بلا شبہ اس کتاب میں انسانی زندگی پر اثر ڈالنے والے تمام عوامل کا ایک مربوط اور منظم تصور ہے، اسی مربوط و منظم تصور کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور امتِ اسلامیہ کو ایسا مشورہ دیا گیا ہے جس میں پورا اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اُس اسلوبِ نگارش سے بے نیاز ہو کر (جس میں ارتباط و توازن، مورخانہ انصاف اور علمی تحقیق کی بالعموم کمی ہوتی ہے) تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہئے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہئے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ پیشِ نظر کتاب کے بارہ میں اپنے ان تاثرات کے اظہار کا موقع ملا اور بڑی مسرت ہے کہ مجھے اس کتاب کا مطالعہ عربی زبان میں نصیب ہوا اس لئے کہ فاضل مؤلف نے اسی زبان کو اپنی تصنیف کے لئے اختیار کیا ہے اور آج دوسری بار مصر میں اس کے شائع ہونے کی نوبت آرہی ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ

سید قطب (شہید)
حلوان (مصر)

باب اوّل

بعثتِ محمّدیؐ سے پہلے

چھٹی صدی مسیحی کی دنیا

چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جا رہی تھی' اس کے آخری نقطہ کی طرف پہونچ گئی تھی' روئے زمین پر اس وقت کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے' اور ہلاکت کے غار میں اس کو گرنے سے روک سکے' نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی تھی' انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا، وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور بُرے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا، پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی' جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے' وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے' جن سے صرف چند خدا شناس دل روشن تھے' جو شہروں کو چھوڑ کر چند پورے پورے گھروں میں بھی اُجالا نہیں کر سکتے تھے' دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دَیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے' اور

زندگی کی کشمکش اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادّیت کے معرکہ میں شکست کھا کر اپنے فرائضِ قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے انھوں نے بادشاہوں اور اہلِ دنیا سے ساز باز کر لی تھی اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظامِ سلطنت و معیشت میں ان کے دست راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی زعامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے، وہ دنیا کے لئے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمہ دار تھے، مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصے سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں، ان کے افراد تعیّش و تکلّفات کی زندگی اور مصنوعی تمدّن کے سمندر میں سراپا غرق تھے، بادشاہ اور حکام خوابِ غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے، کام و دہن کی لذّت اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے سوا ان کو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی اور مشغلہ نہ تھا، زندگی کی ہوس اور لذّت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی، متوسط طبقہ کے لوگ (اہلِ زمانہ کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے، باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوئے اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپایوں سے ذرا مختلف نہ تھی، دوسروں کی راحت کے لئے محنت کرنے اور دوسروں کے عیش و عشرت کے لئے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جُتے رہنے اور جانوروں کی طرح

اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اس یکساں چکر سے اکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی اجتماعی بے نظمی و انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رونما تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اقوام و مذاہب پر ایک نظر

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے، ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھی کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دنیا میں آ کر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے۔

تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا نظام حکومت میں حد درجہ ابتری تھی احکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں الجھ کر رہ گئی تھیں، دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا، اور نہ انسانیت کے لئے کوئی دعوت تھی، درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے ان کی زندگی کا سوتا خشک ہو چکا تھا، ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لئے مستحکم و معقول اصول۔

مسیحیت چھٹی صدی عیسوی میں

مسیحی مذہب میں کبھی بھی اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکیں یا اس کی بنیاد پر تمدن کی تعمیر ہو سکے یا اس کے زیر ہدایت کوئی سلطنت چل سکے، جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا جس پر توحید کے سادہ عقیدہ کا کچھ پرتو تھا، مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ یہ مذہب سینٹ پال کی دستبرد سے بچا رہا، اس نے تو آ کر رہی سہی روشنی بھی گل کر دی کیونکہ جس بت پرستانہ ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور جن جاہلی خرافات سے وہ نکل کر آیا تھا، اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی، اس کے بعد قسطنطین کا زمانہ آیا جس نے اپنے دور حکومت میں رہی سہی اصلیت بھی کھو دی، غرض یہ کہ چوتھی صدی ہی میں مسیحیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت (NEO-PLATONISM & MONASTICISM) اور رہبانیت کے اجزا شامل تھے، حضرت مسیحؑ کی سادہ تعلیمات کا عنصر اس مجموعہ میں اس طرح گم ہو کر رہ گیا تھا جیسے کہ ایک قطرہ کا وجود سمندر میں گم ہو جاتا ہے، بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گیا تھا، جو نہ روح میں گداز پیدا کر سکتے تھے، نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتے تھے، نہ جذبات کو حرکت میں لا سکتے تھے، اور نہ ان میں اس کی صلاحیت تھی کہ زندگی کے اہم مسائل میں انسانی قافلہ کی رہبری کر سکیں، اس پر تحریف و تاویل کی مصیبت مستزاد تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نصرانیت علم و فکر کے دروازے کھولتی، وہ خود علم و فکر کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئی اور صدیوں کے مسلسل انحطاط کے باعث محض ایک

بُت پرستی کا مذہب بن کر رہ گئی ہے۔ سیل (SALE) جس نے انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کے بارے میں کہتا ہے "مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیح کے مجسموں کی پرستش میں اس درجہ غلو کیا کہ اِس زمانہ کے رومن کیتھولک بھی اس حد کو نہیں پہونچے"۔[1]

رومی سلطنت میں مذہبی خانہ جنگی

پھر نفسِ مذہب سے متعلق کلامی مباحث اُبھر آئے اور بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے قوم کو اُلجھا دیا جس میں ان کی ذہانتیں ضائع ہوئیں اور قوائے عملیہ شل ہوگئے، بیشتر ان خانہ جنگیوں نے بڑے پیمانہ پر خونی معرکہ کی شکل اختیار کرلی، مدارس کلیسا اور لوگوں کے مکانات حریف کیمپ بن گئے تھے اور پورے کا پورا ملک خانہ جنگی (CIVIL WAR) کا شکار تھا، بحث یہ تھی کہ حضرت مسیح کی فطرت کیا ہے؟ اور اس میں الٰہی اور بشری جز و کس تناسب سے ہیں؟ روم و شام کے ملکانی MALKITE عیسائیوں کا مذہب یہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت مرکب ہے، اس میں ایک جز و الٰہی ہے اور ایک بشری، لیکن مصر کے منوفزٹ MONOPHYSITES عیسائیوں کا اصرار تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت خالص الٰہی ہے، اس میں ان کی فطرتِ بشری اس طرح فنا ہوگئی ہے جیسے سرکہ کا ایک قطرہ سمندر میں پڑکر اپنی ہستی کو گم کردیتا ہے، پہلا مسلک گویا حکومت کا سرکاری مسلک تھا، بازنطینی سلاطین و اہل حکومت نے اس کو عام کرنے اور پوری مملکت کا واحد مذہب بنانے میں پوری قوت صرف کی اور مخالفین مذہب (مبتدعین) کو سخت ترین سزائیں دیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، مگر اختلاف اور مذہبی کشاکش بڑھتی ہی رہی، دونوں فریق ایک دوسرے کو ایسا ہی خارج از مذہب اور

---

[1] SALE'S TRANSLATION, P. 62 (1836)

بددین سمجھتے تھے، جیسے دو متضاد مذہب کے پیرو[2]، قیرس (CYRUS) کی نیابت مصر کے دس[1] سال (۶۳۱ء۔۶۴۱ء) کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے۔[1]

اجتماعی بدنظمی اور معاشی بے چینی

روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی انتہا کو پہونچ گئی تھی، باوجود اس کے کہ عام رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی، ٹیکس اور محصول دو گنے چو گنے بڑھ گئے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے، اور اپنے ملکی حکمرانوں پر بدیسی حکومتوں کو ترجیح دیتے تھے، اجارہ داریاں (MONOPOLIES) اور ضبطیاں مصیبت بالائے مصیبت تھیں، ان اسباب کی بنا پر بڑے پیمانہ پر فسادات اور بغاوتیں رونما ہوئیں چنانچہ ۵۳۲ء کے فساد میں تیس ہزار افراد دارالسلطنت میں ہلاک ہو گئے[2]، اور ہر چند کہ وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا، لیکن لوگ اسراف اور فضول خرچی سے باز نہیں آتے تھے، اور اخلاقی گراوٹ کی جو سب سے پست سطح ہو سکتی ہے اس حد تک پہونچ چکے تھے، اور صرف ایک ہی لگن سب کے دل سے لگی تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا چاہیے، اور اس کو فیشن پرستی، عیش پسندی اور اپنی من مانی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے، انسانیت و شرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تھیں، تہذیب و اخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے تاکہ آزادی سے انھیں کھیل کھیلنے کا

ALFRED J. BUTLER ARAB'S CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION P. 29-30 [1]

(ENCYCLO PAEDIA BRITANNICA CHAP. JUSTIN) [3] P. 183-139 [2]

موقع ملے[1]، انصاف کا حال یہ تھا کہ بقول سیل SALE "جس طرح اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور ان کے دام ٹھہرائے جاتے ہیں، اسی طرح انصاف بھی فروخت ہوتا، رشوت و خیانت کی ہمت افزائی خود قوم کی طرف سے ہوتی تھی[2]، گبن کہتا ہے "چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت کا زوال اور اس کی پستی انتہا پر پہنچ گئی[3] اس کی مثال اس بڑے تناور اور گھنے درخت کی تھی جس کے سائے میں دنیا کی قومیں کبھی پناہ لیتی تھیں، اور اب اس کا صرف تنا رہ گیا ہو، جو روز بروز سوکھتا جا رہا ہو[4]۔"

"تاریخ عالم برائے مورخین[5] کے مصنفین لکھتے ہیں:-

"بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی اور پھر وہ سنبھل نہ سکے، اور نہ اس لائق ہو سکے کہ اپنی عظمت رفتہ کو پھر زندہ کر سکیں، وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت اس زمانہ میں انتہائی انحطاط و تنزل کے عالم میں تھی اور تیز رفتار ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں کمی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا[6]۔"

یورپ کی شمالی اور مغربی قومیں

وہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں، جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں، وہ جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں، ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی، اسلامی و عربی

---

[1] THE STORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE V. 3, P. 327

[2] SALES TRANSLATION P. 72 [3] GIBBON V. V, P. 31 [4] P. 31

[5] HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD V. VII P. 175

اندلس (SPAIN) اس وقت تک منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا کہ علم و تمدن سے روشناس کرائے، نیز مصائب و حوادث نے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں، غرض ہر طرح یہ قومیں تمدن انسانی کے قافلہ کی شاہراہ سے الگ تھلگ تھیں بہت حد تک یہ دنیا سے بے خبر تھیں اور دنیا ان سے تقریباً نا آشنا تھی، مشرق و مغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات و تغیرات پیش آ رہے تھے ان سے قوموں کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، عقائد کے لحاظ سے یہ قومیں نوخیز مسیحیت اور فرسودہ بُت پرستی کے درمیان میں تھیں، نہ دین سے متعلق ان کے پاس کوئی پیغام تھا، اور نہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی مقام تھا، ایچ، جی، ویلز (H. G. WELLS) کا بیان ہے "اس زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر یکجہتی اور نظام کے کوئی آثار نہ تھے"۔[1]

رابرٹ بریفالٹ ROBERT BRIFFAULT لکھتا ہے:-

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی، جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے، اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہونچ گیا تھا، جیسے اٹلی و فرانس وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا"۔[2]

یہود

یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی یہود تمام کی قوم دنیا کی تمام قوموں میں

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE WORLD P. 170

[2] THE MAKING OF HUMANITY V. P. 161

اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ ان کے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا اور کتب دینی کی تعبیر و اصطلاحات کو سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی۔ لیکن یہودی مذہب و تمدن بہت سے میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں۔ نیز ان کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ ہمیشہ ان پر دوسرے لوگ حکومت کریں اور ہمیشہ ظلم و استبداد، سزا و جلاوطنی، و مصائب و مشقت کے ہدف بنے رہیں۔ عرصہ دراز تک غلام رہتے اور انواع و اقسام کی تکالیف اور سزائیں جھیلنے کے سبب ان کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ قومی غرور و نسلی تکبر، حرص اور مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوئی طمع، مسلسل سود کے لین دین سے ان میں خصوصی ذہنیت و سیرت اور قومی خصائص و عادات پیدا ہو گئے تھے جن میں وہ ہمیشہ منفرد رہے ہیں کمزور و مغلوب ہونے کے وقت ذلت و خوشامد اور غالب ہونے کی صورت میں سخت بے رحمی اور بد خلقی اور عام حالات میں دغا بازی، دون ہمتی، سنگدلی، خود غرضی، حق تلفی، حرام خوری، راہ حق سے لوگوں کو روکنا ان کا قومی کردار بن گیا تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس صورتحال کا چھٹی اور ساتویں صدی میں ان کا بہت واضح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے اور بتلایا ہے کہ اخلاقی انحطاط، انسانی پستی اور اجتماعی فساد میں وہ کس منزل میں تھے اور کیا اسباب تھے جن کی بنا پر وہ ہمیشہ کے لئے عالم کی قیادت اور اقوام کی امامت سے محروم کر دیئے گئے۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم رقابت و منافرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا تھا۔ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا، قیصر روم فوکاس PHOCAS نے ان کی سرکوبی کے لئے مشہور فوجی افسر بونوسوس BONOSUS کو بھیجا اس نے پوری یہودی آبادی کا اس طرح

خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سیکڑوں کو دریا میں غرق کر کے، آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا۔ ۶۱۴ء میں جب ایرانیوں نے شام کو فتح کیا تو یہودیوں کے مشورہ و ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کئے اور بیشتر عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل (HERCULES) نے زخم خوردہ عیسائیوں کے مشورہ سے ۶۲۸ء میں یہودیوں سے سخت انتقام لیا اور ان کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی مملکت میں صرف وہ یہودی بچ سکے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپ رہے۔[1]

اس سفاکی و بربریت اور اس خون آشام ذہنیت کے ساتھ جس کا مظاہرہ ساتویں صدی کے اوائل میں عظیم ترین مذاہب نے کیا، اس کی کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے دور حکومت میں انسانیت کے پاسبان ثابت ہوں گے اور حق و انصاف، امن و صلح کا پیغام دنیا کو سنائیں گے۔

ایران اور وہاں کی تخریبی تحریکات

تمدن دنیا کی تولیت و انتظام میں ایران، روم کا شریک تھا، لیکن بدقسمتی سے وہ دشمن انسانیت افراد کی سرگرمیوں کا مرکز تھا، وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانۂ دراز سے متزلزل چلی آ رہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن و معتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں اور فطری طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں، ایرانیوں کو ان کی حرمت و کراہت تسلیم نہیں تھی، یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے، اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا۔[2] بہرام چوبین جو چھٹی صدی عیسوی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الخطط المقریزیہ ج ۴ صفحہ ۳۹۲ اور (THE ARAB'S CONQUEST OF EGYPT P. 133-134)

[2] HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD. VOL. VIII P. 84

میں حکمران تھا اس نے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا[1] پروفیسر کرسٹن سین کے بیان کے مطابق اس قسم کا رشتہ ایرانیوں میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک عبادت اور کار ثواب سمجھا جاتا تھا مشہور چینی سیاح ہیون سانگ کا بیان ہے کہ ایرانی قانون معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لئے کسی رشتہ کا بھی استثناء نہ تھا[2]

تیسری صدی عیسوی میں مانی دنیا کے سامنے آیا اس کی تحریک دراصل ملک کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت رد عمل اور نور و ظلمت کی مفروضہ کشمکش کا رد عمل تھا ایران کا قدیمی فلسفہ ہے نتیجہ تھا چنانچہ اس نے تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دنیا سے شر و فساد کی جڑ ختم ہو جائے اس نے اعلان کیا کہ نور و ظلمت کا امتزاج ہی شر کا باعث ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے اس بنا پر اس نے نکاح کو حرام قرار دیا کہ انسان جلد سے جلد فنا ہو جائے اور نسل انسانی منقطع ہو کر ظلمت پر نور کی فتح حاصل ہو بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کروا دیا کہ یہ شخص دنیا کی تباہی کی دعوت دیتا ہے اس لئے قبل اس کے کہ دنیا ختم ہو اور اس کا مقصد پورا ہو اس کو خود ہلاک ہو جانا چاہئے لیکن مانی مذہب کے قتل کے باوجود اس کی تعلیمات عرصہ تک زندہ رہیں اور اسلامی فتح کے بعد تک ان کے اثرات باقی رہے۔

ایران کی افتادِ طبیعت نے پھر ایک مرتبہ مانی کی غیر فطری تعلیمات کے خلاف بغاوت کی یہ بغاوت مزدک (پیدائش ۴۸۷ء) کی دعوت کی شکل میں سامنے آئی اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان یکساں طور پر پیدا ہوئے ہیں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے ابتداء ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق حاصل تھا اور چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسی مخصوص چیزیں ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے لہذا انھیں میں مساوات و اشتراک کی سب سے

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۳۸ [2] ایران بعہد ساسانیان ص ۴۳۰

زیادہ ضرورت ہے۔ شہرستانی کا بیان ہے: "مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لئے حلال قرار دے دیا۔ دولت اور زن کو مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کر دیا۔"[1] نوجوانوں اور عیش پسند کی مراد بر آئی اور انہوں نے اس تحریک کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ شاہ ایران قباذ نے اس کی سرپرستی قبول کر لی اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک بھر میں پھیل گئی۔ پورے کا پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔ طبرانی کا بیان ہے کہ:۔

"اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مزدک اور مزدکیوں کے پرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار ہوئے۔ اس تحریک کا اتنا زور ہوا کہ جو جس کے گھر میں چاہتا گھس جاتا اور اس کی زن و زر پر قبضہ کر لیتا اور صاحب مکان کچھ بھی نہ کر سکتا۔ ان مزدکیوں نے قباذ کو ابھارا اور اس کو معزولی کی دھمکی دے کر تیار کر لیا کہ وہ بھی اس دعوت کو اپنا لے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عالم ہو گیا کہ نہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو۔ کسی کو بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار اور قبضہ نہیں تھا۔"[2]

طبری کا بیان ہے کہ اس تحریک سے پہلے قباذ ایران کے اچھے فرمانرواؤں میں تھا لیکن مزدک کی پیروی کی وجہ سے حدود مملکت اور سرحدوں میں پراگندگی اور ابتری پھیل گئی۔"[3]

ایران کی شاہ پرستی

ایران کے سلاطین جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہوا کرتا تھا اس بات کے مدعی تھے

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی ص [illegible] [2] تاریخ طبری ج ۲ ص [illegible] [3] ایضاً

ان کی رگوں میں خدائی خون ہے اہل ایران بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا یہ خدا
ہیں ان کا اعتقاد تھا کہ ان سلاطین کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز ہے چنانچہ یہ لوگ
ان کے آگے سر بسجود ہوتے ان کی الوہیت کے ترانے گاتے اور انہیں قانون سے تنقید سے
بلکہ بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے فرو دہے ان سلاطین کے نام بھی اپنی زبان پر لاتے
اور نہ کوئی شخص ان کی مجلس میں بیٹھنے کی ہمت کر سکتا تھا اہل ایران کا عقیدہ تھا کہ ان
سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کا ان سلاطین پر حق نہیں بادشاہ
ایران اپنی دولت میں سے جو تھوڑا بہت کسی کو دے دے یا اپنے دسترخوان سے کوئی ٹکڑا
اٹھا کر کسی کو عطا کر دے وہ اس کا احسان و صدقہ ہے کسی کا استحقاق نہیں لوگوں کو سوائے احکام
کی بجا آوری کے کسی امر میں دخل دینا نہ چاہیے ملک و قوم پر حکومت کرنے کے لیے ایک خاص گھرانہ
(کیانی خاندان) متعین تھا اہل ایران سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج
کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں اور یہ حق وراثتاً بیٹے کو باپ سے نسلاً بعد نسل
منتقل ہوتا رہے گا اس حق میں کسی کو دست درازی کی مجال نہیں چنانچہ یہ لوگ بادشاہوں
پر ایمان رکھتے تھے اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے کہ جس میں کسی کو دم
مارنے کی مجال نہ تھی اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ مرد نہ ہوتا تو بچے ہی کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیتے
اور اگر کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت ہی کو تاج شہنشاہی پہنا دیتے چنانچہ خسرو پرویز کے بعد اس کے
ہفت سالہ بچہ اردشیر کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو طفلی کی حالت
میں لوگوں نے بادشاہ بنایا اور کسریٰ کی لڑکی پوران بھی تخت نشین ہوئی اور دوسری بیٹی جس کا
نام آزرمی دخت تھا وہ بھی حکومت کر چکی ہے[1] کسی کو اس کا تصور بھی نہیں آیا کہ کسی سپہ سالار

---

[1] تاریخ طبری ص ۲۳۶ - و تاریخ ایران از مکاریوس ایرانی۔

یا بڑے سردار یا کسی دوسرے لائق اور آزمودہ کار شخص کو (جیسے رستم وجاپان تھے) نظام سلطنت سپرد کر دیا چونکہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مذہبی گھرانوں اور سرداروں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ لوگ عام انسانی سطح سے بلند ہیں اور ان کی شخصیتیں اور ان کے دل ودماغ دوسرے انسانوں سے الگ ہیں ان اشخاص کو اہل ایران نے غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے اونچ نیچ کا فرق طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم ایرانی سوسائٹی اور نظام زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں رد وبدل ممکن نہ تھا پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کا بیان ہے :۔

"سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ حکومت کی[1] طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ طبقہ امراء میں سے کسی کی جائداد کو خرید سکیں۔[2] سیاست ساسانی کا یہ محکم اصول تھا کہ ہرگز کوئی شخص اپنے اس رتبہ سے بلند تر رتبہ کا خواہاں نہ ہو جو اس کو پیدائشی طور پر یعنی از روئے نسب حاصل ہے۔[3] کوئی شخص مجاز نہ تھا کہ سوائے اس پیشہ کے جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکے۔[4] شاہان ایران حکومت کا کوئی کام کسی نیچ ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے۔[5] عوام الناس کی مختلف جماعتوں میں نہایت صحیح امتیاز تھا۔ سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی۔"[6]

ایران کی قوم پرستی

اہل ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت وتقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ

۱؎ ایران بعہد ساسانیاں ص۴۰۹ ۲؎ ایضاً ص۴۲۰ ۳؎ ایضاً ص۴۲۱ ۴؎ ایضاً ص۴۲۲ ۵؎ ایضاً ص۴۲۳
۶؎ ایضاً ص۴۲۴

اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر اس قومیت و نسل کو فضیلت و برتری حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ خصوصی صلاحیتیں اور فطری قابلیتیں بخشی ہیں جن میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نہیں، یہ لوگ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت آمیز نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے لئے ایسے نام تجویز کرتے تھے جن میں توہین و تمسخر پایا جاتا۔

آتش پرستی اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات

چونکہ آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے اور اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ اپنے پجاریوں کے مسائل زندگی کو حل کر سکے، ان میں دخل دے اور مجرموں گنہگاروں اور مفسدوں کا ہاتھ پکڑ سکے اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجوسیوں کا مذہب چند مراسم و روایات کا نام رہ گیا تھا، جنہیں مخصوص اوقات اور خاص خاص مقامات پر ادا کیا کرتے تھے رہا عبادت گاہوں سے باہر اپنے گھروں اور بازاروں، دائرۂ اثر اور سیاست و اجتماعی امور میں تو اس میں یہ بالکل آزاد تھے، اپنی من مانی کرتے ان کے خیالات جس رخ پہ چاہتے انہیں موڑتے رہتے یا پھر جو مصلحت اور وقت کا تقاضا ہوتا اس پر کاربند ہوتے جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں عام طور پہ مشرکوں کا حال رہا ہے۔

غرض اہل ایران ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھے جو ان کے باطن کی اصلاح کرتا، ان کے اخلاق سنوارتا، نفسانی خواہشات کو دبانے اور نیک خواہشات کو ابھارنے کی اس میں طاقت ہوتی، وہ خاندان کا نظام، زندگی ملک کا دستور حکومت ہوتا، جو سلاطین کی چیرہ دستیوں اور حکام کی زیادتیوں کی روک تھام کر سکتا، ظالم کا ہاتھ پکڑ سکتا اور مظلوم کے حق میں انصاف کرا سکتا لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا آتش پرست ایرانیوں کو ایسا دین نصیب نہ تھا

دیا۔ اس طرح ایران کے مجوسیوں اور دنیا کے دوسرے مذہب والوں قانون افزودین اخلاق واعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا۔

بدھ مت اور اس کے تغیرات

بدھ مت اپنی سادگی اور اپنی انفرادیت عرصہ ہوا کھو چکا تھا۔ بدھ مذہب نے ہندوستان کے برہمنی مذہب کو اپنے میں شامل کر کے اور اس کے اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کر کے (جیسا کہ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف "تمدن ہند" کا رجحان معلوم ہوتا ہے) اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا (بہ حیثیت نیز اس نے جو عرصہ سے قائم رکھا تھا ختم ہو چکی تھی) اس کو ہضم اور اپنے میں ضم کر لیا تھا۔ بہرحال یہ دونوں مذاہب جو عرصہ سے ایک دوسرے کے حریف چلے آ رہے تھے باہم شیر و شکر ہو چکے تھے۔ اور بدھ مت اب عرصہ سے بت پرستی کا ایک مذہب تھا جن ممالک میں بھی اس مذہب کے پیرو گئے بت ان کے ساتھ رہے یہ لوگ جہاں جاتے اور جس منزل میں پہنچتے گوتم کے مجسمے نصب کرتے اور اس کی شبیہیں تیار کرتے ان کی مذہبی اور تمدنی زندگی ان مجسموں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ مجسمے زیادہ تر بدھ مت کے دور ترقی میں تیار ہوئے تھے، پروفیسر ایشورا ٹوپا

ف۔ پچھلے زمانہ قدیم بدھ دور سلطنت کے عجائب خانہ کی سیر کرنے والا ان مجسموں اور صورتوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے جو بدھ مذہب کے بڑے شہروں کی کھدائی کے بعد نکلے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب اور اس کا تمدن مجسمہ پرستی پر مبنی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر گستاولی بان نے بھی ہندوستان میں بدھ مت کی یادگاروں کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا ہے، وہ تمدن ہند میں لکھتا ہے:

"اصلی بدھ مذہب کو سمجھنے اور جاننے کے لیے اس مذہب کی یادگاروں کا مطالعہ کرنا چاہیے نہ کہ کتابوں کا جو صرف ہمیں اس بدھ مذہب کی تعلیم سے واقف کرتی ہیں جو ان فلسفیانہ مسائل سے بھری ہیں جن کی تعلیم یورپی مصنفین کرتے ہیں: مگر عمارتوں کی یادگاریں یہ ثابت کرتی ہیں کہ جس مذہب کو یورپی علماء الحاد کی تعلیم دینے والا بتاتے ہیں وہ فی الواقع بت پرست ترین مذاہب کا سرتاج ہے۔" (تمدن ہند ص ۲۳۹)

اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں: بدھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بیمار ہو چکی تھی، اس میں جو خرابیاں اور جو تغیر ہیں کے بعد دیکھے گئے نظر آنے لگی تھیں۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب تلاش ہند THE DISCOVERY OF INDIA میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کے متعلق لکھتے ہیں:-

"برہمنیت نے بدھ کو اوتار بنا دیا۔ بدھ مت نے بھی یہی کیا۔ سنگھ بہت دولت مند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے اور ان میں ضبط وغیرہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بدھ مت کا تنزل شروع ہو گیا"[2]

اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی مسز رائس ڈیوڈس (MRS. RHYS DAVIDS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

"ان مریضانہ تخیلات کے گھیرے سائے میں گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی۔ ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا۔ اس کی جگہ دوسرے نے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں ذہن کی ان پُر فریب تخیلوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان مابعد الطبیعیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔ مجموعی حیثیت سے بدھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، بدھ مت برہمنیت میں گھل مل گیا"[3]

---

[1] ہندوستانی تمدن (اردو) ایشور ٹوپا۔ [2] تلاش ہند صفحہ ۲۰۱-۲۰۲ [3] ایضاً

خلاصہ یہ کہ چین اور ان تمام ممالک کے پاس (جو بودھ مت کے پیرو تھے) دنیا کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں دنیا اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتی، اور نہ ان کا سیدھا دست پاتی، اہل چین تمدن دنیا کے بالکل مشرقی کنارہ پر اپنی علمی اور تہذیبی میراث کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے جس میں نہ خود وہ کسی اضافہ کے خواہشمند تھے اور نہ دوسروں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے اہل تھے۔

وسط ایشیا کی قومیں

مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قومیں (مغل، ترک، جاپانی) وغیرہ بگڑے ہوئے بودھ مت اور وحشیانہ بت پرستی کے درمیان تھیں، نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی اور نہ سیاست کو کوئی ترقی یافتہ نظام ان کے یہاں تھا، دراصل یہ قومیں اپنے عہد وحشت میں تھیں، جاہلانہ تہذیب سے نکل کر تمدن کی طرف آرہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک بربریت اور زندگی کی ابتدائی منزل پر تھیں، عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دور طفولیت تھا۔

ہندوستان مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی نقطہ نظر سے

ہندوستان کے مؤرخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا (جو کسی زمانہ میں علم و تمدن اور اخلاقی تحریکات کا مرکز رہا ہے) پست ترین دور تھا، ہندوستان کے ارد گرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا، اس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا، اس کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات تھیں جن میں اس ملک کو نمایاں یکتائی حاصل تھی، ان خصوصیات کو تین عنوانات

ذیل میں بیان کیا جاسکتا ہے (۱) معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت (۲) جنسی خواہشات کی بحرانی کیفیت (۳) طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات۔

نت نئے دیوتا

چھٹی صدی عیسوی میں بت پرستی اپنے عروج پر پہنچی، ویدوں میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی، اس صدی میں یہ تینتیس کروڑ ہو گئی۔ اس عہد میں ہر شے، ہر عجیب شے، ہر کشش رکھنے والی اور زندگی کی کوئی ضرورت پوری کرنے والی چیز دیوتا بن گئی تھی جس کی پوجا کی جاتی تھی، اس طرح بتوں اور مجسموں، دیوتاؤں اور دیویوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ان دیوتاؤں اور قابل پرستش اشیاء میں معدنیات، دیوتا، اشجار و نباتات، پہاڑ اور دریا، حیوانات حتیٰ کہ آلات تناسل سب ہی شامل تھے اس طرح یہ قدیم مذہب افسانوی روایات اور عقائد و عبادات کا ایک دیومالا بن کر رہ گیا۔ ڈاکٹر گستاولی بان "تمدن ہند" میں لکھتا ہے:۔

"دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لئے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا لازمی ہے اگرچہ مختلف زمانوں میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے لیکن یہ کوشش بالکل بے فائدہ ہے۔ ہندو کے نزدیک کیا ویدک زمانہ میں اور کیا اس وقت ہر چیز خدا ہے جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کر سکے اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے۔ برہمنوں اور فلسفیوں کی صرف کامل کوششیں جو انھوں نے توحید قائم کرنے کے لئے کیں بلکہ کل وہ کوششیں بھی جو وہ دیوتاؤں کی تعداد گھٹا کر تین پر لانے کے لئے عمل میں لائے محض بیکار اور رائیگاں گئیں۔ سب عوام الناس نے ان کو تسلیم کرنا اور قبول کیا لیکن عملاً دیوتا ہمیشہ تعداد میں بڑھتے گئے اور ہر ایک چیز میں

ہر رنگ و بو میں اُن کے اوتار نظر آنے لگے۔[1]

چھٹی ساتویں صدی میں بت سازی کے فن نے بڑی ترقی کی۔ اس عہد میں فن اپنے کمال کو پہونچ گیا تھا۔ ہمارے ملک میں بت پرستی کا دور دورہ تھا، حتیٰ کہ بودھ مت اور جینی مذہب کو بھی مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی زندگی اور مقبولیت کو قائم رکھنے کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا۔ بت پرستی کے اس عروج اور مندروں اور مجسموں کی کثرت کا اندازہ چینی سیاح ہیون سیانگ (جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۴ء کے درمیان ہندوستان کی سیاحت کی ہے) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جس میں اس نے راجہ ہرش (۶۰۶-۶۴۷ء) کے جشن کی کیفیت سنائی ہے۔ ہیون سیانگ لکھتا ہے:-

"راجہ ہرش نے قنوج میں علمائے مذہب کا مجمع کرایا۔ کوئی پچاس ہاتھ اونچے مینار پر گوتم بدھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی۔ اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے شکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ والی کامروپ نے مگس رانی کی۔"[2]

ہیون سیانگ نے ہرش کے خاندان یا درباریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کوئی تو شیو کا پجاری تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا۔ بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے، بعض وشنو کی۔ ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لئے مخصوص کرے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے۔[3]

جنسی بحران

شہوانی جذبات اور جنسی میلانوں SEXUAL کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کے قدیم مذہب و تمدن میں پائے گئے، کسی اور دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔

---

[1] تمدن ہند ص ۴۳-۴۴ [2] ہیون سیانگ کا سفرنامہ از کرئی کے (مترجم یا سلطنت) [3] ایضاً

ملک کی مقدس کتابوں اور مذہبی حلقوں نے اہم واقعات حوادث کے وقوع اور موجودات کے وجود کی توجیہ کے سلسلے میں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہم اختلاط اور بعض اونچے گھرانوں پر ان کی توجہات کے بعض ایسے واقعات اور روایتیں بیان کی ہیں جن کو سن کر آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے ان حکایتوں کا سادہ لوح اہل مذہب پر جو بڑے اخلاص اور جوش ایمانی کے ساتھ ان کہانیوں کو دہراتے ہیں جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے اس کا قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں، ظاہر ہے کہ ان کے اعصاب اور جذبات پر یہ روایتیں غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوں گی اس کے علاوہ بڑے دیوتا (شیو) کے آلۂ تناسل (لنگم) کی پوجا ہوتی تھی اور بچے جوان مرد عورت سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر گستاولی بان اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ اہل ہند کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے جو انتہائی انس ہے اس کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اس کے اعمال کو یہ نہایت اہتمام سے بجا لاتے ہیں ان کے معبد پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں جن سے مراد آلۂ خلقت کے دونوں جزو ہیں یا اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں"[1]

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے[2] ہندوؤں کے معابد و منظم بداخلاقی کا مرکز تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم CORRUPTION کا مرکز تھیں، راجاؤں کے محل اور بادشاہوں کے دربار میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے۔

---

[1] تمدن ہند ص ۴۴۳ [2] سیتا نتھ پکافی (راجا شنکر سروتی) ص ۲۲۳

اس تن پروری و نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی یا ریاضت و بھی پرہیز جوگ اور تپسیا کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا تھا لیکن ان دونوں سروں کے درمیان اعتدال و توازن سے محروم تھا چند افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے اور عام آبادی حیوانیت و نفس پرستی کے دھارے میں بہی چلی جا رہی تھی۔

طبقہ واریت

کسی قوم کی تاریخ میں اس قدر سخت طبقہ واری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشاغل کی ایسی سخت اور دائمی تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی و معاشرتی قوانین میں ہے۔ ذات پات کی تفریق اور پیشے کی جکڑ بندیوں کی ابتدا وید کے آخری زمانہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ آریوں نے اپنی نسل اور نسل کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے اس ملک میں اپنی فاتحانہ حیثیت قائم رکھنے اور اپنا تفوق و برتری برقرار رکھنے کے لئے اس طبقہ واری تقسیم اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے:—

"ویدی زمانہ کے آخر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مختلف پیشے کم و بیش آبائی ہوتے جا رہے تھے اور ذات کی تقسیم شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی۔ ویدی آریوں کو یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنی پرانی نسل کو اقوام مفتوحہ کے میل جول سے محفوظ رکھیں۔ اور جس وقت قلیل التعداد فاتحین مشرق کی طرف بڑھے اور انھوں نے دیسی اقوام کے ایک بہت بڑے گروہ کو فتح کر لیا تو یہ ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی اور مفتوحوں کے اس کا لحاظ کرنا لازمی ہو گیا۔ نسل کے مسائل کو آریہ سمجھ چکے تھے انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پوری حفاظت نہ کرے

تو وہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔[1]

لیکن اس کو ایک مرتب و مفصل قانون کی شکل دینے کا سہرا منوجی کے سر ہے۔ منوجی نے پیدائش مسیح سے تین سو برس پہلے (جب ہندوستان میں یہ تہذیب عروج پر تھی) ہندوستانی سماج کے لیے اس قانون کو مرتب کیا اور تمام اہل ملک نے اس کو بالاتفاق قبول کیا اور اس نے بہت جلد ملکی قانون اور ایک مذہبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی، یہ وہی قانون ہے جس کو ہم آج منوشاستر کے نام سے جانتے ہیں۔

منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں (۱) برہمن یعنی مذہبی پیشوا (۲) چھتری لڑنے والے (۳) ویش زراعت و تجارت پیشہ اور (۴) شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا، اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے۔ منوشاستر میں ہے:۔

"خالق مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔"[2]

"اس دنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیئے۔"[3]

"برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کے چڑھاوے چڑھانا اور دان دینا لینا کا فرض قرار دیا۔"[4]

"چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور خواہشات نفسانی میں نہ پڑے۔"[5]

"ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے،[6]

۱؎ تمدن ہند ص ۱۳۳ ۲؎ منوشاستر باب اول ص ۲۱ ۳؎ ایضاً ص ۲۲ ۴؎ ایضاً ص ۲۳ ۵؎ ایضاً ص ۲۴

وید پڑھے، تجارت لین دین زراعت کرے۔[۱]

"شودر کے لئے ذات مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے"[۲]

اس قانون نے برہمنوں کو دوسری ذاتوں کے مقابلہ میں اتنا امتیاز اور تفوق و تقدس عطا کیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر بن گئے۔ منوشاستر میں ہے :۔

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے، وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت"[۳]

"جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے کل چیزیں اسی کی ہیں"[۴]

"برہمن کو ضرورت ہو تو وہ بلا کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا کیوں کہ غلام جائداد نہیں رکھ سکتا۔ اس کی کل املاک مالک کا مال ہے"[۵]

"جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے اگرچہ وہ تینوں عالم کو تباہ کیوں نہ کر دے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے"[۶]

"بادشاہ کو کیسی ہی آفت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو تو بھی اسے برہمنوں سے محصول نہ لینا چاہئے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو بھوک سے مرنے دینا چاہئے"[۷]

"سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی"[۸]

---

۱ منوشاستر باب اول ۹۰ ۲ ایضاً ۹۱ ۳ ایضاً ۹۹ ۴ ایضاً ۱۰۰

۵ ایضاً باب ہشتم ۴۱۷ ۶ ایضاً باب یازدہم ۲۶۲ ۷ ایضاً باب ہفتم ۱۳۳ ۸ ایضاً باب ہشتم ۳۸۰

اس قانون میں چھتری اگرچہ ویش اور شودر کے مقابلہ میں بلند ہیں لیکن برہمنوں کے مقابلہ میں وہ بھی ایسے ہیچ ہیں، منو لکھتے ہیں:۔

"دس سال کی عمر کا برہمن اور سو سال کی عمر کا چھتری گویا آپس میں باپ بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں لیکن ان دونوں میں برہمن باپ ہے۔"[1]

بدقسمت شودر

باقی رہے اچھوت شودر تو وہ ہندوستانی سماج میں اس قہری و مذہبی قانون کی رو سے جانوروں سے پست درجے کے اور کتوں سے زیادہ ذلیل تھے منو شاستر میں ہے:۔

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لئے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔"[2]

"شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہئے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔"[3]

"اگر شودر دو جنم والوں پر ہاتھ یا لکڑی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا اور اگر غصہ میں لات مارے تو اس کا پیر کاٹ ڈالا جائے گا۔"[4]

"اگر کوئی شودر کسی دوج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہئے کہ اس کے سرین کو داغ دے اور اسے ملک بدر کر دے یا اس کے سرین کو زخمی کرا دے۔"[5]

"اگر کمینہ شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔"[6]

۱؎ منو شاستر باب [illegible] ۲؎ ایضاً باب [illegible] ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً باب [illegible] ۵؎ ایضاً [illegible]
۶؎ ایضاً

۔کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے، الو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔[1]

ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت

برہمنی زمانہ اور تہذیب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا تھا جو ویدک زمانہ میں تھا منو کے قانون میں (بقول ڈاکٹر لی بان) عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی ہے اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔[2]

شوہر مر جاتا تو عورت گویا جیتے جی مر جاتی اور زندہ درگور ہو جاتی وہ کبھی دوسری شادی نہ کر سکتی اس کی قسمت میں طعن و تشنیع اور ذلت و تحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادم بن کر رہنا پڑتا۔ اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو جاتیں ڈاکٹر لی بان لکھتا ہے بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منو شاستر میں نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں بہت عام ہو چلی تھی کیونکہ یونانی مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔[3]

غرض یہ سرسبز و شاداب ملک جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا آسمانی مذہب کی تعلیمات سے عرصے سے محروم ہونے اور مذہب کے مستند ماخذوں کے گم ہو جانے کی وجہ سے قیاسات و تحریفات کا شکار اور رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا اور اس وقت کی دنیا میں جہالت و توہم پرستی، پست درجہ کی بت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ واری ناانصافی میں پیش پیش تھا اور دنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں مبتلا تھا۔

---

۱ منوشاستر ۲ تمدن ہند ص ۲۳۷ ۳ ایضاً ص ۲۳۸

عرب

دورِ جاہلیت میں عرب اپنی بعض فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے، فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے، حقیقت کے پُرجوش، صاف گو اور تیز حافظے کے قوی، مساوات، بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی، ارادہ کے پکے، زبان کے سچے، وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیاء اور ان کی تعلیمات سے دور ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دینی اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے، چھٹی صدی میں وہ تنزل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے، کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس میں دنیا کے امام تھے، اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہے تھے، غرض مذہب کے آخری حسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور معائب میں مبتلا تھے۔

دورِ جاہلیت کے بُت

جہالت و جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول و عام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بتوں اور مورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکزِ توجہ بنانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور وہ شرک [illegible] جس کا

خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا[1] عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا، اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ، قربانی، حلف، دعا و استعانت) انھیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے، اور ملک میں کھلی بت پرستی، خدا سے بے تعلقی اور عمومی شرک کا دور دورہ تھا۔[2]

عرب میں ہر ہر قبیلہ، ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بت تھا، بلکہ ہر گھر کا بت جدا تھا، کلبی کا بیان ہے کہ مکہ کے ہر گھر کا ایک بت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے، جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بت کو حصول برکت کے لئے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بت کو چھوتا[3] لوگوں کا بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا، کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا، کسی نے بت تیار کر لیا تھا، جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا، وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا، حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے اردگرد اسی شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا، یہ ان پتھروں کو "انصاب" کہا کرتے تھے[4]، خود خانہ کعبہ کے اندر، اور خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا، اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بت تھے[5]، بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اس کو پوجتے، بخاری میں ابو رجاء العطاردی سے روایت ہے کہ ہم لوگ

---

[1] وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ [2] عرب جاہلیت کے عقائد کی حقیقت و شرک کی تفصیل کے لئے مزید تفاصیل کو معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو شامی فاضل محمد عزت دروزہ کی کتاب "بیئۃ النبی" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماحول اور ماحول قرآن کی روشنی میں)۔

[3] کتاب الاصنام ص ۳۳ [4] ایضاً [5] صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکہ۔

پتھر کو پوجتے تھے اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے[1] کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔[2]

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے جن ستارے سب شامل تھے فرشتوں کے بارہ میں ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لئے ان سے شفاعت کے طلبگار ہوتے تھے ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے ان کی قدرت اور اثر اندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔[3]

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی[4] صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا بنو تمیم دبران کی لخم و جذام مشتری کی قبیلہ طے سہیل کی بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔[5]

اخلاقی و اجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کئے ہوئے تھے اور

---

۱ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ ۲ کتاب الاصنام ۳ ایضاً ص۳۳
۴ ایضاً ص۳۴ ۵ طبقات الامم (صاعد اندلسی) ص۴۳

اس کے اسباب واضح ہیں! شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اس کا
تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے عربی زبان میں اس کے
نام جس کثرت سے ہیں اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے
اس سے اس کی مقبولیت و عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے[1]، شراب کی دوکانیں بر سر راہ
کھلی رہتیں اور علامت کے طور پر ان پر جھنڈا لہراتا[2]، جوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی
اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مُردہ دلی کی دلیل تھی[3]، تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ
زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھربار کو داؤں پر لگا دیتا تھا، پھر بیٹھا ہوا حسرت سے اپنے مال کو
دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا، اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جھگڑوں کی نوبت آتی ہے[4]۔
حجاز کے عرب و یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے، اس سلسلہ میں بڑی
بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے تھے[5]، زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے
واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے، اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے، زنان بازاری
اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا[6]۔

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا رکھی جاتی تھی، اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب المخصص (ابن سیدہ) الجزء ۱۱ ص ۷۲-۱۰۳ [2] ملاحظہ ہو معلقات، معلقہ عنترہ بیت [illegible]
[3] دیوان [illegible] [4] [illegible] [5] ملاحظہ ہو
[illegible]
[6] ملاحظہ ہو العقد الفرید [illegible]

حقوق پامال کیے جاتے، اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے[1]، دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی[2]، مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی، کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں، جو مردوں کے لئے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں[3]۔

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انھیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا، ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا، ایک اس پر عمل کرتا تھا، دس چھوڑتے تھے، یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک کہ اسلام پھیل آیا[4]، بعض ننگ و عار کی بنا پر، بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے، عرب کے بعض شرفاء و رؤساء ایسے موقع پر بچیوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے[5]، صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا[6]، بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی تو باپ دھوکہ دے کر اس کو لیجاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا، اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کئے ہیں[7]۔

قبائلی وخاندانی عصبیت و امتیاز

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی، اس عصبیت کی

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۲ [2] سورۃ النساء آیت ۱۹ [3] سورۃ الانعام آیت ۱۴۰ [4] المیدانی [5] الاحظہ ہو بلوغ الارب فی احوال العرب، الوسی [6] کتاب الاغانی [7] ملاحظہ ہو سنن الدارمی ج ۱ باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجھل والضلالۃ ص ۳

نیا وجاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے "اُنصر اخاک ظالماً او مظلوماً"
یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال
میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا، ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا، بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے، وہ عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے، آنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے[1]، ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا، یہ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت

عرب فطرۃً جنگجو واقع ہوئے تھے، اور ان کی صحرائی اور خونریز زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا، جنگ ان کے لئے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل بستگی کا سامان بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا، ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لئے ہم اپنے برادر و حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں[2]، ایک عرب شاعر دعا کرتا ہے کہ میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پھر جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے اور اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا موقع ملے[3]۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۱۹۹ [2] واحیاناً علی بکر اخینا اذا ما لم نجد الا اخانا (حماسہ)

[3] اذا الفرس الوخی غدا و مرۃ ظہرھا فشب الالہ الحرب بین القبائل (حماسہ)

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لیے معمولی کام تھا۔ جنگ کو بھڑکانے کے لیے معمولی واقعات کافی تھے۔ وائل کی اولاد بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہایا۔ ایک عرب سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ دونوں قبائل[١] مٹ گئے، ماؤں نے اپنی اولاد کھو دی، بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے، لاشیں دفن نہیں کی جاتیں۔[٢] پورا جزیرہ عرب گویا رہزنی کا جال تھا، کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکے سے قتل کر دیا جائے گا۔ لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان اچک لیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لیے بدوؤں کی پہرہ داری، مضبوط بندوبست اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی۔

دنیا کا عمومی جائزہ

ایک انگریز سیرت نگار آر وی سی باڈلے نے (R. V. C. BODLEY) اپنی کتاب "پیغمبر" (THE MESSENGER) میں زمانہ بعثت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک و اقوام کا تذکرہ کیا ہے:-

"تمام روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عرب کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا، جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اوّل ہی تباہ ہو چکی تھیں یا اپنے شاہی دور کے اختتام پر پہنچ چکی تھیں۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت، ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کوئی ایسا

---

١ ملاحظہ ہو کتاب "ایام العرب" ٢ ملاحظہ ہو تاریخ طبری۔ ج ٢ ص ١٢٣

ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

یہودی تمام دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے ان کو کوئی مرکزی رہنمائی حاصل نہ تھی۔ حالات کے مطابق یا تو ان کو محض برداشت کیا جاتا یا اذیتیں دی جاتیں کوئی ملک ان کا اپنا ذاتی نہ تھا اور ان کا مستقبل اسی قدر غیر یقینی تھا جس قدر کہ آج ہے۔

پوپ گریگری اعظم GREGORY THE GREAT کے حلقہ اثر سے باہر عیسائی اپنے سہل اعتقاد کی قوتوں کے پیچیدہ معانی ایجاد کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھے۔

ایران میں تمام سلطنت کی صرف ایک کرن رہ گئی تھی خسرو ثانی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھا۔ اس نے روم کو شکست دے کر کیپیڈوشیا CAPADOCIA، مصر و شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے ۶۱۵ء میں (جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رہنما ظاہر ہو چکے تھے) بیت المقدس کو تاراج کر کے مقدس صلیب کو چھین لیا تھا اور دارا اول کی زبردست عظمت و شوکت کو دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشرق وسطیٰ کی عظمت گزشتہ کو زندگی کی ایک نئی قسط مل گئی ہے لیکن یہ نہ تھا۔ بازنطینی رومی اب بھی اپنی گزری ہوئی چستی رکھتے تھے جب خسرو اپنی فوج کو قسطنطنیہ کی فصیلوں پر لایا تو انھوں نے ایک آخری کوشش کر دکھائی۔

مشرق بعید میں حالات کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑ رہے تھے ہندوستان اب بھی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دوسرے پر فوقیت کے لیے جدوجہد میں مصروف تھیں۔

چینی ہمیشہ کی طرح آپس میں نبرد آزما تھے خاندان سوئی آیا اور گیا اور اس کی

جو گینگ نے لی جو تین صدیوں تک حکمران رہا۔

جاپان میں پہلی مرتبہ ایک عورت تخت نشین ہوئی، بدھ مت جڑ پکڑنے لگا تھا اور جاپانی تصورات اور مقاصد پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹے چھوٹے ملک تھے، اسپین وسی گوتھوں (VISI GOTHS) کے زیر اثر تھا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس سے جس پر انھوں نے لوائر (LOIRE) تک قبضہ کر رکھا تھا، نکالے گئے تھے، وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو اس سلم حملہ کے لئے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں تقسیم تھا، ڈیڑھ سو سال رومیوں کو روانہ ہوئے ہو چکے تھے، جن کی جگہ اینگلو سیکسن لوگوں کی آمد نے لے لی تھی، خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل تھا۔[1]

---

[1] ۱۸۔۱۹ (باختصار) ترجمہ سید قاسم حسنی۔

زمانہ جاہلیت کا سیاسی و معاشی نظام

جاہلی دنیا کی دینی، روحانی، اخلاقی و اجتماعی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی و معاشی نقشہ پر خصوصی نظر ڈال لی جائے کہ دینی و اخلاقی اور اجتماعی ترقی و انحطاط میں سیاسی و معاشی حالات اور رائج الوقت سیاسی و معاشی تصورات اور قوانین کا بہت بڑا دخل ہے اور وہ قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم و فعال عنصر (FACTOR) ہے۔

مطلق العنان بادشاہت

زمانۂ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا، اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی، یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا، وہاں آلِ ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر اُن کا موروثی حق ہے اور انھیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے، تمام رعایا کو بھی پوری کوشش کر کے اس کا یقین دلا دیا گیا تھا چنانچہ انھوں نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا، اور حکومت کے بارہ میں اُن کا یہی عقیدہ ہو گیا تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قائم ہوتی تھی، اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان "نر" ہے اور زمین "مادہ" اور کائنات کو انھیں دونوں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ ختااول زمین و آسمان کے

جوڑے کی سب سے پہلی اولاد تھے۔[1] اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا اس کو
حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں۔ شہنشاہ
لا یان یا تائی تسنگ جب مرا تو اہلِ چین نے سخت ماتم برپا کیا اور حد سے زیادہ غم کیا۔ کسی نے
سوئیوں سے اپنا چہرہ خون آلود کیا، کسی نے اپنے بال کاٹے، کسی نے چاقو سے اپنے کان اتار کر
زخمی کر لیے۔

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیسا کہ
مملکت روما میں اعتقاد تھا۔ وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت کا بنیادی قانون
تھا۔ دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے۔ ان کی حیثیت ان رگوں اور
شریانوں کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہنچتا ہے۔ سلطنتِ روما ہر قانون اور
ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکتی اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کر سکتی تھی۔ وہ ہر ظلم و ستم کو
جائز سمجھتی تھی۔ رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ خلوص اور
وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا۔ کسی قوم کو حکومت
خود اختیاری یا اندرونی خود مختاری کا حق نہیں تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے
واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے۔ ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی
جس پر بوقتِ ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اس کو
چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے لبریز رکھ سکے۔ رابرٹ بریفالٹ
(ROBERT BRIFFAULT) رومی سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے:

"رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھی ہوئی خرابیاں و قتل و رشوت وغیرہ

---

[1] ٹرینگ جیسے انمیں کا رکن۔

نہ تھیں بلکہ اصلی برائی اور بنیادی خرابی فساد و شر اور حماقت سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشوونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور ریتیلی بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے گرنے سے صرف وقتی اور جزئی مرمتیں نہیں بچا سکتیں اور چونکہ تخم خبیث ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی اس لئے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کی عیش اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قوت کو غذا پہنچاتا تھا اس حکومت کا مرتبہ بلاشبہ روم میں تجارت! امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں گنی جاتی تھی اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت و قابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی لیکن یہ تمام خوبیاں حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھیں ورنہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔[1]

مصر و شام کی رومی حکومت

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر ALFRED BUTLER رومی حکومت کے بارہ میں لکھتا ہے:۔

"مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے

[1] ROBERT BRIFFAULT, THE MAKING OF HUMANITY, P. 155

رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک
نہیں تھا۔ رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز
ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اس کو فکر نہ تھی بلکہ ان کی حکومت ان
پردیسیوں کی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور محکوم قوم
کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی۔[1]

ایک عرب شامی مورخ شام میں رومی حکومت کے بارہ میں کہتا ہے:۔

"ابتداء میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا۔ اگرچہ ان کی
سلطنت میں اندرونی طور پر خلفشار رہتا لیکن جب ان کی حکومت بوڑھی ہو گئی تو اس نے
بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے ساتھ
کیا جا سکتا ہے اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا۔ روم نے براہ راست شام کا
بھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی بھی رومیوں کی طرح شہری حقوق
نہیں حاصل ہوئے نہ ان کے ملک کو رومی سلطنت اور سرزمین کا درجہ ملا۔
شامی ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے۔ اکثر سرکاری ٹیکس
ادا کرنے کے لئے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوتے۔ مظالم کی زیادتی تھی۔ غلام
بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا۔ اسی بیگار سے رومی حکومت نے
وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کئے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔"[2]

"رومیوں نے شام پر سات سو سال تک حکومت کی۔ ان کے آخری ملکی
اختلافات، خودسری اور ابتری کی بنیاد پڑ گئی تھی اور قتل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

[1] ARAB'S CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION P. 42

[2] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۱ ص ۱۱۳

یونانیوں نے شام پر ۲۰۰ سال حکومت کی، اس پورے عہد حکومت میں بڑی سخت جنگیں بپا ہوئیں، رعایا پر مظالم ہوئے اور یونانیوں کے حرص و ہوس کی پوری کیفیت کھل کر ظاہر ہو گئی، شامی قوم پر یونان کی سلطنت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی۔[1]

خلاصہ یہ کہ بدیسی سامراج کے ہاتھوں روم و ایران کے ممالک انتہائی تکلیف و مصیبت میں تھے، اور سیاسی، مالی، اقتصادی ہر لحاظ سے ملک کے تمام مرکز اور دار السلطنت حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے۔

ایران میں خراج اور ٹیکس وصول کرنے کا نظام

ایران میں سیاسی و معاشی نظام نہ عادلانہ تھا نہ مستحکم، بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا، خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عملے کے اخلاق، ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام بدلتا رہتا تھا۔ "ایران بعہد ساسانیان" کا مؤلف لکھتا ہے:

"خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں مستقلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے چونکہ غلہ جات کی قیمت سال بسال مختلف ہوا کرتی تھی اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ سال کے شروع میں مالی آمد و خرچ کا تخمینہ ہو سکے، علاوہ اس کے بعض چیزوں کو ضبط میں رکھنا بھی بہت مشکل تھا، بسا اوقات نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر دفعتہً جنگ چھڑ گئی تو مصارف بے پناہ، ایسی حالت میں غیر معمولی ٹیکس کا لگانا ضروری ہو جاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ اس کی زد غریب طبقے پر ہی خصوصاً پڑتی تھی۔"[2]

شاہی خزانے اور ذاتی دولت

پبلک کے فائدے کے لئے جتنا روپیہ شاہی خزانے سے خرچ ہوتا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا

---

[1] خطط الشام از محمد کرد علی ج ۱، ص ۱۰۱

[2] ایران بعہد ساسانیان ص ۲۲۲

شاہانِ ایران کے یہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے خزانہ میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیاء جمع کرتے[1] خسرو دوم نے ۶۰۷-۶۰۸ء میں طیسفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا یعنی تقریباً سینتیس[2] کروڑ پچاس لاکھ فرانک طلائی (چار ارب اڑسٹھ کروڑ روپئے) حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا[3] خسرو دوم کے تاج میں ۱۳۰ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا[4]۔

طبقاتی تفاوت

ایران کی قومی زندگی میں دولت و خوشحالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی، معدودے چند اشخاص نہایت دولت مند تھے باقی نہایت تنگدست اور پریشان حال۔ ایرانی تاریخ میں نوشیرواں کا زمانہ حسنِ انتظام اور عدل گستری کے لئے ضرب المثل ہے۔ ایران بعہد ساسانیان[5] کا مصنف اس عہد کے متعلق لکھتا ہے:-

> "خسرو (نوشیرواں) کی مالی اصلاحات میں بیشک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا۔ عوام الناس اسی طرح جہالت و عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے جیسا کہ زمانۂ سابق میں۔ بازنطینی فلسفی جو شہنشاہ کے یہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص۱۹۵ [2] ایضاً ص۱۱۹ [3] ایضاً ص۱۳۰ [4] تاج جو سونے اور چاندی کا بنا ہوا اور زمرد، یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا، بادشاہ کے سر کے اوپر چھت سے ایک سونے کی زنجیر کے ذریعے سے لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب نہ جایا جائے نظر نہیں آتی تھی اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے لیکن حقیقت میں اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس کا وزن ۹۱½ کلو تھا (تقریباً ۲½ من ہوا)
ایران بعہد ساسانیان ص۱۳۱

ایران سے جلد برداشتہ خاطر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنے بلند نظر فلسفی نہ تھے کہ ایک
غیر قوم کی عادات و رسوم کو ہمیشہ غیر جانبداری کی نظر سے دیکھ سکتے اور جن باتوں کو وہ ایک فلسفہ
بادشاہ کی سلطنت میں دیکھنے کے خواہاں تھے وہ ان کو نظر نہ آئیں اور چونکہ علم اور فن اس کے
معاشرہ کا انہیں ذوق نہ تھا اور ان کی ذہنیت ایسی نہ تھی جو کسی علم کے جاننے والے کی ہوتی
ہے لہٰذا ایرانیوں کی بعض رسوم مثلاً تزویج محرمات کی رسم یا لاشوں کو زمین پر کھلا چھوڑ دینے
کی رسم کیا ہم نے ان کو مجرم کیا لیکن بعض بیہودہ رسمیں نہ تھیں جن کی وجہ سے ان کو ایران میں رہنا
ناگوار ہو۔ جیسے ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور
فاصلہ اور خستہ حالی جس پر نچلے طبقے کے لوگ زندگی بسر کرتے تھے یہ وہ چیزیں تھیں جن کو
دیکھ کر وہ آزردہ خاطر ہوئے۔ طاقتور لوگ کمزوروں کو دباتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ظلم
و بے رحمی کا سلوک کرتے تھے۔[1]

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا اس کی معاصر و حریف بازنطینی سلطنت میں بھی
سخت تقسیم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا۔ رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے:۔

"یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے
اس کی حرکت اور ارتقاء کو روک دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پاتے اسی لئے رومی
معاشرہ اپنے انحطاط کے دور میں سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں
کسا ہوا تھا سوسائٹی میں کسی کو یہ مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے ہر شخص کے لئے ضروری
تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے۔[2]"

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں بحوالہ اگوتھیاس ص ۴۲۵ [2] THE MAKING OF HUMANITY P. 160

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لئے مخصوص تھے جو جاہ و حشم رکھنے اور نظام میں ان کا رسوخ تھا۔

ایران کے کسان

نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی۔ ان ٹیکسوں سے بچنے اور اس حکومت کی فوجی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس سے ان کو دلی لگاؤ نہ تھا۔ انھوں نے عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی۔ نہ ان کو اس مقصد سے کچھ دلچسپی تھی جس کے لئے بار بار جنگیں کی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہو گیا۔ "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف ایران کے کاشتکار طبقے کے متعلق جو ملک کی خوراک اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا لکھتا ہے:-

> "کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی وہ اپنی زمین کے ساتھ بندھے رہتے تھے اور ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ مورخ آمیان مارسیلینوس لکھتا ہے کہ ان بیچارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے گویا ابدی غلامی اُن کی تقدیر میں لکھی ہے اور کسی قسم کی تنخواہ یا اُجرت سے اُن کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔[1] ..... کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ۔"[2]

---

[1] ایران بعہد ساسانیان، ص ۳۴۲ [2] ایضاً

حکام کا رویہ

حکومت کے اہل کار و عہدہ دار عام رعایا اور ملک کے باشندوں کے ساتھ ایسی سخت گیری اور بیدردی کا برتاؤ کرتے کہ اہلِ ملک ان سے عاجز تھے، ان حکام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کی جان و مال کی پرواہ تھی، نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس، لوگ شکایتیں کرتے، لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی، یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اندھیر نگری ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں، بعض اوقات وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے۔

مصنوعی معاشرت اور پُرعشرت زندگی

روم و ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا، مصنوعی تہذیب اور ایک پُرفریب زندگی کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا، جس میں وہ سر سے پاؤں تک غرق تھے، سلاطین روم اور شاہانِ ایران اور اُن کے امراء و رؤساء خوابِ غفلت میں پڑے تھے، لذت اندوزی کے سوا انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی، عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا[۱] تکلفاتِ زندگی، تعیشات اور سامانِ آرائش کی وہ جدتیں تھیں اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، پارسی مؤرخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق "کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں، پچاس ہزار اصیل گھوڑے، اس قدر سامانِ تعیش، محلات، نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے، اس کا محل اپنی شان و شکوہ

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ایران بعہد ساسانیان" کا باب نہم "آخری شاندار عہد"۔

اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا۔[1] مکاریوس لکھتا ہے کہ "تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ
نے ان شاہان ایران کی طرح داد عیش دی ہو جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام
شہروں سے آتی تھیں جو شرق اوسط اور مشرق اقصیٰ کے درمیان واقع تھے"[2] اسلامی فتوحات کے
بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انھوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ
نہیں لگایا جا سکتا۔ ان چھوٹے ہوئے سامانوں میں بیش قیمت جوڑے، طلائی ظروف، سنگار کا
سامان، عطریات وغیرہ تھے۔[3] طبری کی روایت ہے کہ ایرانیوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے
جو سربمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان
ہوگا کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں۔[4] مورخین نے فرش بہار کی (جس پر بیٹھ کر
امرائے ایران موسم خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، تقریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا۔ اس کی زمین سونے کی تھی
جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی، چمن تھے جن میں پھول اور
پھل دار درخت قائم تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے
چاندی کی اور پھل جا بجا جواہرات کے بنائے گئے تھے، گرد زمرد کی جدول تھی، دریا
میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی تھیں جو موسم خزاں میں
تاجداران آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے اور دولت
کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانے نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔"[5]

رومی حکومت کے عہد میں شام اور اس کے مرکزی شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ زینل

---

[1] تاریخ ایران از شاہین مکاریوس (طبع مصر) ص ۱۹ - ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۱ [3] تاریخ طبری
[4] تاریخ اسلام از مولوی عبدالحلیم شرر۔ ج ۱ ص ۱۱۸ ماخوذ از تاریخ طبری وغیرہ۔

حکومتیں عیش پسندی اور تمدن کی باریکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ شہنشاہان روم اور ان کے شامی رؤساء و حکام نے کھل کر داد عیش دی، ان کے عالی شان محل اور دیوان، کھانے اور نوش کی مجلسیں، عیش کے ساز و سامان اور دولت و فراغت کے اسباب سے لبریز تھیں۔ تاریخ و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیش پسندی اور نفاست میں بہت آگے نکل چکے تھے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ نے جنھوں نے اسلام سے پہلے غسانی امراء شام کی مجلسوں میں شرکت کی تھی، جبلہ بن الایہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:—

"میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ رومی تھیں جو بربط بجا کر گا رہی تھیں اور پانچ وہ تھیں جو اہل حیرہ کے لحن میں گا رہی تھیں جنھیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفۃً بھیجا تھا، اس کے علاوہ عرب کے علاقہ مکہ وغیرہ سے بھی گوئیے آکر گایا کرتی تھیں، جبلہ جب شراب نوشی کے لئے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر قسم قسم کے پھول جیسے جوہی وغیرہ بچھائے جاتے اور چھوٹے چاندی کے ظروف میں مشک و عنبر لگائے جاتے، چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص رکھا جاتا، اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا، اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی اور اس کے اور اس کے ہم نشینوں کے لئے گرمیوں کا لباس آتا جس کو وہ اپنے اوپر ڈال لیتا۔ جاڑوں میں سمور کی پوستینیں کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کئے جاتے۔"[1]

والیان ریاست، شاہزادے، امراء اور اونچے گھرانوں کے افراد نیز متوسط طبقہ کے لوگ بادشاہوں کے نقش قدم پر چلتے اور کھانے پینے، پوشاک اور طرز رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کی عادات و اطوار اختیار کرتے۔ معیار زندگی بہت ہی زیادہ

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص…

بلند ہو گیا تھا اور معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ بن گئی تھی ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہو سکے یا جو پورے ایک گاؤں یا آبادی کی پوشاک اور سرپوشی کے مصارف کے لئے کافی ہو ایسا کرنا ہر ایک ممتاز اور شریف آدمی کے لئے ناگزیر تھا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سوسائٹی میں انگشت نمائی ہوتی اور وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوتا یہاں تک کہ یہی زندگی کی ایک ضرورت اور سوسائٹی کا ایک[1] قانون بن گیا جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی شعبی کہتے ہیں کہ اہل ایران اپنے سروں پہ جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی اس حیثیت کے مطابق ہوتی تھی جو انہیں اپنے قبیلہ میں حاصل تھی، چنانچہ جو اپنے قبیلہ میں شرافت و عزت کے لحاظ سے معیاری ہوتا تھا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی قیمت کی ہوتی تھی ہرمز کا شمار انہیں افراد میں تھا جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہذا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے[2] شرافت اور وجاہت کا معیار یہ تھا کہ وہ ایران کے سات اونچے گھرانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہو اتنا دبہ (زادویہ) جو کسریٰ کے عہد کا حاکم تھا وہ سیادت میں دوسرے نمبر کا سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کی ٹوپی کی قیمت پچاس ہزار تھی[3] رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی اور اس کی قیمت ایک لاکھ تھی۔

لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اس کے تباہ کن لوازم و ضروریات کے اس طرح عادی ہو گئے تھے اور یہ تمدن ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے تھے اور ان سے علیحدہ ہونا ان کے لئے ناممکن سا ہو گیا تھا، نازک سے نازک وقت میں اور مجبوری کی حالت میں بھی سادہ زندگی اور نیچی سطح پر اتر آنا ان کے لئے دشوار تھا۔

مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہ ایران یزدگرد جب بے سروسامانی اور پریشانی میں

---

[1] تاریخ طبری۔ ج ۳ ص [illegible] [2] ایضاً ص [illegible] [3] ایضاً ص [illegible]

دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں مگر اس عجلت و پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا ہے اس سے اس ذہنیت اور معیار تمدن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویّے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار باز دار اور بہت سے دوسرے لوگ لیتا گیا اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی"[1]

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا، پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا، اس نے کہا کہ چاہے میں پیاسا مر جاؤں مگر اس بھدّے پیالہ میں پانی پینا میرے لئے ممکن نہیں، چنانچہ اس کے لئے تلاش کر کے دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وہ پی سکا[2]

ان جزوی واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑ گئی تھیں اور وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ اور فطری زندگی سے کس درجہ دور ہو چکے تھے۔

حکومت کی دولت ستانی

اس عیش پسندانہ اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں پر ایسے قدر اضافہ ہو جائیں جو رعایا کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں اور اہل حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال کھسوٹ لیا جائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وقت وقت کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت کے

---

[1] ایران بعہد ساسانیان صفحہ ۵۹۳ [2] تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۲۶۱

مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل ہو گئی، "ایران بعہد ساسان" کا مؤلف لکھتا ہے :۔

"باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذرانے لینے کا بھی دستور تھا جس کو آئین کہتے تھے، اسی آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کئے جاتے تھے، خزانۂ شاہی کے ذرائع آمدنی میں سے ہمارا خیال ہے کہ سب سے اہم ذریعہ جاگیر ہائے خالصہ کی آمدنی اور وہ ذرائع تھے، جو بادشاہ کے لئے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے، مثلاً فارنگیوں (علاقہ آرمینیہ) کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی"۔[1]

مؤرخ شام رومی حکومت کے طرز عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے :۔

"شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس ادا کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس داخل کرنے کی کسی ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا، اس کے علاوہ رومی قوم کے کچھ دوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے، مثلاً چنگی، کانیں، محاصل، اس کے علاوہ جو قطعات زمین کی کاشت کے قابل ہوتے اور چراگاہیں ٹھیکہ پر اٹھا دی جاتیں ان ٹھیکہ داروں کو "عشارین" کہتے تھے، یہ لوگ حکومت سے تحصیل وصول کے اختیارات خرید لیتے اور رعایا سے مطالبات وصول کرتے، ہر صوبہ میں ان ٹھیکہ داروں کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں، ہر کمپنی کے پاس کچھ منشی اور محصل ملازم تھے، جو اپنے کو افسروں اور مالکوں کے انداز میں پیش کرتے اور جس قدر ان کو لینے کا حق تھا اس سے زیادہ وصول کرتے، وہ لوگوں کو فراغت و راحت کے وسائل سے محروم کرتے اور اکثر ان کو

---

[1] "ایران بعہد ساسانیان" ص ۱۶۱

غلاموں کی طرح فروخت بھی کر دیتے تھے۔[1]

رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسی کا کسی نے خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ:-

"رجحان ان روم یہ ہے جو اپنی بھیڑوں کا اون کاٹ لیتے ہیں (کھال نہیں کھینچتے) واقعہ یہ ہے کہ دو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہانِ روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اون کاٹتے ہیں (کھال کھینچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"[2]

عوام کی خستہ حالی

روم و ایران دونوں مملکتوں میں اہلِ ملک دو علٰحدہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے ان دونوں طبقوں کے درمیان واضح اور بیّن فرق تھا ایک طبقہ بادشاہوں، شاہزادوں، اہلِ دربار، ان کے خاندانوں، عزیزوں اور ان کے متعلقین و وابستگان اور جاگیرداروں اور دولت مندوں کا تھا یہ لوگ سدا بہار عیش و عشرت کی سیج پر زندگی گزارتے ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ اور گلاب میں نہاتے یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ کاشتکاروں، کاریگروں، اہلِ حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا جن کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی یہ زندگی کے بوجھ، ٹیکسوں اور نذرانوں کے بارے تلے پِسے جاتے تھے ان کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے اندر جکڑا ہوا تھا وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ جال اور کس جاتا اس گھٹن اور

---

[1] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۵ ص ۴۲ [2] ایضاً

پُر مصیبت زندگی پر دوسری مصیبت یہ تھی کہ وہ اونچے طبقہ کی بہت سی باتوں میں نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے مزید برآں زندگی کی دوڑ میں ان کو وہ وقت اور پریشانی لاحق نہ ہوتی جو اس نقالی اور اونچے طبقہ کی ریس کرنے میں ان کو پیش آتی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی تلخ اور سراپا کوفت تھی، ان کا دماغ ہر وقت پریشان و پراگندہ رہتا اور ان کو حقیقی سکون اور اطمینانِ قلب کبھی میسر نہ آتا۔

سرکش دولتمند اور خود فراموش مفلس

سرمایہ داری کی سرکشی و خود فراموشی اور افلاس کی بے بسی اور خود فراموشی کے دو انتہائی سروں کے درمیان انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی، اخلاقِ عالیہ اور زندگی کے بلند اصول پوری متمدن دنیا میں متروک و ناقابلِ عمل سمجھے جاتے تھے، دولتمندوں کو اپنے تفریحی مشاغل اور تعیشات سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ دین یا آخرت کے بارہ میں کچھ سوچیں، کاشتکاروں اور محنت کش طبقہ کو اس کے افکار و آلام اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مطالبات اس کی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ روز کی خوراک اور ضروریات کے علاوہ کسی اور طرف توجہ کرے، غرض یہ کہ زندگی اور زندگی کے مطالبات نے امیر و غریب سب کو الجھا رکھا تھا، اور اسی میں ہر ایک سرگرداں تھا، زندگی کی چکی اپنی پوری قوت کے ساتھ گردش کر رہی تھی جس کی وجہ سے انھیں مطلق مہلت نہ تھی کہ وہ دین کی طرف توجہ کریں اور روح و قلب کے بارہ میں اور انسانیت کی بلند قدروں کے متعلق غور کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف "حجۃ اللہ البالغۃ" میں ما قبل اسلام کی اس صورتِ حال کی پوری تصویر کھینچی ہے، وہ فرماتے ہیں:

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے
آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں
اور رومیوں نے زندگی کی آسائشوں اور سامان میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی
پیدا کر لی تھی اور اس میں تعمیم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت
لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان کے دربار
میں بڑے بڑے ذہین ماہر اور فن کار جمع ہو گئے تھے جو اس سامان آرائش و زینت
میں نزاکتیں پیدا کرتے رہتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً
شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور ترقی ہوتی رہتی تھی اور ان باتوں
پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ
درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس
عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، پر تکلف خوراک، اور تیار رہنے والے خوش رو جوان
اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس پوشاک میں تکلف نہ ہوتا تو ہم چشموں
میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کا بادشاہوں
کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو[1]، یہ تمام تکلفات ان کی زندگی
اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی
طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو
ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظام تمدن میں سرایت کر گیا تھا، ایک
مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا

---

[1] شاہان دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

ہر شہری پر یہ پُر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی
سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا
بات یہی تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے، اور
یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر
محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں، اگر وہ
ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں
دی جاتیں اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے
آبپاشی اور کاشتکاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لئے ان کو
پالا جاتا تھا اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی، اس پُر مشقت اور
حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ اُخروی کا
خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، اب اوقات پورے پورے ملک میں
ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔[1]

عالمگیر تاریکی

خلاصہ یہ کہ اس ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی
جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق
کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم
پر ہو، اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو، اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم

جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کچھ روشنی نظر آجاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے۔ صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا اور خدا کا سیدھا راستہ بتلانے والے اس قدر خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلند ہمت اور بے چین طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو جو اپنے قومی و نسلی مذہب (مجوسیت) سے غیر مطمئن و مایوس ہو چکا تھا اور حق و صداقت کا جویا تھا ایران سے لے کر شام کے آخری حدود تک اپنے طول و طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوا اور جو پیغمبروں کے بتلائے ہوئے راستہ پر قائم تھے۔[1]

اس عالمگیر تاریکی اور فساد کا نقشہ قرآن مجید نے جس طرح کھینچا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ	فساد پھیل گیا ہے خشکی اور تری میں لوگوں
أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ	کے اعمال کے سبب سے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو
الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ	بعض اعمال کا مزہ چکھا دے اور وہ
(الروم ۔ ۴۱)	باز آجائیں۔

---

[1] حضرت سلمان فارسیؓ کی سرگزشت جو اپنی مسلسل سند اور راویوں کی ثقاہت و عدالت کی وجہ سے ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، مسند امام احمد اور مستدرک حاکم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے

باب دوم

بعثتِ محمدیؐ کے بعد

بعثتِ محمدیؐ

ایسے وقت میں کہ انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا، دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ہلاکت کے مہیب و عمیق غار میں گرنے والی تھی، عین وقت پر اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو وحی و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی بخشیں اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ	الٓرا، یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ	ہے تاکہ تم تمام لوگوں کو ان کے پروردگار
اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ	کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف
(ابراہیم - ۱)	لاؤ، اس خدا کے راستہ کی طرف جو غالب
	اور ستودہ صفات ہے۔

آپ نے انسانیت کو صرف ایک بندگی کی دعوت دی، اور دنیا کی ساری بندگیوں اور غلامیوں سے نجات دی، زندگی کی حقیقی نعمتیں (جن سے انسانوں نے اپنے کو محروم کر دیا تھا) دوبارہ ان کو عطا کیں، اور وہ طوق و سلاسل اُن سے جدا کئے جن کو انھوں نے بلا ضرورت اپنے اوپر ڈال لئے تھے۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ
(الاعراف – ع ۱۵)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، پسندیدہ چیزیں حلال کرتے ہیں، گندی چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں، اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں جس کے تلے وہ دبے ہوئے تھے، ان پھندوں سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔

آپ کی بعثت نے انسانیت کو نئی زندگی، نئی روشنی، نئی طاقت، نئی حرارت، نیا ایمان، نیا یقین، نئی نسل، نیا تمدن، نیا معاشرہ عطا کیا۔ آپ کی آمد سے دنیا کی نئی تاریخ اور انسانیت کے کام کی عمر شروع ہوئی ہے، خود فراموشی و خودکشی میں جو زمانہ گزرا، وہ احتساب کے قابل نہیں، اور بینا و نابینا اور زندہ و مردہ ایک پلڑے میں رکھے نہیں جا سکتے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ
(فاطر ۱۹-۲۲)

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور تاریکی اور روشنی اور چھاؤں اور دھوپ اور زندہ آدمی اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے۔

جاہلیت و اسلام کے درمیان جو فاصلہ تھا اس سے بڑا کوئی فاصلہ نہیں، لیکن یہ فاصلہ جس سرعت کے ساتھ طے ہوا، دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ دنیا نے آپ کی رہنمائی میں یہ طویل سفر کس طرح طے کیا؟ اور جاہلیت سے اسلام کی طرف کس طرح پہونچی؟ آئندہ صفحات اسی سوال کے جواب اور اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں۔

جاہلیت پر ایک اجمالی نگاہ

گزشتہ صفحات سے اندازہ ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت

دنیا کی کیفیت بعینہ ایک ایسے مکان کی سی تھی جس کی بنیادیں ایک سخت زلزلے نے ہلا دی تھیں اس کی ہر چیز بے محل اور بے ترتیب تھی اس عمارت کا ساز و سامان زیر و زبر ہو گیا تھا جو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچ رہا تھا اس کی شکل بگڑ گئی تھی کہیں کی چیز کہیں پڑی تھی کہیں سامان کا انبار لگ گیا تھا اور کہیں بالکل جھاڑو پھر گئی تھی دیکھنے والے کو وہاں ایسا انسان نظر آتا تھا۔ جس کی نظر میں اپنی ہستی خود حقیر تھی وہ درخت پتھر اور پانی کی پرستش کرنے لگا تھا بلکہ وہ ہر ایسی چیز کو معبود بنا چکا تھا، وہ اتنا مسخ ہو چکا تھا کہ روزمرہ کی کھلی ہوئی حقیقتوں کے ادراک سے بھی قاصر تھا اس کا فکری نظام مختل ہو چکا تھا اس کے احساسات غلط کام کر رہے تھے اس کے لئے عام نظری بدیہیات نظری بن گئی تھیں یقینی اور قطعی چیزوں میں اس کو شک ہونے لگا تھا اور مشکوک و مشتبہ چیزیں قطعیات و یقینیات بن گئی تھیں اس کا ذوق فاسد ہو گیا تھا بدمزہ چیزیں اس کو خوش ذائقہ اور خوش ذائقہ بدذائقہ معلوم ہونے لگی تھیں اس کا احساس باطل ہو چکا تھا، دوست اور خیر خواہ کے ساتھ اس کی دشمنی اور دشمن اور بدخواہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی

معاشرے پر نظر ڈالئے تو وہ بھی اسی کا مرقع نظر آتا ہے ہر چیز غلط شکل یا غلط جگہ پر نظر آتی تھی اس معاشرے میں بھیڑیے کو گلہ کی نگہبانی اور ظالم فریق کو فصل خصومات کا کام سپرد کر دیا گیا تھا، اس سوسائٹی میں مجرم خوش قسمت اور آسودہ تھے اور نیک سیرت زحمت و کلفت میں مبتلا تھے اس معاشرے میں اخلاق کی پاکیزگی اور نیک چلنی سے بڑھ کر کوئی جرم اور حماقت اور بداخلاقی اور بداطواری سے بڑھ کر کوئی ہنر اور قابلیت کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اس معاشرے کے عادات اور اطوار ہلاکت آفریں تھے جو دنیا کو ہلاکت کے غار میں دھکیل رہے تھے شراب نوشی بے حیائی بداخلاقی جنون سود خواری لوٹ کھسوٹ دولت کی محبت بوالہوسی اور جوع البقر کہاں تک پہنچ گئی تھی سنگدلی اور بے رحمی اس حد تک پہنچ گئی تھی

کر لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں اور لڑکے بھینٹ پر قتل کر دیئے جاتے تھے۔ بادشاہ اکثر خدا کے بندوں کو اپنا کامل وراثت کے بندوں کو خانہ زاد سمجھتے تھے۔ عالم و درویش خدا بن بیٹھے تھے لوگوں کا مال کھاتے اڑاتے اور خدا کے راستے سے خدا کے بندوں کو روکنے کے سوا ان کا کچھ شغل نہ تھا۔

جو قابلیتیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی تھیں وہ بڑی بے دردی سے ضائع کی جا رہی تھیں یا بے محل خرچ ہو رہی تھیں نہ ان سے فائدہ اٹھایا گیا تھا اور نہ ان کو صحیح رخ پر لگایا گیا تھا۔ شجاعت اور بہادری نے ظلم و زبردستی، فیاضی و دریا دلی نے اسراف و فضول خرچی، خودداری اور غیرت نے جاہلی حمیت، ذہانت و ذکاوت نے دھوکہ بازی اور حیلہ سازی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ عقل کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ جرائم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرے اور خواہشات کی تسکین کے لئے نئے نئے راستے پیدا کرے۔

افراد اور قیمتی انسانی ذخیرے مدت سے ضائع ہو رہے تھے وہ ایک ایسا خام مال تھا جس کو کوئی تجربہ کار معمار نصیب نہیں ہوا تھا جو اس سے تمدن کا صحیح ڈھانچہ تیار کرتا، یہ لکڑی کے تختے تھے جو پڑے پڑے گل رہے تھے کوئی ایسا نہ تھا جو ان کو جوڑ کر زندگی کا جہاز تیار کر لیتا۔

منظم قوموں کی جگہ بھیڑوں کے چند گلے نظر آتے تھے جن کا کوئی چرواہا نہ تھا، سیاست شتر بے مہار تھی اور قوت ایک تلوار جو ایک بدمست کے ہاتھ پڑ گئی تھی جس سے وہ خود اپنے کو اور دوسروں کو زخمی کر رہا تھا۔

جزئی اصلاح کی ناکامی

اس خراب ماحول میں زندگی کا ہر شعبہ مصلح کی پوری زندگی کا طالب تھا اور فساد کا ہر گوشہ اس کا مستحق تھا کہ وہ اس کی ساری توجہات کا مرکز بن جائے اور اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت

نہ لیتے اگر کوئی عام انسان ہوتا جو وحی و نبوت کی ہدایت کے بجائے اپنی عقل یا خواہشات سے کام کرتا تو اس زندگی کے ایک ہی حصہ پر اپنی ساری کوششیں لگا دیتا، اور پوری عمر کو سوسائٹی کے صرف ایک مرض کے ازالہ پر قربان کر دیتا لیکن اس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے کہ انسان کی نفسیات کا معاملہ بہت پیچیدہ اور نازک ہے اس میں بہت سے چور دروازے ہیں اور عجیب عجیب روزن ہیں، اس کی اصلی کمزوری اور مرکزی مرض کو پکڑ لینا آسان نہیں، جب انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہے یا اس میں کجی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے صرف ایک عیب کو دور کرنا اور ایک ہی کمزوری کے پیچھے پڑ جانا کارآمد نہیں، اور نہ کسی ایک ہی عادت کو سنوارنا سود مند ہے جب تک اس کا رخ شر سے پھیر کر خیر کی سمت اور خرابی سے ہٹا کر درستی کی جانب نہ کر دیا جائے اور زندگی میں بگاڑ کی جو جھاڑی اگ آئی ہے اس کو نہ اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی زمین کو گھاس اور خود رو پودوں سے صاف نہ کر دیا جائے تاکہ نیکی اور خیر کی محبت اور اللہ عز وجل کے خوف کا پودا اس میں لگایا جا سکے۔

انسانی معاشرے کی ہر کمزوری اور ہر عیب پوری کی پوری زندگی کا مطالبہ کرتا ہے بعض اوقات پوری کی پوری جماعت کی زندگیاں اس کے مقابلہ میں صرف کار ہو جاتی ہیں اور اصلاح نہیں ہوتی اگر کسی ملک میں شراب کی لت پڑ گئی ہے اور زندگی کا فلسفہ ہی اس نے ناؤ نوش سمجھ لیا ہے تو اس سے منھ لگی شراب چھڑانی آسان نہیں ہے مے نوشی کس بات کا نتیجہ ہے؟ ایک ایسی ذہنیت اور مزاج کا جو مزہ کا عاشق ہے چاہے وہ لذت زہریلی ہو، اور بے خودی اور خود فراموشی کا طالب ہے چاہے ہزار گناہ سے خریدی جا سکتی ہو، اس آفتِ طبیعت اور اس ذہن کو تقریر و تحریر، شراب کے طبی نقصانات کی تفصیل اور سخت سے سخت قوانین اور جرمانوں سے روکا نہیں جا سکتا، اس کو صرف مکمل نفسیاتی تبدیلی سے روکا جا سکتا ہے، اس کے سوا اگر کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا تو

جرائم دوسرے رنگ میں ظاہر ہوں گے اور اپنے لئے دوسرے راستے پیدا کرلیں گے۔

پیغمبر اور سیاسی قائد کا فرق

عرب کے ملک میں کام کا بہت وسیع میدان تھا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی قومی رہنما یا محب وطن قائد ہوتے اور آپ کا طریقہ سیاسی اور ملکی رہنماؤں جیسا ہوتا تو آپ کے سامنے بہتر صورت یہی تھی کہ آپ عرب کو ایک وطن قرار دے کر عربی قبائل کا ایک اتحاد قائم کرتے اور عرب کی مضبوط طاقتوں سے ایک پختہ اور جنگجو بلاک بنالیتے اور ایک عربی ریاست یا جمہوریہ کی بنیاد رکھتے جس کے آپ نہایت آسانی کے ساتھ صدر ہو سکتے تھے ایسی صورت میں ابوجہل عتبہ وغیرہ آپ کے ساتھ پورا اشتراک عمل کرتے اور آپ کو عرب کی قیادت سونپ دیتے کیونکہ ان کو آپ کی صداقت و امانت کا مشاہدہ تھا انھوں نے آپ کو کئی مرتبہ بڑے اختلافی مسئلوں میں حَکَم بنایا تھا، عتبہ نے قریش کا نمائندہ بن کر آپ کے سامنے عرب کی سرداری کی پیشکش کی تھی اور کہا تھا کہ اگر آپ قیادت چاہتے ہیں تو ہم کو ذرا اختلاف نہیں آپ زندگی بھر ہمارے قائد بنے رہیں گے پھر اگر آپ کو یہ سیاسی مقام حاصل ہو جاتا تو آپ کے لئے ایرانی یا رومی سلطنت پر فوج کشی آسان تھی، آپ عرب کے شہسواروں کے ذریعہ ایران و روم کی سلطنت پر حملہ کرسکتے تھے اور ان دونوں کو مغلوب کرکے روم و فارس پر عرب کی فتح کا پھریرا اڑا سکتے تھے یہ کتنا دلکش خواب تھا اور عربی جذبۂ نخوت کی اس میں کیسی تسکین تھی، اور اگر آپ ان دونوں شہنشاہیوں سے بیک وقت برسرپیکار ہونا سیاسی دانش کے منافی سمجھتے تو یمن و حبشہ پر حملہ کرکے ان کو اپنی نوزائیدہ حکومت میں ملحق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

خود عرب میں اتنے اجتماعی، معاشی مسائل موجود تھے جو اعلیٰ سیاسی بصیرت، قوی تنظیم، انتظامی قابلیت، اعلیٰ تربیت کے برسوں سے منتظر تھے، ایک بلند پایہ قوی الارادہ رہنما اور

حقانی اصلاح وتنظیم کرکے اس کو دنیا کی بہت بڑی طاقت اور ایک باعظمت ملک بنا سکتا تھا
لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ ایک بگاڑ کو تبدیل
کرکے دوسرا بگاڑ اس کی جگہ پر لائیں اور ایک ناانصافی کو مٹاکر دوسری ناانصافی پیدا کریں
ایک چیز کو ایک جگہ ناجائز قرار دیں اور دوسری جگہ اس کو جائز قرار دیں ایک قوم کی خود غرضی
کی مخالفت کریں اور دوسری قوم کی خود غرضی کی ہمت افزائی کریں آپ ایک وطن پرست
لیڈر اور ایک سیاسی قائد بن کر نہیں آئے تھے کہ ایک قوم کو اجاڑ کر دوسری قوم آباد کرتے
دوسری قوم کے زر و جواہر سے اپنی قوم کا دامن بھرتے اور لوگوں کو روم و فارس کی غلامی سے
نکال کر آل عدنان اور اولاد قحطان کی غلامی میں داخل کرتے۔

آپ کا مقصد بعثت دنیا کو جنت کی بشارت اور عذاب آخرت کی وعید پہونچانا تھا۔
آپ داعی الی اللہ اور سراج منیر بنا کر آئے تھے کہ ساری دنیا کو روشن کریں آپ مبعوث فرمائے
گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں تمام لوگوں کو
مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہونچا دیں تمام مذاہب اور ادیان
کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دے کر اسلام کے انصاف سے متمتع ہونے کا
موقع دیں آپ کا کام نیکی کی ترغیب دینا بدی سے منع کرنا اچھی وپاک چیزوں کو حلال گندی وناپاک
چیزوں کو حرام قرار دینا اور ان بندشوں اور بیڑیوں کو توڑنا تھا جو انسانوں نے اپنی نادانی سے
یا مذاہب اور حکومتوں نے اپنی زبردستی سے لوگوں کے پاؤں میں ڈال رکھی تھیں۔

اسی لئے آپ کے مخاطب صرف ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے نہ تھے آپ کا خطاب
تمام انسانوں اور پورے انسانی ضمیر سے تھا عرب قوم اپنی حد سے بڑھی ہوئی پسماندگی اور
اخلاقی پستی کی وجہ سے ضرور اس کی مستحق تھی کہ آپ کی مہم وہیں سے شروع ہو اور کام نبوت کا

افتخار جس اسی قوم میں ہوا، اُمّ القریٰ (مرکز عالم) مکہ، اور جزیرہ نمائے عرب اپنے جغرافیائی محل وقوع اور سیاسی آزادی کی وجہ سے آپ کی جدوجہد کے لئے بہترین مرکز تھے اور عربی قوم اپنی نفسیاتی خصوصیات اور اخلاقی امتیازات کی وجہ سے آپ کے پیغام کی بہترین سفیر اور آپ کی دعوت کی موزوں ترین قاصد بن سکتی تھی۔

آپ ان مصلحین میں نہ تھے جو اپنی قوم یا اپنے زمانے کی چند اجتماعی کمزوریوں یا اخلاقی خرابیوں کے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں اور وقتی طور پر ان عیوب کے ازالے میں کامیاب ہوتے ہیں یا اس دنیا سے ناکام و سوگوار چلے جاتے ہیں۔

انسانیت کی صحیح گرہ کشائی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے دعوت و اصلاح کا کام اس کے

۱؎ گاندھی جی نے اپنی سیاسی اور روحانی زندگی کی ابتدا سے دو زبردست اصولوں کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ان دونوں پر اپنی وہ تمام طاقتیں، ذہنی و عملی صلاحیتیں اور وہ تمام وسائل صرف کر دیئے جو اس زمانے میں کم لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ پہلا اصول عدم تشدد تھا جس کی طرف انھوں نے ایک مستقل مذہب و فلسفہ کی حیثیت سے دعوت دی، اور جس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، گو چونکہ یہ جزوی نفسیاتی تبدیلی اور دین کی بنیادی دعوت کے طریقے سے جدا تھا اس لئے ان کی دعوت سے وہ گہری تبدیلی اور وہ اثر پیدا نہیں کیا جو انبیاء اپنی قوموں میں پیدا کر جاتے ہیں، انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ہندوستان کا وہ ہولناک فرقہ وارانہ فساد دیکھا جس میں ان کے اصول عدم تشدد کو بری طرح پامال کیا گیا اور بربریت و تشدد کا بدترین مظاہرہ ہوا، یہ واقعہ گاندھی جی کے لئے سخت ذہنی کوفت اور صدمہ کا باعث ہوا، بالآخر ان کو خود تشدد کا شکار ہونا پڑا جس کے خلاف ساری عمر انھوں نے تلقین کی تھی۔ دوسرا اصول چھوت چھات کا ترک تھا، اس میں بھی ان کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، یہ مثالیں اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ انبیاء کرام کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے اور وہی کامیابی کا راستہ ہے۔

صحیح راستہ سے شروع کیا۔ آپ نے طبیعتِ انسانی کے قفل میں ٹھیک چابی لگائی۔ یہ وہ قفل تھا جس کے کھولنے میں اپنے وقت کے تمام مصلحین ناکام رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کو سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور معبودانِ باطل کے انکار کی تلقین فرمائی اور طاغوت (خدا کے سوا ہر ہستی جس کی عبادت و اطاعت مطلق کی جائے) کی نافرمانی کی ہدایت فرمائی۔ لوگوں میں کھڑے ہو کر آپ نے بآوازِ بلند فرمایا: یاایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا "لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں کامیاب ہوگے۔"

جاہلیت اسلام کے مقابلہ پر

جاہلی معاشرے نے اس دعوت اور اس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس بات کو کچھ پیچیدگی محسوس نہیں ہوئی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے، وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ دعوت ایسا تیر ہے جو جاہلیت کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور جگر کے پار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس احساس سے جاہلیت کے گرد اضطراب پیدا ہوا اور جاہلیت کے سورما جاہلیت کے آخری معرکہ کے لئے میدان میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر اتر آئے۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا	اور ان کے ذمہ دار لوگ نکل پڑے کہ چلو
وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ ۖ إِنَّ هَٰذَا	اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یہ تو یقیناً
لَشَيْءٌ يُرَادُ (ص۔ ۶)	کوئی سوچی سمجھی چیز معلوم ہوتی ہے۔

اس زندگی کے ہر رکن نے صاف محسوس کیا کہ جاہلی تہذیب کی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظامِ زندگی خطرے میں ہے۔ اس موقع پر کتنی ہی باغ ظلم و زیادتی کے وہ لرزہ خیز واقعات پیش آئے جو تاریخِ اسلام میں محفوظ ہیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے جاہلیت پر زد لگانے کے لئے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا، اور آپ کا تیر نشانہ پر ٹھیک بیٹھا
آپ نے جاہلیت کی شہ رگ پر وار کیا جس سے جاہلیت تلملا اٹھی اور سارا عرب جو جاہلیت کا
شاید سب سے بڑا قلعہ تھا، لڑنے کے لئے آگیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح
جمے رہے، مخالفت کے طوفان اٹھے، فتنہ کی آندھیاں آئیں اور نکل گئیں، مگر آپ نے اپنی جگہ
سے ذرا جنبش نہ کی۔ آپ نے اپنے چچا سے صاف کہہ دیا "میرے چچا! اگر میرے ایک ہاتھ میں
سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو بھی میں اس کام کو چھوڑ نہیں سکتا، یہاں تک کہ
یا اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب کرے یا میں کام آجاؤں"[1]

آپ مکہ میں تیرہ[2] سال تک مقیم رہے۔ مسلسل توحید، رسالت، آخرت پر یقین کی دعوت
پوری صراحت کے ساتھ دیتے رہے، آپ نے اس کے لئے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا،
نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی، نہ وقت کی مصلحت کے لئے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک
گوارا کی۔ اسی دعوت کو ہر مرض کی دوا، اور ہر قفل کی کنجی سمجھا، اور ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو
اس کے بارہ میں ادنیٰ تذبذب بھی نہیں ہوا۔

اوّلین مسلمان

قریش نے اس دعوت کے مقابلہ میں گھٹنے ٹیک دیئے اور جاہلیت کے جھنڈے کے نیچے
آپ کے مقابلہ پر آگئے اور انھوں نے تمام ملک میں آپ کے خلاف آگ لگا دی اور اسلام کا
راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ اب آپ پر ایمان لانا اسی شیر دل مرد کا کام تھا جو موت سے
مذاق کرتا ہو، جو اپنے عقیدہ اور یقین کے لئے آگ میں کودنے اور انگاروں پر لوٹنے کے لئے تیار ہو۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۳ ص ۴۲

جو دنیا کی تمام ترغیبات سے منہ موڑ چکا ہو اور ساری دنیا سے رشتہ توڑ چکا ہو، قریش کے چند
جواں مرد آگے بڑھے، یہ نجات کا فیصلہ اور نوجوانی کا اقدام نہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی
زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں اور زندگی کے راستے اپنے لئے بند کر رہے ہیں، کوئی
دنیاوی ترغیب یا لالچ اس کی محرک نہ تھی کہ اس فیصلہ سے صرف خطرات کا دروازہ کھلتا
تھا اور ہر طرح کے دنیاوی فوائد اور راحت کے دروازے بند ہوتے تھے، یہاں صرف
یقین کی ایک طاقت تھی اور آخرت کی لالچ تھی، انھوں نے ایمان کی طرف بلانے والے
کو پکارتے سن پایا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ، یہ پکار سنتے ہی زمین ان پر تنگ
ہوگئی، طبیعتیں کھنچنے لگیں، راتوں کی نیند اڑ گئی، نرم بستر کانٹوں کی طرح چبھنے لگے،
انھوں نے دیکھا اللہ و رسول پر ایمان لانا اور اپنے یقین کا ساتھ دینا ان کے لئے
ضروری ہوگیا ہے، وہ دل و دماغ کے فیصلہ اور اپنے یقین کی مخالفت کرکے خوش نہیں
رہ سکتے تھے، حقیقت ان پر ظاہر ہو چکی تھی، وہ اس حقیقت کو ٹال نہیں سکتے تھے، حیوانی
زندگی سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا تھا، وہ اس کو اس میں دوبارہ پھنسا نہیں سکتے تھے،
ایک کانٹا تھا جو ان کے دل میں چبھ رہا تھا، وہ اس کانٹے کو پال نہیں سکتے تھے، آخر انھوں نے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے اور اسلام لانے کا فیصلہ کرلیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم ان کے شہر کے محلہ میں تھے، چند گز کا فاصلہ، مگر قریش نے آپ کو اتنا دور کر دیا تھا،
اور راستہ اتنا پر خطر بنا دیا تھا کہ آپ تک پہونچنا ایک دور دراز اور نہایت خطرناک سفر تھا،
شام و یمن کو تجارتی قافلے لے جانا اور عرب کے رہزنوں سے بچ کر نکل جانا اتنا مشکل نہ تھا،
جتنا مکہ کے اندر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچنا اور آپ سے ملنا مشکل تھا، لیکن
وہ آپ تک پہونچے، آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اپنی زندگی آپ کے حوالے کر دی، ان کی زندگی

خطرہ تھا اور آزمائشوں و مشکلات کا یقین تھا۔ مگر انھوں نے قرآن کی یہ آیت سنی تھی:۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یہ کہہ کر
أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا	چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ	آزمائش نہ ہوگی ہم نے تو ان سے پہلے
الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ	لوگوں کو خوب آزمایا ہے اللہ تعالیٰ ان
(العنکبوت - ۲و۳)	لوگوں کو ضرور دیکھ لے گا جو سچے ہیں اور
	وہ جھوٹوں کو ضرور معلوم کرے گا۔

اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی سن رکھا تھا:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں یوں ہی
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ	داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات
قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ	نہیں گزریں گے جو پہلے گزر چکے ان کو
وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ	مصیبت اور فقر و فاقہ سے سابقہ پڑا اور
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ	وہ ہلا کر رکھ دیئے گئے حتیٰ کہ رسول اور
أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ○	اس کے ساتھ کے ایمان لانے والے کہنے لگے
(البقرہ-۲۱۴)	کب مدد آئے گی معلوم ہو کہ مدد الٰہی قریب ہے

آخر وہی پیش آیا جس کی قریش سے توقع تھی: قریش نے اپنا ترکش ان بے بسوں پر خالی کر دیا اور سب تیر آزما لئے مگر ان کی پختگی اور یقین بڑھتا ہی گیا۔ اور کہنے لگے اسی کا تو ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس نے ان کے ایمان اور تسلیم میں اضافہ ہی کیا" ان آزمائشوں اور ابتلاؤں سے ان

عقیدہ میں مزید پختگی، ان کے یقین میں استحکام، ان کے دینی احساس میں ترقی اور ان کے ایمان میں لذت وحلاوت پیدا ہوئی، ان کی طبیعتوں میں نکھار پیدا ہوا اور وہ اس پختگی سے کھرا سونا بن گئے

صحابہ کرامؓ کی ایمانی تربیت

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو قرآن کی روحانی غذا پہونچا رہے تھے اور ایمان کے ذریعہ اُن کی تربیت فرما رہے تھے، اور آپ ان کو طہارتِ بدنی وخشوعِ قلبی خضوعِ جسمانی اور حاضر دماغی کے ساتھ دن میں پانچ بار ربُّ العالمین کے حضور میں جھکاتے اُن میں روز بروز روحانیت کی بلندی قلب کی صفائی، اخلاق کی ستھرائی، مادّی گرفت سے آزادی اور خواہشات کی اتباع سے چھٹکارا حاصل ہو رہا تھا اور مالکِ ارض وسما کا عشق اور شوق بڑھ رہا تھا، آپ ان کو تکلیف میں صبر اور درگزر اور ضبطِ نفس کی تلقین فرماتے تھے، لڑائی ان کے خمیر میں داخل تھی، تلوار سے ان کا ازلی رشتہ تھا، وہ لوگ اس قوم سے تھے، جس کی تاریخ بسوس وداحس وغیرہ کی خونیں داستانوں سے پُر ہے، یوم الفجار کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے، لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان جنگی سرشت انسانوں کو تھامے ہوئے تھے اور ان کی عربی نخوت کو ایمان کی طاقت سے دبائے ہوئے تھے، آپ ان سے کہتے (اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور نماز قائم کرو) وہ آپ کے حکم سے موم ہو گئے تھے، بغیر ادنیٰ تردد کے انھوں نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا، وہ سب برداشت کر رہے تھے، جو دنیا کی کسی قوم نے برداشت نہیں کیا، تاریخ نے ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جس میں کسی مسلمان نے اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کی ہو اور جوابی یا انتقامی کارروائی کی ہو، ضبط وتحمل کی یہ انتہائی مثال ہے جو ہمیں کسی جماعت کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

مدینۃ الرسول میں

قریش جب حد سے بڑھ گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو اللہ نے اپنے رسول کو اور آپ کے اصحاب کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ یثرب کو ہجرت کر گئے۔ اسلام اس سے پہلے یثرب پہنچ چکا تھا۔

مکہ یثرب والوں سے خوب گھل مل گئے حالانکہ ان کے درمیان کوئی صرف بنیادی سبب تھا۔ تاریخ نے دین کی طاقت و اثر کا پہلا کھلا منظر پیش کیا۔ اوس و خزرج نے جنگ بعاث سے ابھی ابھی دامن بھی جھاڑا تھا۔ دلوں کی کدورت، تشنہ تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ ایسے حالات میں اسلام نے دلوں میں الفت و محبت پیدا کی اس مصالحت کے لئے اگر کوئی شخص پوری دنیا کا خزانہ خرچ کر دیتا تو بھی اس کی طاقت سے باہر تھی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا۔ ایک بھائی چارہ جس کے سامنے سگے بھائیوں کی محبت گرد اور دنیا کی ساری دوستیاں بے حقیقت تھیں۔ تاریخ میں ایسی محبت و خلوص کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نوزائیدہ جماعت جو مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ پر مشتمل تھی ایک عظیم الشان اسلامی امت کی اساس اور اسلام کا سرمایہ تھی۔ اس جماعت کا ظہور ایسی کٹھن گھڑی میں ہوا جب کہ دنیا موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس جماعت نے آ کر اس کی زندگی کا پلڑا جھکا دیا اور ان تمام خطرات کو دفع کر دیا جو اس کو درپیش تھے۔ اس جماعت کا ظہور پھر اس کا استحکام انسانیت کی بقا کے لئے ضروری تھا۔ اسی لئے جب اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کی اخوت و محبت پر زور دیا تو فرمایا (اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد برپا ہوگا۔)

صحابہ کرامؓ کی ایمانی تکمیل

اور عہدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں صحابہ کرامؓ کی ایمانی تربیت و تکمیل کا سلسلہ جاری رہا، قرآن برابر ان کے قلوب کو طاقت اور فکر کو بالیدگی بخشتا رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس سے ان کو استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی، وہ لوگ تنگی و دستی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے، جس حال میں ہوتے خدا کی راہ میں اٹھ کھڑے ہوتے، یہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت میں دس سال کے اندر ستائیس بار جہاد کے لئے نکلے اور آپ کے حکم سے سو مرتبہ سے زائد کمربستہ ہو کر میدانِ جنگ کی طرف گئے، ان کے لئے دنیا سے بے تعلقی آسان بن گئی تھی، اہل و عیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے، قرآن کی آیات و احکام ان میں جو ان کے لئے پہلے سے مانوس نہ تھے نفس و مال، اولاد و خاندان کے بارے میں احکام نازل ہوئے جن کی تعمیل کچھ ایسی سہل نہ تھی، لیکن خدا اور رسول کی ہر بات ماننے کی عادت پڑ گئی تھی، شرک و کفر کی گتھی جب سلجھ گئی تو ساری گتھیاں ہاتھ لگاتے ہی سلجھ گئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ان کے ایمان کے لئے کوشش فرمائی، پھر ہر موقع اور ہر نئے حکم کے لئے مستقل کوشش اور جدوجہد کی ضرورت نہ رہی، اسلام و جاہلیت کے پہلے معرکہ میں اسلام نے جاہلیت پر فتح حاصل کر لی، پھر تو ہر موقع کے لئے ہر مرتبہ نئے معرکہ کی ضرورت باقی نہ رہی، وہ لوگ مع اپنے قلوب کے مع اپنے ہاتھ پاؤں کے مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن میں آ گئے، ان پر جب حق واضح ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی کشاکش باقی نہ رہی، آپ کے فیصلہ پر ان کو کبھی ذہنی

یا قلبی کشمکش پیش نہ آتی جس بات کا آپ فیصلہ فرما دیتے ذرا اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے روبرو اپنے چھپے قصوروں کا اقرار کیا اور اگر کسی گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اپنے جسموں کو حدود اور سزاؤں کے لئے پیش کر دیا، شراب کی حرمت کا نزول ہوا ہے تو چھلکتے ہوئے جام ہتھیلیوں پر تھے اللہ کا حکم ان کے بھڑکتے ہوئے جگر آلودہ لبوں اور شراب کے پیالوں کے درمیان حائل ہو گیا، پھر کیا تھا ہاتھ کو ہمت نہ تھی کر اوپر کو اٹھ سکے، لبوں کی تمنائیں وہیں خشک ہو گئیں، شراب کے برتن توڑ دیئے گئے اور شراب مدینہ کی گلیوں اور نالیوں میں بہہ رہی تھی۔

جب شیطان کے اثرات ان کے نفوس سے دھل گئے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جب ان کے نفوس کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے، نفسانیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ لوگ اپنے نفسوں سے ویسا ہی برتاؤ کرنے لگے جیسا کہ وہ دوسرے سے کرتے تھے، دنیا میں رہتے ہوئے مردانِ آخرت اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے والے بن گئے، نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے، نفقران کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتا، دولت سرکشی پیدا نہ کر سکتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے، اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا، بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہو سکتا، لوگوں کے لئے وہ میزانِ عدل تھے، وہ انصاف کے علمبردار تھے، اللہ تعالےٰ کے گواہ تھے، خواہ ان کو اپنے نفس کے خلاف گواہی دینی پڑے خواہ والدین اور اعزہ کے مخالف جانا پڑے تو اللہ تعالےٰ نے اپنی زمین کو ان کے قدموں میں ڈال دیا، اور دنیا کو ان کے لئے مسخر کر دیا، وہ اس وقت عالم کے محافظ اور اللہ کے دین کے داعی بن گئے، رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اپنا جانشین بنایا، اور آپ خود ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ رسالت اور امت کی طرف سے اطمینان لے کر رفیقِ اعلیٰ کی طرف سفر کر گئے۔

تاریخ کا عظیم ترین انقلاب اور اس کے اسباب

مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
دست مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی معاشرہ میں پیش آیا، انسانی
تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا، اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی، اس کی سرعت، اس کا
عمق، اس کی وسعت و ہمہ گیری، اس کی وضاحت اور فہم انسانی سے قرب، یہ سب باتیں محیر العقول
واقعہ کے نرالے پہلو تھے، یہ انقلاب دوسرے خارق عادات واقعات کی طرح کوئی چیستان
مسئلہ یا ناقابل فہم معمہ نہ تھا، علمی طریقے سے اس انقلاب کی تحقیقات کیجئے، تاریخ انسانی اور
معاشرہ انسانی میں اس کے اثرات کا مطالعہ کیجئے۔

ایمان اور اس کے اثرات

تمام لوگ خواہ عرب ہوں یا عجمی نہایت مسخ شدہ زندگی گذار رہے تھے، ہر وہ ہستی جو ان کے
لئے وجود میں لائی گئی تھی، اور حیوانات کے تصرفات کے تابع تھی، امر و نہی، سزا و جزا کی طاقت سے
محروم تھی، اس کی وہ پرستش کرنے لگے تھے، وہ بالکل ایک سطحی اور اتھلی مذہبیت رکھتے تھے
جس کا زندگی میں کوئی اثر اور ان کے طبائع، اذہان و ارواح اور قلوب پر کوئی اقتدار نہ تھا۔
اخلاق و معاشرت اس مذہبیت سے ذرا متاثر نہ تھے، اللہ تعالیٰ کی ہستی ان کی نگاہوں
میں ایسی تھی جیسا کہ ایک کاریگر اپنا کام پورا کرکے کنارہ کش اور گوشہ نشین ہو گیا ہو، ان کے
خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مملکت ان لوگوں کے حوالے کر دی تھی جن کو اس نے خلعت
ربوبیت سے سرفراز کیا تھا، اب وہ حکومت پر قابض اور سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

غذا کی تقسیم، ملک کا نظم و نسق اُن کے اختیار میں تھا، غرض ایک منظم حکومت کے جتنے شعبے اور محکمے ہوتے ہیں وہ سب ان کے انتظام میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر اُن کا ایمان ایک تاریخی واقفیت سے زیادہ نہ تھا، اللہ کو پروردگار سمجھنا اس کو زمین و آسمان کا خالق ماننا ایسا ہی تھا جیسے تاریخ کے کسی طالب علم سے پوچھا جائے کہ یہ قدیم عمارت کس کی تعمیر ہے؟ وہ جواب دے کہ فلاں بادشاہ کی، اِس بادشاہ کے نام سے اس کے قلب پر خوف و ہراس کی کوئی لہر نہ دوڑے نہ اس کے دماغ پر کوئی اثر پڑے، ان لوگوں کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف اور تضرع و دعا سے خالی تھا، اللہ کی صفات سے وہ بالکل بے خبر تھے، اس لئے ان کے دل میں اس کی محبت کا کوئی جذبہ اور اس کی عظمت و کبریائی کا کوئی نقش نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کو بہت مبہم مجمل اور عامیانہ سا علم تھا جس میں کوئی گہرائی اور قوت نہ تھی۔

یونانی فلسفہ نے خدائے تعالیٰ کی ذات کے تعارف کے سلسلے میں زیادہ تر نفی سے کام لیا، اس نے صفات کی نفی کی اور نفی کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا جس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مثبت تعریف اور کوئی ایجابی صفت نہیں ہے، نہ اس کی قدرت کا ذکر آتا ہے، نہ اس کی ربوبیت اس کی بے پایاں بخشش اس کی محبت و رحمت کا تذکرہ ہے، اس فلسفہ نے خلق اوّل کو تو ثابت کیا تھا لیکن علم و اختیار و ارادہ اور صفات کی نفی کی اور اپنی طرف سے ایسے کلیات و اصول وضع کئے جو اس ذات عالی کی تنقیص اور مخلوقات پر قیاس تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر سیکڑوں نفی ہو جائیں تو ایک ایجاب کا بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔

ہمارے علم میں آج تک ایسا کوئی نظام ایسا کوئی تمدن اور ایسی کوئی سوسائٹی وجود میں نہیں آئی جو محض نفی پر قائم ہو، یونانی فلسفہ کے حلقۂ اثر میں دین و مذہب خشوع و تضرع،

حوادث میں رب العالمین کی طرف توجہ قلبی و محبت و الفت کی روح سے یکسر خالی تھا اسی طرح اس دور کی مسیحیت روح سے تہی تھی اور صرف چند بے روح رسمیں اور ایمان کی بے جان نقلیں دنیا میں رہ گئیں۔

مسلمان امت اور عرب قوم اس بیمار عقیدہ و مسخ اور بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور متین عقیدہ تک پہنچ گئی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھا، معاشرت کو متأثر کرنے والا اور زندگی اور متعلقات زندگی پر حاوی تھا، وہ لوگ اس خدا کے وجود پر ایمان لائے جس کے بہترین نام ہیں جس کی شان سب سے اونچی ہے، وہ لوگ ایسے رب العالمین پر ایمان لائے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے، قیامت کے دن کا تنہا مالک، مختار و شہنشاہ، پاک ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (الحشر۔ ۲۲ تا ۲۴)

وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں، وہ جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا، وہی بڑا مہربان رحم والا ہے، وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، پاک ہے، سالم ہے، امن دینے والا ہے، نگہبانی کرنے والا ہے، زبردست ہے، خرابی کا درست کرنے والا ہے، بڑی عظمت والا ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کے شرک سے پاک ہے، وہ معبود ہے پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے، صورت بنانے والا ہے۔

اس کے اچھے اچھے نام ہیں سب چیزیں
اس کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں
اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست
حکمت والا ہے۔

جو اس کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا جنت اس کا انعام ہے اور دوزخ اس کی سزا جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں کشائش کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے آنکھوں کی چوریوں اور دلوں کے اسرار غیب جانتا ہے جو سراپا جمال، سراپا جلال، سراپا کمال اور محبت و رحمت ہے۔

اس گہرے وسیع اور واضح ایمان سے ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح تبدیل ہو گئیں جب بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور "لا الٰہ الا اللہ" کی گواہی دیتا اس کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو جاتا ایمان اس میں پیوست ہو جاتا یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون و روح کی طرح دوڑ جاتا جاہلیت کے جراثیم کو ختم کر دیتا اور اس کی جڑوں کو اکھاڑ کے پھینک دیتا دل و دماغ اس کے فیضان سے معمور ہو جاتے اور وہ شخص پہلا آدمی باقی نہ رہتا اس شخص سے صبر و شجاعت ایمان و یقین کے ایسے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فلسفہ و تاریخ اخلاق انگشت بدنداں ہیں قوت ایمان کے سوا کسی اور چیز سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

احتسابِ نفس اور ملامتِ ضمیر

یہ ایمان ایک کامیاب اخلاقی مدرسہ اور نفسیاتی تربیت تھی جو طالب علم کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ ارادی محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی، تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سُراغ نہیں ملتا جو نفس کے ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی۔

اگر کسی وقت صفتِ بہیمی زور کرتی اور انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی اور یہ ایسا موقع ہوتا جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور وہ شخص قانون کی دسترس سے باہر ہوتا تو یہی ایمان نفس لوامہ بن جاتا، دل کی پھانس چین نہ لینے دیتی، پریشان کُن خیالات کا سیلاب اُمڈنے لگتا، اس گناہ کی یاد میں چین حرام ہو جاتا، حتیٰ کہ وہ شخص خود قانون کے سامنے اقرارِ جُرم کرتا اور سخت سے سخت سزا کے لئے اپنے کو پیش کر دیتا اور پھر اس سزا کو برضا و رغبت جھیلتا تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ سکے اور آخرت کی جگہ دنیا کی سزا لے لے۔

ہمارے سامنے معتبر مؤرخین نے اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کئے ہیں جن کی نظیر اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی ان ہی واقعات میں سے ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ بھی ہے جس کو امام مسلم نے اپنی جامع صحیح میں نقل کیا ہے؛ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ مجھ سے خطا ہوئی ہے، میں زنا کا مرتکب ہو گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو پاک کر دیں آپ نے ان کو واپس کر دیا، دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ میں زنا کا مجرم ہوں؛ آپ نے دوبارہ پھر واپس کر دیا، اور ان کے گھرانے سے دریافت کرایا کہ ان کی سمجھ میں کسی قسم کی

جہاں کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور ایسی جگہ جہاں آدمی کا پورا اقتدار اور اختیار ہوتا اور کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہ تھی ہما یاں نفس کی ترغیبات اور خواہشات پر پورا اترتے۔ اسلامی فتوحات کی تاریخ میں دیانت وامانت واخلاص کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتیں یہ صرف ایمان راسخ اور اللہ کے دھیان اور ہر موقع و محل پر اس کے علم کے استحضار کے نتائج تھے۔

تاریخ طبری کی روایت ہے کہ مسلمان جب مدائن پہونچے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے حصہ کا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا، لوگوں نے کہا ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا ہمارے پاس جو مال ہے اس کو اس سے کچھ نسبت نہیں، ان لوگوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو تم کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی، ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ کوئی شخص نہیں، انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا میں یہ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ تم تعریف کروگے سب تعریف اللہ کی ہے اسی کے ثواب پر میں راضی ہوں، جب وہ واپس ہوا تو لوگوں نے ایک آدمی پیچھے کر دیا کہ معلوم کرو کون ہے؟ معلوم ہوا کہ عامر ان کا نام ہے اور عبد قیس قبیلہ سے ان کا تعلق ہے۔[1]

مخلوقات اور مظاہر سے بے رغبتی

توحید کے عقیدہ نے ان کا سر اونچا اور گردن فراز کر دی تھی کیا مجال تھی کہ غیر اللہ کے سامنے یا جابر بادشاہ کے آگے یا کسی عالم و درویش یا دینی یا دنیوی سردار کے سامنے ان کی گردن خم ہو اس ایمان نے ان کے دل و نظر کو خدائے تعالیٰ کی عظمت سے معمور کر دیا تھا مخلوقات

[1] تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۱۶

حسن وجمالِ دنیا کی دل فریبیاں، اتمان وشوکت کے مظاہر سب ان کی نظر میں ہیچ تھے، وہ جب
ملوک وسلاطین اور ان کے جاہ وحشم اور کر وفر اور ان کے درباروں کی سجاوٹ اور زیب وزینت پر
نظر ڈالتے اور یہ دیکھتے کہ یہ سلاطین اسی میں خوش ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے بے جان
مجسمے یا مٹی کی مورتیں ہیں جن کو انسانی لباس سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔

ابو موسیٰ کہتے ہیں جب ہم نجاشی کے پاس پہنچے تو اس کا دربار لگا تھا، دائیں جانب
عمرو بن العاص، بائیں جانب عمارہ تھے، مذہبی پیشوا رو در رو بیٹھے تھے، عمرو اور عمارہ نے بادشاہ
سے کہا کہ یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے، پادریوں نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو، حضرت جعفرؓ نے جواب
دیا کہ ہم صرف خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔[1]

حضرت سعدؓ نے رستم کے پاس جو کہ ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا، ربعی بن عامرؓ کو اپنا سفیر
بنا کر بھیجا، ربعی بن عامرؓ پہنچے تو دربار زریں فرش سے آراستہ تھا، رستم یاقوت اور بیش بہا موتی
زیب بدن کئے لباس بیش قیمت پہنے تاج سر پر رکھے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا، ربعی بن عامرؓ
پھٹے پرانے لباس میں پہنچے، مختصر سی ڈھال، چھوٹا سا گھوڑا، یہ ان کی حیثیت تھی، وہ گھوڑے پر
سوار فرش کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے گئے اور پھر گھوڑے سے اترے، قیمتی گاؤ تکیہ سے گھوڑا باندھ
دیا، اور خود رستم کے پاس جانے لگے، آلات حرب ساتھ اسی طرح خود جسم پر زرہ بھی موجود تھی، لوگ بولے
جنگی لباس تو اتار دو، کہنے لگے میں خود سے نہیں آیا، مجھے بلایا گیا ہے، اگر تم کو منظور نہیں تو ابھی واپس
جاتا ہوں، رستم نے کہا آنے دو، وہ اسی فرش پر نیزے سے سہارا لیتے ہوئے بڑھتے، نیزے کی نوک نے
فرش کو جا بجا سے کاٹ دیا، لوگ بولے تمہارا کیسے آنا ہوا، بولے ہم کو اللہ نے اسی لئے بھیجا ہے کہ
جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۳

داخل کر دیں اور دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہونچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں۔[1]

بے نظیر شجاعت اور زندگی کی حقارت

آخرت کے عقیدے نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسی دلیری بھر دی تھی جو بالکل خارق عادت تھی، ان میں جنت کا عجیب و غریب شوق اور زندگی کی تحقیر پیدا کر دی تھی، جنت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح کھنچ جاتا تھا جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں وہ اس طرح جنت کی جانب لپکتے تھے جیسے نامہ بر کبوتر اپنی اڑان میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی منزل پر پہونچ کر دم لیتا ہے۔

معرکۂ احد میں جب کہ بہت سے مسلمان میدان چھوڑ چکے تھے حضرت انس بن نضرؓ بڑھے انھوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے سعد بن معاذؓ! خدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اسی طرف سے آرہی ہے، انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اسّی سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے کچھ تلوار کے تھے کچھ نیزے کے اور کچھ تیروں کے زخم تھے ہم نے ان کو اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے جنھوں نے ان کو انگلی کے پور سے شناخت کیا اور کوئی نہ پہچان سکا۔[2]

بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا بڑھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہے تو عمیر بن حمام انصاری نے کہا یا رسول اللہ اس کی وسعت زمین و آسمان ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم کو شک ہے، کہنے لگے نہیں یا رسول اللہ میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا، آپ نے فرمایا ہاں ہاں پالوگے وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے پھر بولے اگر ان

---

[1] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) [2] بخاری و مسلم

کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا پھر تمام کھجوریں پھینکے اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی۔[1]

ابو بکر بن ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے والد دشمن کے مقابل تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں یہ سن کر ایک شخص اٹھا اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اس نے کہا ابو موسیٰ تم نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے انھوں نے جواب دیا ہاں وہ شخص اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور اس نے کہا میرا سلام قبول ہو اور تلوار کا پرتلا توڑ کر ڈال دیا اور تلوار لے کر دشمن کے مقابلہ میں آ گیا اور شہادت پائی۔[2]

عمرو بن جموح کے چار بیٹے تھے اور ان کے خود کے پیر میں لنگ تھا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جنگ میں تشریف لے جاتے تو دو بیٹے آپ کے ہمراہ جاتے جب آپ غزوۂ احد کے لئے تشریف لے جانے لگے تو عمرو بھی ساتھ ہونے لگے ان کے بیٹوں نے سمجھایا کہ آپ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اگر آپ تشریف نہ لے جائیں تو زیادہ اچھا ہے اور ہم تو آپ کی طرف سے کافی ہیں یہ کہ اللہ نے جہاد آپ پر سے ساقط کر دیا ہے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ میرے بیٹے مجھ کو آپ کے ہمراہ نکلنے سے روکتے ہیں اور بخدا میری یہ تمنا ہے کہ میں اپنے اسی معذور پاؤں سے جنت میں چلوں پھر تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو جہاد سے معاف فرما دیا ہے دوسری طرف ان کے بیٹوں سے فرمایا کہ جانے کیوں نہیں دیتے شاید شہادت اللہ تعالیٰ نصیب فرما دے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے اور شہادت پائی۔[3]

---

[1] مسلم [2] ایضاً [3] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۳۵

شداد بن ہاد کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، ایمان لایا اور آپ کے ساتھ ہو لیا اور کہا میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا۔ آپ نے ایک صحابی سے فرمایا اس کا خیال رکھنا۔ خیبر کا معرکہ پیش آیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمایا، اس میں اعرابی کا بھی حصہ لگا کر صحابہ کے سپرد فرمایا، یہ اعرابی سب کے جانور چرایا کرتا تھا، جب شام کو لوٹ کر آیا تو لوگوں نے اس کا حصہ اس کے حوالہ کر دیا۔ اس نے کہا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہارا حصہ لگایا تھا۔ اس نے لے لیا اور لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا اور کہا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تمہارا حصہ ہے، بولا میں اس لئے آپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا، میں نے تو اس لئے آپ کی اتباع اختیار کی تھی کہ اس جگہ تیر لگے اور اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا، تاکہ میں جنت جا سکوں۔ آپ نے فرمایا اگر خدا سے تیرا معاملہ سچا ہے تو خدا بھی تیری یہ آرزو پوری کر دے گا۔ جب جنگ ہوئی تو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس اعرابی کے پاس لے کر آئے تو آپ نے اس کو شہید پایا، آپ نے پوچھا کیا یہ وہی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ہاں۔ آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ سچا تھا، اللہ نے بھی اس کو سچا کر دیا۔[1]

مکمل سپردگی

یہ تمام اس ایمان سے پہلے ایک پراگندہ و غیر منظم زندگی گزار رہے تھے، نہ کسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے، نہ کسی ضابطۂ حیات کے پابند تھے، نہ کسی نظام زندگی سے منسلک تھے، وہ خواہشات کے تابع تھے، بغیر سمجھے بوجھے عمل کرتے، گمراہیوں میں بھٹکتے پھرتے، اب وہ ایمان اور بندگی کے دائرہ میں اس طرح داخل ہو گئے تھے کہ ان کے لئے اس سے باہر آنا

---

[1] زاد المعاد۔ ج ۲ ص ۱۹

مشکل ہو گئی تھی۔ انھوں نے اللہ کی شہنشاہیت اور اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا، اور
اپنے کو رعایا، بندہ، اور مطیع مطلق مان لیا تھا، مکمل طور پر اس کو اپنی قیادت حوالہ کر دی تھی،
قانونِ الٰہی کو بے چون و چرا تسلیم کر چکے تھے اور خواہشات و خودسری سے کلی طور پر دستبردار
ہو گئے تھے، وہ ایسے غلام بن گئے تھے جو نہ اپنے مال کا مالک ہے نہ اپنی جان کا، جو مالک کی
رضا اور اجازت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف بھی نہیں کر سکتا ہے، ان لوگوں کی صلح و جنگ،
دشمنی و دوستی، خوشی و ناراضگی، عطا و محرومی اور صلۂ رحمی و قطع رحمی سب اللہ کے حکم کے تابع بن چکی
تھی جو کچھ بھی کرتے اس کے حکم کے موافق کرتے، وہ لوگ جاہلیت سے خوب واقف تھے اسی میں
پلے بڑھے تھے، اسی وجہ سے اسلام کا مطلب خوب سمجھتے تھے، ان کو خوب معلوم تھا کہ اسلام نام
ہے ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف منتقل ہونے کا، ایک طرف بندوں کا راج یا معاشرہ
راج ہے، دوسری طرف خدا کی حکومت ہے کل تک خدا سے جنگ تھی اور اس کے قانون سے
کشمکش اب مکمل اطاعت و سپردگی اور دائمی صلح و آشتی ہے کل تک صرف خودی تھی اب
صرف خدا کی بندگی، جب اسلام کو اختیار کر لیا تو اب خود رائی اور خودسری کا کوئی کام نہیں، اب
حکم خداوندی سے سرتابی اور قانونِ الٰہی سے بغاوت کی کوئی گنجائش نہیں، خدا کے حکم کے بعد
اختیار باقی نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت اور اس سے حجت و بحث کا
کوئی موقع نہیں، نہ غیر اللہ کے سامنے مقدمہ جا سکتا ہے اور نہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ ہو سکتا
ہے، نہ دین کے معاملہ میں رسم و رواج کی پابندی ہو سکتی ہے، نہ نفس پرستی باقی رہ سکتی ہے۔
جب وہ اسلام لائے تو انھوں نے جاہلی زندگی کو اس کی تمام خصوصیات، عادات اور رسوم کے
ساتھ ترک کر دیا اور اسلام کو پوری خصوصیات، متعلقات اور لوازم کے ساتھ اختیار کیا، اس سے
ان کی زندگی میں بلا تاخیر مکمل انقلاب رونما ہو گیا۔

فضالہ بن عمیر بن ملوح نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا آپ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے جب فضالہ آپ کے قریب ہوئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون؟ فضالہ — انھوں نے جواب دیا ہاں فضالہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا کہ تم کیا سوچ کر آئے تھے؟ کہنے لگے کچھ نہیں! اللہ کو یاد کر رہا تھا نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہنسے پھر فرمایا اللہ سے توبہ کرو پھر اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھا اور ان کا قلب پرسکون ہو گیا، فضالہ کہا کرتے تھے آپ کا ہاتھ جیسے ہی سینہ سے اٹھا آپ مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں اللہ تعالٰے نے آپ سے زیادہ کوئی محبوب چیز پیدا ہی نہیں کی، فضالہ کہتے ہیں میں گھر لوٹا تو راستہ میں وہ عورت ملی جس سے دل لگی کیا کرتا تھا اس نے کہا آؤ باتیں کریں، میں نے کہا اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کا کوئی امکان نہیں[1]۔

صحیح معرفت

انبیاء علیہم السلام نے انسان کو اللہ تعالٰے کی ذات و صفات اور اس کے افعال کا صحیح اور یقینی علم عطا کیا تھا اس عالم کی ابتداء و انتہا اور موت کے بعد انسان کا جس سے سابقہ پڑنے والا ہے اس سب کا علم انبیاء کے ذریعہ انسانوں تک بے محنت و مشقت پہونچا تھا انبیاء علیہم السلام نے ایسے علوم میں ان کی رہنمائی کی جن کے اصول و مبادی بھی ان کو حاصل نہ تھے جن پر یہ انسان اپنی تحقیق کی عمارت قائم کر سکتا انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کے وقت اور قوت کو بچا لیا اور ما بعد الطبیعات و مسائل الٰہیات کی اس لاحاصل تلاش و تحقیق سے فرصت دی جو نہ ان کے حواس کا ہدف بن سکتے تھے نہ تجربہ تک پہنچ سکتی تھی نہ ان کے پاس اس کے بنیادی معلومات ہی موجود تھے۔

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۲۲۴

لیکن لوگوں نے اس نعمت کا شکر ادا نہ کیا، ایک بے ضرورت بھر اپنے سر لی، ان حقائق کو جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کو بے محنت حاصل ہو گئے تھے از سرِ نو تحقیق شروع کی اور ان نامعلوم خطوں میں سفر کی ابتداء کی جہاں ان کے ساتھ نہ کوئی رہبر تھا اور نہ کوئی ان کی راہوں سے باخبر، وہ اس معاملہ میں اس سیاح سے بھی زیادہ بدقسمت اور نقصان میں ثابت ہوئے جو ان معلومات و تحقیقات پر قانع نہیں جو جغرافیہ اور نقشہ جات کی شکل میں صدیوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کی از سرِ نو پیمائش کرے صحراؤں کی مسافتوں اور حدود کو اپنی اس مختصر عمر اور محدود وسائل کے ساتھ دوبارہ منضبط کرے اس آدمی کی محنت کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تھک کر رہ جائے اس کا عزم جواب دے جائے اور وہ شخص صرف چند یادداشتوں اور ناتمام اشاروں کا سرمایہ جمع کر سکے، اس سے بڑھ کر جن لوگوں نے الٰہیات کے میدان میں بصیرت اور رہنمائی کے بغیر قدم رکھا ان کو اس مہم میں سوائے متضاد، ناہموار، ادھورے معلومات، اتفاقی خیالات اور عجلت کے نظریات کے کچھ ہاتھ نہ لگا، خود راہ کھو بیٹھے اور دوسروں کی بھی منزل کھوٹی کی۔

صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) دین کے بارے میں بڑے خوش قسمت اور صاحب توفیق تھے کہ دین کے بارے میں انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و اطلاع پر پورا اعتماد کیا اور ذات و صفات کے بارہ میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی سعی لاحاصل سے محفوظ رہے، انھوں نے اپنی ذکاوت و ذہانت کو محفوظ رکھا اور اپنی جدوجہد اور کوشش اور اپنے اوقات کو پوری احتیاط کے ساتھ دین و دنیا کے مفید میدانوں میں صرف کیا، وہ دین کے ضروری حقائق کو جانتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر دوسروں کے پاس دین کے متعلقات و تفصیلات تھے تو ان کے پاس دین کا مغز اور اس کا لب لباب تھا۔

انسانی گلدستہ

اللہ و رسولؐ اور یوم آخرت پر ایمان اور کامل سپردگی نے زندگی سے پیچ و خم کو دور کر دیا اور انسانی خاندان کے ہر فرد کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ انسانی معاشرہ ایک بے خار گلدستہ بن گیا جس کا ہر پھول اور ہر پتی اس کے لئے باعث زینت تھی۔

تو پھر انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے، وہ سب ایک باپ (آدمؑ) کی اولاد تھے اور آدمؑ کی اصل مٹی سے ہے، نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فوقیت تھی، ہاں اگر کسی کو کسی پر فضیلت تھی تو محض تقوی کی بنا پر۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اے لوگو! بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کے عیب دور فرما دیا اور آباؤ اجداد پر فخر کرنے کی رسم ختم کر دی انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں نیک اور خدا سے ڈرنے والے اور وہ اللہ تعالےٰ کے یہاں شریف دوسرے بدعمل بدبخت اور اللہ تعالےٰ کے یہاں ذلیل"[۱]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "دیکھو تم کسی سے نہ بہتر ہو اور نہ بڑے ہاں اگر تقوی میں بڑھ جاؤ تو بیشک بڑے ہو"

آپ جب اپنے رب سے رات کے آخری حصے میں مناجات کرتے تھے تو فرماتے تھے۔

"میں گواہ ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں"[۲]

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کا پورا پورا استیصال کر دیا تھا اور اس کے داخلے کے تمام روزن بند کر دیئے تھے۔ فرمایا:۔

"جو عصبیت کا علمبردار ہو وہ ہم میں سے نہیں، اور جو عصبیت پر جنگ کرے وہ

---

[۱] ابن ابی حاتم [۲] ابوداؤد

ہم میں سے نہیں اور جس کی موت عصبیت پر ہو وہ بھی ہم میں سے نہیں[1]"

جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں تھے ایک مہاجر نے ایک انصاری کو کچھ کہہ دیا اور انصاری پکار اٹھا "انصاریو!" اور مہاجر پکار اٹھا "مہاجرو!" تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چھوڑو اس جتھے بندی کے نعروں کو یہ گندے ہیں[2]"

آپ نے جاہلی حمیت کو ناجائز قرار دیا اور مدد و تعاون کے اس جاہلی اصول کو بدل دیا جس پر ساری نسل چل رہی تھی کہ اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اپنے لوگوں کی باطل پر مدد کی تو وہ اس اونٹ کی مثال ہے جو کنوئیں میں گر جاتا ہے اور لوگ اس کو دم سے پکڑ پکڑ کر نکالتے ہوں[3]" عربوں کی تعصبات اور ذہنیت میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ اب ان کا ذوق اس مشہور جملہ کو ہضم نہ کر پاتا تھا جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یہ فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم" تو صحابہ کرام حیرت زدہ ہو گئے اور بے ساختہ بول اٹھے کہ یا رسول اللہ مظلوم کی مدد تو ٹھیک ہے مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے آپ نے فرمایا "اس کو ظلم سے روکو یہی اس کی مدد ہے[4]"

اسلامی معاشرے میں مختلف طبقے شیر و شکر ہو گئے تھے وہ ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے اب وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار نہیں تھے مرد عورتوں کے ذمہ دار و منتظم تھے عورتیں نیک وفا شعار اور امانت دار تھیں ان کے حقوق مردوں پر تھے اور مردوں کے حقوق ان پر تھے۔

ذمہ دار معاشرہ

ایسے معاشرے میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا اب انسانی معاشرہ

[1] ابوداؤد۔ [2] صحیح بخاری۔ [3] تفسیر ابن کثیر۔ [4] بخاری ومسلم۔

سوسائٹی ایک مجبور بے اختیار اور مفلوج و معطل جماعت نہ تھی جو نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتی ہے نہ اپنے اختیار سے، اس کی عقل و بلوغ اور اس کا اختیار تسلیم کیا جا چکا تھا، اس کا ہر فرد ایک ذمہ دار با اختیار شخص تھا جو اپنے اپنے دائرہ میں صاحب اختیار و ذمہ دار تھا، آدمی اپنے گھر کا سرپرست اور ذمہ دار ہوتا تھا عورت اپنے شوہر کے گھر کی منتظم اور ماتحتوں کے متعلق جواب دہ تھی، ملازم اپنے مالک کے مال میں ذمہ دار اور اس ذمہ داری کا جواب دہ تھا، اس طرح اسلامی معاشرہ ایک ذی ہوش اور صاحب اختیار معاشرہ تھا جو اپنے اعمال کا جواب دہ تھا۔

تمام مسلمان حق کے مددگار بن گئے تھے ان کا کام مشورہ سے ہوتا، خلیفہ جب تک خدا کا مطیع رہتا وہ اس کے مطیع ہوتے اور اگر نافرمانی کرتا تو اطاعت باقی نہ رہتی حکومت کا شعار "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" بن گیا تھا یعنی خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں وہ مال اور خزانے جو سلاطین اور رئیسوں کا لقمۂ تر اور امراء کی ذاتی جائداد سمجھے جاتے تھے اب اللہ کی امانت سمجھے جانے لگے تھے اس کی رضا میں خرچ اور صحیح محل پر صرف کئے جاتے، اور مسلمان اس دولت کے امین اور متولی تھے، خلیفہ کی مثال یتیم کے سرپرست کی سی تھی، اگر صاحب استطاعت ہوتا تو احتیاط کرتا اور اگر حاجت مند ہوتا تو بقدر ضرورت لیتا، اللہ کی وہ زمین جس کو سلاطین و امراء نے اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا جس کے لئے چاہتے وسعت دیتے تھے اور جس پر چاہتے تنگ کر دیتے تھے اور بعض اس میں کپڑے کی طرح کتر بیونت کرتے تھے اب اللہ کی زمین تھی جس کے متعلق ایک ایک بالشت کا حساب دینا تھا۔

صاحب ضمیر معاشرہ

انسانی سوسائٹی مدت سے اپنا ارادہ و اختیار اور ذوق و نشاط کھو چکی تھی، وہ

ایک گھٹی گھٹی سی سوسائٹی بن کر رہ گئی تھی وہ ایک مجبور و مقہور جماعت تھی جس کی نہ جنگ کے زمانے میں دلشکنی کی جاتی تھی نہ صلح کے موقع پر اس کی مرضی معلوم کی جاتی تھی اس سوسائٹی کے افراد کو قربانی و ایثار اور تکالیف کو جھیلنے و مشقتوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور کیا جاتا حالانکہ اس کو نہ تو اس کی خواہش ہوتی اور نہ اس سے کچھ فائدہ، نہ وہ افسروں کو پسند کرتے اور نہ افسران ان کو، وہ مجبور تھے کہ اس کی اطاعت کریں جسے وہ ناپسند کرتے ہوتے اور اپنی جان و مال کو اس پر قربان کریں جس سے وہ نفرت کرتے ہوں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں کی چنگاری بجھ گئی جذبات سرد پڑ گئے اور لوگوں کا اطمینان رہا اور فریب پیدا ہوا توہین و حقارت اور ذلت کے برداشت کی طبیعتیں عادی ہو گئیں۔

محبت کا صحیح مصرف

وہ فطری عنصر جس کے سر انسانیت کے اکثر عجوبہ روزگار اور حیرت انگیز کارناموں کا سہرا ہے جس کو لوگ "محبت" سے یاد کرتے ہیں، عرصہ سے حقیر اور مردہ تھا، صدیوں سے کوئی اس کو کام میں لگانے والا اور اس سے حقیقی فائدہ اٹھانے والا پیدا نہیں ہوا تھا، بس وہ چہک و مہک اور حسن و جمال کے فانی مظاہر کی نذر ہو کر رہ گیا تھا، عرصہ سے دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں پیدا ہوا تھا جو اپنے جمال و کمال اور اپنی اعلیٰ صفات سے ساری انسانیت کی محبت کا مستحق ہو اور اپنی طاقت و دل آویز شخصیت سے اس محبت سے کام لے سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانیت کو وہ گم شدہ دولت مل گئی، آپ وہ انسان تھے جن کو اللہ نے مجموعۂ خوبی بنایا تھا، دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ کو جو اچانک دیکھتا مرعوب ہو جاتا، اور جو آپ سے ملتا جلتا وہ فریفتہ ہو جاتا۔

آپ کا تعریف کرنے والا کہتا، آپ جیسا نہ آپ سے قبل دیکھنے میں آیا اور نہ آپ کے بعد، آپ کے آنے کے بعد حق اور پاک محبت کا چشمہ ابل پڑا۔ نفوس و قلوب اس طرح کھنچے جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے گویا کہ طبیعتیں اور دل پہلے سے آپ کے منتظر اور آپ کے لئے بیتاب تھے۔ آپ کی امت کے افراد نے آپ سے ایسی محبت اور ایسی اطاعت کی جس کی مثال بعثت نبی اور اہل محبت کی تاریخ میں سننے میں نہیں آئی۔ آپ کی اطاعت و تابعداری میں اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے، گھربار، مال و دولت لٹا دینے کے ایسے واقعات پیش آئے جو نہ آپ سے قبل پیش آئے تھے اور نہ آئندہ ان کی امید ہے۔

محبت و جاں نثاری

حضرت ابوبکرؓ کے اسلام لانے کے بعد اُن پر مکہ میں ایک روز دشمنوں نے حملہ کر دیا۔ عتبہ بن ربیعہ نے اس قدر مارا کہ آپ کا چہرہ سوج گیا حتیٰ کہ شناخت تک مشکل ہو گئی تھی، بنو تیم حضرت ابوبکر کو کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر اٹھا لے گئے۔ ان کو آپ کی موت میں ذرا شک نہ تھا۔ آپ کو دن چھپتے ہوئے ہوش آیا۔ تو سب سے پہلے بولے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟" لوگوں کو اس پر بڑا غصہ آیا کہ اس حالت میں بھی آپ اس شخص کو یاد کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ حال ہوا، وہ آپ کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ انھوں نے اُن کی ماں ام الخیر سے کہا کہ دیکھو ان کو کچھ کھلا پلا دو۔ انھوں نے کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا۔ آپ برابر کہتے رہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "بخدا مجھے تمہارے ساتھی کا کچھ علم نہیں" انھوں نے کہا تو خطاب کی بیٹی ام جمیل کے پاس جاؤ اور آپ کی خیریت دریافت کر کے مجھے بتاؤ۔" وہ ام جمیل کے پاس آئیں اور کہا کہ "ابوبکر محمد بن عبداللہ کے متعلق پوچھتے ہیں

انھوں نے کہا کہ "میں نہ ابوبکر کو پہچانتی ہوں اور نہ محمد بن عبداللہ کو، اور اگر تمہاری یہ خواہش ہو کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے بیٹے کے پاس چلوں تو ہو سکتا ہے" انھوں نے کہا "ہاں چلو" وہ ان کے ہمراہ گئیں، اور ابوبکر کو پڑا ہوا پایا۔ ام جمیل ان کے قریب پہونچیں تو ان کا حال دیکھ کر کہا "واللہ جس قوم نے تمہارے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے وہ فاسق و کفار ہیں، اور مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے تمہارا انتقام لے گا" انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ وہ بولیں کہ تمہاری ماں سنتی ہیں، انھوں نے کہا ان سے کچھ پردہ نہیں، انھوں نے جواب دیا، بخیر و عافیت ہیں، آپ نے فرمایا کہاں ہیں؟ وہ بولیں "دار ابن ارقم میں" آپ نے فرمایا میں بخدا میں کھانا پانی نہیں چکھ سکتا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچ جاؤں" وہ دونوں ٹھہری رہیں، جب رات ہوئی اور آمد و رفت موقوف ہوئی تو وہ ان کو لے کر نکلیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچا دیا، آپ نے حضور کو دیکھ لیا تو جان میں جان آئی اور کھانا پیا۔[1]

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر اُحد کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور شہید ہو گئے تھے، قیام گاہ سے نکلی اور پوچھنے لگی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا "بحمد اللہ عافیت سے ہیں جیسا تم چاہتی ہو" اس نے کہا "مجھے دکھاؤ میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں" اس نے جب آپ کو دیکھ لیا تو بولی "اگر آپ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔"[2]

حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا، اب کہنے لگے کہ "کیا پسند ہے کہ محمد تمہاری جگہ ہوں؟" انھوں نے کہا "خدائے تعالیٰ کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ کے

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۰ [2] ابن اسحاق و بیہقی۔

پیروں کا نشان چھپے اور میں چھوڑ دیا جاؤں، وہ سب بخش دیئے۔[1]

زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ اُحد کے روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے سعد بن ربیع کی تلاش میں بھیجا اور مجھ سے فرمایا ان کو اگر دیکھو تو میرا سلام کہو اور کہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اپنے کو کیسا پاتے ہو کہتے ہیں کہ میں مقتولین میں چکر لگانے لگا پھر ان کے پاس پہونچا اور ان کا آخری وقت تھا اور ان کے جسم پر تیر و تلوار اور نیزے کے ستر زخم تھے میں نے ان سے کہا اے سعد! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم کو سلام کہتے ہیں اور دریافت فرماتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام کہو اور آپ سے کہہ دو یا رسول اللہ جنت کی خوشبو پا رہا ہوں اور میری قوم انصار سے کہہ دو کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کچھ ہوگیا اس حال میں کہ تم میں ایک آنکھ بھی حرکت کرسکتی ہو تو اللہ کے یہاں تمہارا کوئی عذر نہیں، اور اسی وقت روح پرواز کرگئی۔[2]

اُحد کے روز ابو دجانہ نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنا دیا تھا تیر اس پر لگتے تھے اور وہ حرکت نہ کرتے تھے، مالک بن سنان خدری نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زخم چوس کر صاف کر دیا تھا ان سے آپ نے فرمایا تھوک دو انھوں نے کہا: بخدا! میں کبھی بھی نہ تھوکوں گا۔[3]

ابو سفیان جب مدینہ آئے اور اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس پہونچے اور جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے اس کو لپیٹ دیا، انھوں نے کہا اے بیٹی! مجھے خبر نہیں کہ تم نے بستر میرے لائق نہ سمجھا یا مجھ کو اس کے لائق نہ سمجھا! انھوں نے کہا نہیں! بلکہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے، اور تم مشرک نجس ہو۔[4]

عروہ بن مسعود ثقفی نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا اے لوگو! بخدا

۱؎ البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص [illegible] ۲؎ زاد المعاد ج ۲ ص [illegible] ۳؎ ایضاً ص [illegible] ۴؎ ایضاً ص [illegible]
۵؎ سیرۃ ابن ہشام۔

میں سلاطین کے یہاں گیا، کسریٰ، قیصر اور نجاشی کے دربار بھی دیکھے خدا کی قسم میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی، خدا کی قسم جب بھی وہ تھوکتے ہیں ان میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گرتا ہے وہ اسے اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے اور جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے جھگڑتے رہ جاتے ہیں اور جب بات کرتے ہیں تو وہ لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں اور وہ لوگ فرط ادب سے آپ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔[1]

اطاعت و تابعداری

اطاعت و تابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے جب صحابہ کرام محبت کی دولت سے مالا مال ہوئے تو انھوں نے اپنی ساری طاقت آپ کی اطاعت میں صرف کر دی اس کی بہترین مثال حضرت سعد کا وہ قول ہے جو انھوں نے اپنی اور جماعت انصار کی جانب سے بدر سے قبل کہا:۔

میں انصار کی طرف سے شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں اور ان کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں جس کا تعلق چاہیں قائم رکھیں جس کا چاہیں توڑ دیں اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں، جو کچھ کہ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے بخدا اگر آپ برک غماد تک چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں گھوڑا ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۱۶۹

ان کی اطاعت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تین شخصوں سے گفتگو ممنوع قرار دی تھی جو غزوۂ تبوک نہ جا سکے تھے تو لوگوں نے آپ کی بات مانی اور مدینہ ان تینوں کے لیے شہر خموشاں بن گیا جہاں کوئی بات کرنے والا اور بات کا جواب دینے والا نہ تھا۔ کعب کہتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم تینوں سے گفتگو منع فرما دی تھی لوگ ہم سے کترانے لگے اور ان کی نگاہیں بدل گئیں حتیٰ کہ مجھے زمین تنگ محسوس ہونے لگی گویا وہ زمین ہی نہ تھی جس کو میں جانتا تھا یہاں تک کہ جب لوگوں کی میرے ساتھ بے رخی بہت بڑھ گئی میں چلا اور ابو قتادہ کی دیوار پھاند کر ان کے باغ میں گھس گیا، ابو قتادہ وہی ہیں جو میرے محبوب چچازاد بھائی تھے اور میرے سب سے زیادہ چہیتے تھے میں نے ان کو سلام کیا بخدا انھوں نے مجھے جواب بھی نہ دیا تو میں نے ان سے کہا اے ابو قتادہ میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ میں اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہوں؟ وہ خاموش رہے میں نے پھر دہرایا ان کو واسطہ دیا اور وہ خاموش رہے میں نے تیسری بار ان کو واسطہ دیا تو وہ بولے کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے میری آنکھیں بھر آئیں اور میں پلٹ پڑا اور دیوار پھاند کر باہر نکل آیا۔"[1]

ان کی اطاعت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ ناراضگی و بے رخی کے عالم میں تھے کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا قاصد آتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ رہو، وہ بولے طلاق دیدوں یا کیا کروں؟ وہ بولا، نہیں بلکہ الگ رہو ان کے قریب مت جاؤ۔ تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ ان ہی کے

---

[1] بخاری و مسلم

پاس رہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ میں کچھ فیصلہ کر دے۔

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے ان کی محبت و تعلق کا یہ حال تھا کہ ہر ایک پر آپ کو ترجیح دیتے تھے یہیں اس مقاطعہ کے زمانہ میں غسان کا بادشاہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دربار کی پیشکش کرتا ہے اس بے رخی اور عتاب کے زمانے میں جو یقیناً سخت آزمائش تھی لیکن وہ رد کر دیتے ہیں کہتے کہ میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ ان شامی قبطیوں میں سے جو مدینہ میں غلہ فروخت کرنے آتے تھے ایک نبطی کہتا ہے کہ کعب کا کوئی پتہ بتا دے یہ سن کر لوگ میری جانب اشارہ کرنے لگے اس نے میرے پاس پہونچ کر شاہ غسان کا ایک خط حوالے کیا میں پڑھا لکھا تھا، میں نے اس کو پڑھا اس میں تحریر تھا کہ:۔

"ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا نے تم سے بے رخی اختیار کر لی ہے اللہ تعالیٰ نے تم کو ذلت کے لئے نہیں رکھا اور وہ تم کو ضائع کرنا نہیں چاہتا ہے بس تم ہم سے مل جاؤ ہم تمہارا بہت خیال کریں گے۔"

میں نے جب پڑھا تو کہا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے اور میں نے جا کر اسے تنور کی نذر کر دیا۔

اطاعت اور فوری تعمیل حکم کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو شراب کی حرمت کے حکم کے وقت پیش آیا حضرت ابو بریدہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اٹھا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا ادھر شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ	اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا
وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ	اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ	باتیں ہیں شیطان کا کام ہیں ان سے بالکل

۱؎ بخاری و مسلم   ۲؎ ایضاً

تُفْلِحُوْنَ۝ إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ (المائدہ ۵: ۹۱)

لگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض ڈال دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے سو اب بھی باز آؤ گے۔

میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور میں نے یہ آیت ﴿فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (کیا تم رک جاؤ گے) تک پڑھ کر سنادی۔ کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاتھوں میں ساغر تھا کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا جو شراب ہونٹوں میں پہنچ گئی تھی وہ فوراً تھوک دی گئی۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اپنے نفس پر گھر والوں اور خاندان والوں پر آپ کو ترجیح دینے کی عجیب و غریب شان یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبی کے بیٹے عبداللہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور فرمایا "دیکھتے ہو تمہارے والد کیا کہتے ہیں؟" وہ بولے یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان وہ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "کہتے ہیں کہ اگر مدینہ واپس ہوئے تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دیگا" وہ بولے خدا کی قسم یا رسول اللہ! انھوں نے سچ کہا بخدا آپ معزز ہیں اور وہ ذلیل ہیں یا رسول اللہ آپ مدینہ تشریف لائے اور اہل یثرب کو علم ہے کہ وہاں مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں اگر اللہ و رسول کی مرضی یہ ہے کہ میں ان کا سر لے آؤں تو میں حاضر ہوں۔ رسول اللہ نے فرمایا "نہیں"!

جب لوگ مدینہ پہونچے تو عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی مدینہ کے دروازے پر تلوار لے کر اپنے باپ کے انتظار میں کھڑے ہوگئے جب ان کے والد آئے تو بولے۔

"تم ہی کہتے تھے کہ اگر مدینہ واپس ہوئے تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا؟ تم کو ابھی معلوم

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۷

ہو جائے گا کہ معزز کون ہے! خدا کی قسم! تم مدینہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

اس نے کہا:۔

"اے خزرج کے لوگو! دیکھو میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے! اے خزرج کے لوگو! میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے۔"

وہ بولے:۔

"خدا کی قسم! یہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

لوگ اکٹھا ہو گئے اور ان کو سمجھایا، انھوں نے کہا:۔

"یہ اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔"

لوگ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور آپ کو خبر دی، آپ نے فرمایا:۔

"جاؤ اور عبداللہ سے کہو روک کر آنے دو۔"

لوگ واپس آئے، انھوں نے کہا:۔

"ہاں! اب جب کہ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اجازت آگئی ہے، وہ مدینہ میں داخل ہو سکتا ہے۔"[1]

نئے افراد اور نئی امت

اس وسیع و عمیق ایمان، اس محکم پیغمبرانہ تعلیم، اس دقیق و گہرا تربیت، اس عجیب و غریب جاذب شخصیت اور اس معجز العقول آسمانی کتاب کے ساتھ زمین کے عجائب و غرائب ختم ہو گئے کر

---

[1] تفسیر طبری۔ ج ۲۸

نہیں آتے اور جن کی زندگی میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ رسول اکرم ﷺ نے جاں بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی شکل میں پڑے پڑے ضائع ہو رہے تھے جن کی افادیت اور مصرف کا کسی کو خبر نہ تھی اور جن کو جہالت، کفر اور ظلم پرستی نے بیکار کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا، اس میں خدا کی مدد سے ایمان و عقیدہ پیدا فرما دیا، زندگی کی نئی روح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں ابھار دیں اور اندرونی استعدادیں اجاگر کر دیں، پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا کہ اسی کے لئے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی، وہ بے جان پتھر تھا اب وہ ایک چلتا پھرتا انسان بن گیا، وہ بے حس و حرکت مردہ تھا اب وہ زندہ ہو کر دنیا پر حکومت کرنے لگا، پہلے نابینا تھا جس کو خود رستہ کا پتہ نہ تھا اب ساری دنیا کا رہبر و رہنما بن گیا۔

أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا	بھلا وہ جو مردہ ہو پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور
لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ	اس کو ایک نور عنایت کیا جس کے ذریعہ وہ
فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا	لوگوں میں چلتا پھرتا ہو اس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرا
(الانعام - ۱۲۲)	میں گھرا ہو نکل نہ سکتا ہو۔

آپ کی توجہ و تعلیم سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب ہوا کہ دنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو بجا طور پر نادر روزگار اور دنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ وہ عمر جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے باپ ان کو جھڑکا کرتے تھے اور جو کہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں سے تھے جن کو کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل نہ تھا، ان کے معاصران کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے، دفعۃً اس طرح ابھرتے ہیں کہ تمام عالم کو اپنی عظمت و جلال سے حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور قیصر و کسریٰ کو تخت و تاج سے محروم کر دیتے ہیں اور ایسی اسلامی سلطنت کی

بنا ڈالے ہیں جو بیک وقت ان دونوں حکومتوں پر بھاری ہے اور تدبیر و حسن انتظام میں ان سے فوقیت رکھتی ہے ورع و تقویٰ اور عدل کو چھوڑ دیجئے کہ ان میں تو وہ ضرب المثل ہیں۔

یہ ولید کے فرزند خالد ہیں قریش کے نوجوان حوصلہ مندوں میں سے ایک شخص تھے متعدد جنگوں میں انھوں نے نام پیدا کیا تھا، قریش کے سردار قبائلی جنگوں میں ان سے مدد لیتے تھے، انھوں نے جزیرۃ العرب کے علاقوں میں کوئی بڑی شہرت بھی حاصل نہیں کی تھی اچانک وہ اسلامی تلوار (سیف من سیوف اللہ) بن کر چمکتے ہیں جو چیز سامنے آتی ہے کٹ جاتی ہے یہ خدائی تلوار روم پر چلتی ہے کڑکتی ہے اور تاریخ کے طول و عرض میں اپنے تذکرے چھوڑ جاتی ہے۔

یہ ابو عبیدہ ہیں جن کی امانت اور نرمی کی تعریف کی جاتی تھی وہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کی قیادت کیا کرتے تھے، ان کو دیکھئے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی قیادت کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں اور ہرقل کو شام کے ہرے بھرے ملک سے ہمیشہ کے لئے نکال دیتے ہیں، غریب اس پر داعی نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے الوداع اے ملک شام تجھ کو آخری سلام ایسا سلام جس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

یہ عمرو بن العاص ہیں جن کا شمار قریش کے سمجھدار لوگوں میں تھا، قریش ان کو حبشہ کا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تا کہ مسلمان مہاجرین کو واپس لے آئیں مگر ناکام واپس ہوتے ہیں، ان کو دیکھئے مصر فتح کرتے ہیں اور زبردست اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔

اور یہ سعد بن ابی وقاص ہیں اسلام سے قبل ان کے متعلق نہ کسی بڑی فوجی قیادت کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی ماہر جنگ کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے ان کو دیکھئے مدائن کی کنجیاں سنبھالتے ہیں اور عراق و ایران کو اسلامی سلطنت میں شامل کر کے ہمیشہ کے لئے قدم جماتے ہیں۔

یہ سلمان فارسی ہیں ایک مذہبی پیشوا کے بیٹے تھے فارس کا ایک گاؤں وطن تھا، بالآخر غلامی

دوسری غلامی اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت دیکھتے ہوئے مدینہ پہونچتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں ان کو دیکھئے! اپنی ہی قوم کے عظیم الشان دار السلطنت (مدائن) کے حاکم بن کر پہونچتے ہیں کل جہاں کی رعیت کے ایک فرد تھے آج اس ملک کے حکمراں ہیں اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سے ان کے زہد و سادگی میں فرق نہیں پڑتا لوگ ان کو اس حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک جھونپڑی میں قیام ہے سر پہ بوجھ ڈھوتے ہیں۔

یہ بلال حبشی ہیں فضیلت و عزت میں اس درجہ کو پہونچتے ہیں کہ امیر المومنین ان کو اپنا سردار کہتے ہیں یہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں جن میں حضرت عمرؓ کو خلافت کی صلاحیت نظر آتی ہے فرماتے ہیں: اگر حیات ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا!

یہ زید بن حارثہ ہیں جنگ موتہ کے مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کرتے ہیں اور اسی لشکر میں جعفر بن ابی طالب خالد بن ولید جیسے ممتاز لوگ بھی موجود ہیں اور ان کے بیٹے اسامہ اس لشکر کی قیادت کرتے ہیں جس میں ابو بکرؓ عمرؓ جیسے افراد موجود تھے۔

یہ ابو ذرؓ مقدادؓ ابو الدرداءؓ عمار بن یاسرؓ معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعبؓ ہیں اسلام کی باد بہاری کا ایک جھونکا چل جاتا ہے اور وہ دنیا کے نامور زاہدوں اور جلیل القدر عالموں میں دیکھتے دیکھتے شمار ہونے لگتے ہیں۔

یہ علی بن ابی طالبؓ اور عائشہؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ ہیں جو نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گود میں پل کر دنیا کے عظیم ترین عالموں میں شمار ہونے لگے جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں اور حکمت ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے عقل کے سچے علم کے گہرے اور تکلف سے دور بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے خطاب کرتے ہیں تو دنیا کے مؤرخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔

متوازن انسانی مجموعہ

پھر تھوڑا عرصہ بھی نہیں گزرتا کہ متمدن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ خام اشیاء جو بکھری پڑی تھیں جن کی معاصر قوموں نے بھی ذرا قدر نہ کی تھی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اڑایا تھا، اس سے یکایک مجموعہ تیار ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن و مکمل مجموعہ کمالات نہیں دیکھا، جیسے ایک بادل کہ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا سرا کدھر ہے یا باران رحمت کی طرح کسی کا پتہ نہ چل سکے کہ اس کا پہلا چھینٹا مبارک ہے یا دوسرا، ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے، دین و دنیا کی ہر ضرورت کے لئے اس کے پاس سامان موجود ہے اس لئے اس کو کسی سے مدد کی ضرورت نہیں لیکن دنیا اس کی مدد کی محتاج ہے۔

اس نوزائیدہ جماعت نے اپنی تربیت کی خود بنیاد ڈالی، اس حکومت کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے مگر اس کو اس سے پہلے اس کا کوئی تجربہ نہ تھا اس کے باوجود اس کو ذرا ضرورت نہ پڑی کہ کسی دوسری قوم سے کوئی آدمی مستعار لے یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے، ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا سکہ تو دو بڑے بڑے عظیم ملکوں کے وسیع رقبہ میں چلتا تھا اس کے ہر شعبہ اور ضرورت کے لئے متعدد آدمی ایسے تھے جو اپنی لیاقت کارکردگی، امانت و دیانت، قوت اور احساس ذمہ داری میں بے نظیر تھے، یہ عظیم سلطنت قائم ہوئی تو اس نوزائیدہ قوم نے جس پر تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اس کو اپنے آدمی فراہم کئے جن میں کوئی عادل حاکم تھا، کوئی امانت دار خازن، کوئی منصف قاضی تھا اور کوئی عبادت گزار قائد، کوئی پرہیزگار اور متقی فوجی تھا، اسی ذہنی تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی تھی اس اسلامی حکومت کو اعلیٰ ترین عہدہ دار، فرض شناس و مستعد کارکن ملتے رہے، حکومت کی ذمہ داری

ان ہی اشخاص کے سپرد ہوتی جو ہدایت کو تحصیل وصول کے جذبہ پر ترجیح دیتے جو اپنے کو بیچ کے
تحصیلداروں کے منشی و ہاری سمجھتے جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح اور دین و دنیا کا صحیح
امتزاج ہوتا ان کے اثر سے اسلامی تہذیب اپنی پوری خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی
اور دین کے برکات اس طرح وجود میں آئے کہ پھر کسی دور میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

حقیقت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر
رکھ دی تھی بس وہ کھل گیا اور اس کے تمام خزانے عجائبات طاقتیں اور کمالات دنیا کے
سامنے آگئے۔ آپ نے جاہلیت کی شہ رگ کاٹ دی اور اس کے طلسم کو پاش پاش کر دیا
آپ نے سرکش اور منحرف دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کر دیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ
پر گامزن ہو اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرے۔ یہ وہ اسلامی
دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا۔

باب سوم

مسلمانوں کا دورِ قیادت

مسلمانوں کی قائدانہ خصوصیات

مسلمان میدان میں آئے اور دنیا کی رہنمائی کی باگ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہو گئی تھیں اور جس کا انہوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا۔ مسلمانوں نے دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لے کر متوازن اور صحیح رفتار کے ساتھ صحیح منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ان میں وہ تمام صفات جمع تھیں جو ان کو قوموں کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح و سعادت کی ضمانت کرتی تھیں۔ یہ امتیازی صفات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ ان کے پاس آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت تھی، اس لئے ان کو قیاس اور اپنی طرف سے قانون سازی کی ضرورت نہیں تھی، اور اس طرح وہ جہالت و نادانی، انانیت اور روز روز کے قانونی ردوبدل اور ترمیم، ہولناک غلطیوں اور مظالم سے محفوظ تھے۔ وہ اپنے بیانات و معاملات میں اندھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور نہ تھے۔ ان کے پاس وحی اور شریعت الٰہی کی روشنی تھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے، اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور اس کے موڑ ان کے لئے روشن تھے، ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا اور منزل مقصود ان کو صاف نظر آتی تھی۔

أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۔ (سورۃ الانعام ۔ ١٢٣)

کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس میں
جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی
جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کیا
وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ
اندھیروں میں گھرا پڑا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا

ان کے پاس الٰہی قانون تھا جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے وہ حق وانصاف کے علمبردار بنائے گئے تھے اور ان کو سخت سے سخت اشتعال و برہمی اور عداوت و بیزاری کی حالت میں بھی انصاف اور صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے اور نفس کا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (المائدہ ۔ ٨)

مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ
گواہی دینے کو آمادہ رہا کرو کسی قوم کی دشمنی
کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو
عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے
تقویٰ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ
کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

٣۔ وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر [illegible] اخلاقی تربیت اور مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے انہوں نے دنیا کی عام حکمراں قوموں اور اہل حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب و نقائص کے ساتھ پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی ان کی اصلاح اور تربیت کرتی رہی تھی اور سالہا سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے آپ نے ان کا تزکیہ فرمایا ہے ان کی مکمل تربیت فرمائی تھی زہد و ورع کی زندگی کا عادی بنایا، عفت و امانت، ایثار و قربانی، خوف خدا کا اُن کو خوگر کیا، حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دل سے بالکل نکال دی، آپ کا ارشاد تھا کہ بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہو۔[1] ترفع، ذاتی سربلندی اور امتیاز کا شوق اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے، اُن کے کانوں میں رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ گونجتے رہتے تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ	یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا	جو دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور
فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝	فساد کے خواہاں نہیں اور انجام بخیر
(القصص - ۸۳)	پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

اس لئے وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہیں گرتے تھے بلکہ وہ اس کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور اُن کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے، اُن میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا، اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائے کہ وہ اپنا نام حکومت کے لئے پیش کریں یا اپنے منہ سے تعریف کریں اور اپنی ذات کے لئے پروپیگنڈا کریں پھر جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمۂ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے وہ یہ آیت ہمیشہ پیش نظر رکھتے۔

---

[1] روایت بخاری و مسلم۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء — ۵۸)

مسلمانو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کو پہنچا دو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے۔

نیز یہ ارشاد :۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ (الانعام — ۱۶۵)

اور اسی نے تم کو زمین میں نائب کیا ہے اور تم میں ایک کے ایک پر درجے بلند کئے تاکہ جو نعمتیں تم کو دی گئی ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرے بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۔ وہ کسی قوم کے خدمت گزار اور کسی نسل و وطن کے نمائندے نہ تھے جن کے پیش نظر محض اس کی خوشحالی اور ترقی ہو اور جو اس کی برتری اور تمام اقوام و اوطان پر اس کی سیادت کے قائل ہوں اور عقیدہ رکھتے ہوں کہ ان کی قوم تنہا حکومت کرنے کے لئے اور باقی تمام قومیں اس کی محکوم بننے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، وہ عرب سے اس لئے نہیں نکلے تھے کہ دنیا میں عربی شہنشاہی کی بنیاد ڈالیں اور اس کے زیر سایہ راحت و عیش کی زندگی گزاریں اور اس کے زیر حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں نہ اس لئے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کر لیں، وہ صرف اس لئے نکلے تھے کہ وہ بندگانِ خدا کو اپنے جیسے تمام بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بندگی میں داخل کریں، مسلمانوں کے سفیر ربعی بن عامرؓ نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اسی حقیقت کا اعلان کیا انھوں نے کہا "اللہ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو

بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک خدا کی بندگی کی طرف دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل و انصاف میں لائیں۔[1] دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان ان کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے اگر فرق تھا تو محض دین کا۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر ان کا پورا عمل تھا۔

الناس كلهم من آدم وآدم من تراب لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي إلا بالتقوى۔[2]	انسانوں کی ابتدا آدم سے ہے اور آدم کی خلقت مٹی سے۔ نہ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر فضیلت ہے نہ کسی غیر عرب کو عرب پر سوائے تقویٰ کے۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۔ ۱۳)	اے آدمیو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے بنایا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے رکھے تاکہ آپس کی پہچان ہو۔ اللہ کے یہاں جس کی عزت زیادہ ہے جو خدا ترسی اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔

حاکم مصر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک مصری کو ایک موقع پر کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو ان سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمرو بن العاص سے کہا تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے۔"[3]

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین، علم و تہذیب کی نشر و اشاعت میں بھی کسی تنگ دلی سے کام نہیں لیا اور حکومت و اعزاز کے بارے میں بھی وطنیت اور رنگ و نسب کا لحاظ نہیں کیا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر۔ [2] خطبہ حجۃ الوداع۔ [3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ عمر بن الخطاب ابن جوزی ص

وہ ایک ابرِ کرم تھے جو تمام عالم پر چھا گیا تھا اور اس کا فیض سب کے لئے عام تھا، جو سارے عالم کو سیراب کر گیا اور زمین کے ہر حصے نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔[1]

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

ان لوگوں کے زیر سایہ اور زیر حکومت دنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلاف رنگ و نسل دین، علم، تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصہ لینے اور عربوں کے ساتھ دنیا کی تعمیر نو میں شریک ہونے کا پورا موقع ملا، چنانچہ ان کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے اور ان میں ایسے ائمہ، فقہا اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سر کا تاج اور مسلمانوں کا سرمایۂ فخر ہیں۔ ابن خلدون کے الفاظ میں "یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ ملت اسلامیہ کے حاملین علم میں باستثناء چند، اکثر عجمی ہیں، کیا علوم شرعیہ میں اور کیا علوم عقلیہ میں، اور اگر ان میں سے کوئی عربی النسب ہے تو وہ اپنی زبان، تربیت اور اساتذہ کے اعتبار سے عجمی ہے، باوجود اس کے کہ

---

[1] حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے جس ہدایت و علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی زمین پر ایک بڑی بارش ہو، اس کا ایک ٹکڑا نرم اور اچھا تھا اس نے پانی کو قبول کر لیا اور بڑا سبزہ اور ہری گھاس پیدا ہوئی، کچھ حصے سنگلاخ اور سخت تھے انھوں نے پانی کو روک لیا اور لوگوں کو اس سے نفع اٹھایا، پیا اور پلایا اور ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ بالکل چٹیل میدان، نہ پانی کو روک سکتا ہے اور نہ اس میں سبزہ اگ سکتا ہے، یہ مثال ان کی ہے جنھوں نے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ نے جس چیز کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس سے ان کو نفع پہنچا، انھوں نے سیکھا اور سکھایا اور آخری مثال اس کی ہے جس نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ میں کیا لایا اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جو مجھے دے کر اس نے بھیجا۔ (صحیح بخاری کتاب العلم)

دین عربی ہے اور اس کی شریعت لے کر جو پیغمبر آئے وہ بھی عرب ہی سے تعلق رکھتے تھے[1] بعد کی صدیوں میں بھی غیر عرب مسلمانوں میں ایسے قائد، حکمراں، وزراء، فقہاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے جو زمین کی زینت اور انسانیت کا گل سرسبد اور اپنی فضیلت، شرافت نفس، جوہر قابلیت اور دینداری اور علم میں نادر روزگار تھے اور ان کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ خود عرب کے سوا ان کا کوئی صحیح شمار نہیں کر سکتا۔

۴۔ انسان مجموعہ ہے جسم و روح، قلب و عقل و جوارح کا، انسان حقیقی سعادت اور فلاح اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں متناسب طور پر اس کے مرتبہ کے شایان شان نشوونما اور پرورش نہ پائیں، دنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا دینی، اخلاقی، عقلی، مادی ماحول نہ قائم ہو جائے جس میں انسان کے لئے بسہولت تمام اپنے کمال انسانی کو پہنچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہانبانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو روحانیت و مادیت دونوں کے قائل، دینی و اخلاقی زندگی کا نمونہ، کامل، عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں۔ اگر ان کے عقیدہ یا تربیت میں ذرا سا بھی رخنہ یا نقص ہوگا تو وہ ان کے قائم کردہ تمدن میں بہت پھیل جائے گا اور مختلف مظاہر اور صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ اگر کوئی ایسی جماعت غالب آ گئی جو صرف مادیت کی پرستار مادی لذتوں اور محسوس منفعتوں کی قائل اور معتقد ہے وہ اس زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی پر اعتقاد نہیں رکھتی اور جو اس کے ماورا کسی اور حقیقت پر اس کا یقین نہیں تو اس کے مزاج اس کے اصول اور رجحانات کا اثر تمدن کی شکل و ساخت پر پڑنا ناگزیر ہے اور وہ تمدن انہی کے مخصوص سانچہ میں ڈھل کر رہے گا اور اس پر اس کی چھاپ ہمیشہ باقی رہے گی، اس کا نتیجہ ہوگا کہ انسانیت

[1] مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۴۹۹

بہت سے خطے تو بھر جائیں گے اور بہت سے خطے خالی رہ جائیں گے اس تمدن کی نمود صرف اینٹ پتھروں کاغذ کپڑے اور لوہے اور سیسے میں ہوگی اسٹیج کے میدان عدالتیں لہو ولعب کا مرکز اور عیش و عشرت کے حلقے اس کے مرکز ہوں گے اور وہاں وہ اپنی پوری بہار اور شباب پر ہوگا باقی دل اور روح اور لوگوں کے اخلاق خانگی زندگی اور معاشرت تعلقات باہمی اور معاملات اس کے حلقۂ اثر سے خارج ہوں گے اور وہاں انسان حیوانات سے ممتاز نہ ہوگا تمدن کی کیفیت اس جسم کی سی ہوگی جس پر یا تو طبعی فربہی طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ظاہری نگاہ میں بڑا شاندار اور پرشکوہ معلوم ہوتا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ بیسیوں امراض اور تکالیف میں مبتلا ہوتا ہے اس کا قلب ضعیف اور ماؤف ہوتا ہے اور اس کی صحت نقطۂ اعتدال سے گر چکی ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر ایسی جماعت غالب آجائے جو سرے سے مادیت کی منکر یا اس کی طرف سے بے پرواہ اور صرف روحانیت اور مابعد الطبیعی حقائق کی قائل ہو اور اس کا رویہ زندگی کے بارے میں مخالفانہ اور معاندانہ ہو تو تمدن کا شاداب پھول کملا جائے گا انسانی قوتیں اور فطری صلاحیتیں ٹھٹھر جائیں گی اس قیادت کے اثر سے لوگ صحراؤں اور غاروں کی زندگی کو شہری زندگی اور تجرد کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں خود آزاری اور جسمانی تعذیب مستحسن ہو جاتی ہے تاکہ جسم کا تسلط کمزور پڑ جائے اور روح پاک بے آمیز ہو جائے لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں تاکہ مادیت کے پرشور اور پرتلاطم اقلیم سے نکل کر روحانیت کی پرسکون اور پرامن اقلیم میں پہونچ جائیں اور وہاں اپنی تکمیل کے مدارج حاصل کریں اس لئے کہ ان کے عقیدہ میں اس عالم مادی میں انسان کی تکمیل ممکن نہیں اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن پر عالم نزع طاری ہو جاتا ہے شہر ویران ہونے لگتے ہیں اور زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے چونکہ یہ اصول و معتقدات فطرت انسانی سے برسر جنگ ہیں اس لئے فطرت ان کے خلاف رہ رہ کر بغاوت کرتی ہے اور اس کا انتقام

ایسی حیوانی مادیت سے بنتی ہے جس میں روحانیت و اخلاق کے ساتھ کوئی رواداری نہیں برتی جاتی۔ اس انقلاب میں انسانیت کی جگہ ایک چوپایانہ زندگی یا درندگی! مسخ شدہ انسانیت بہ مجبور ہو جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس روحانی جماعت پر کوئی طاقت ور مادی جماعت حملہ آور ہوتی ہے اور پہلی جماعت اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو کر حملہ آور جماعت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ یا روحانی جماعت خود امور دنیاوی کے انصرام میں مشکلات محسوس کر کے مادیت اور اہل مادیت کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور نظام سیاسی امور ان کو سپرد کر کے خود عبادات اور مذہبی رسوم پر قانع ہو جاتی ہے اور دین و سیاست کی تفریق وجود میں آتی ہے۔ روحانیت و اخلاق روز بروز بے اثر اور عملی زندگی سے بے دخل ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ انسانی سوسائٹی ان کی گرفت سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے۔ زندگی تمام تر مادہ پرستانہ بن کر رہ جاتی ہے اور دین و اخلاق صرف ایک سایہ سا بن کر یا ایک علمی نظریہ کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں۔ دنیا کی کمزور جماعتیں جنھوں نے بنی نوع انسان کی قیادت و رہنمائی کی ہے، یا تو محض خیالی تھیں یا وہ مادہ پرست تھیں یا رہبانی۔ اس لئے انسانی تمدن اپنے اکثر عہد میں حیوانی مادیت اور رہبانی روحانیت کے درمیان جھولا جھولتا رہا اور انسانوں کی کشتی حیات ان دو انتہائی سروں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی۔ کبھی مادیت کا غلبہ ہو گیا اور کبھی روحانیت کا اعتدال و جامعیت بہت کم اس کو نصیب ہوئی۔

صحابہ کرامؓ کا امتیاز

صحابہ کرامؓ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دین و اخلاق اور قوت و سیاست کے مکمل پیکر تھے، اور ان کی منتشر صفات ان میں بیک وقت جمع تھیں۔ ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں، شعبوں

اور عوام کے ساتھ مخصوص تھی اس اخلاقی اور اعلیٰ روحانی تربیت اس عجیب و غریب اعتدال (جو انسانی زندگی میں کمتر دیکھنے میں آتا ہے) اس غیر معمولی جامعیت جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے اور پھر مکمل مادی تیاری اور صحیح عقل کی بنا پر ان کے لئے ممکن تھا کہ وہ انسانی گروہ کو ان کے اعلیٰ روحانی و اخلاقی و مادی مقصد و کمال تک پہونچا سکیں چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافت راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دور کا علم نہیں، اس دور میں روحانی و اخلاقی، دینی و علمی و روحانی وسائل و سامان انسانِ کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے اس حکومت میں جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا اور ایسی سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظام حکومت کے لئے میزان کا درجہ رکھتی تھیں، تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب اور ترغیبات کے باوجود جرائم و بد اخلاقیوں کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقہ پر بہتر تھا یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکا اور اس سے زیادہ مبارک و خوشگوار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکا۔

یہ نتیجہ تھا محض ان لوگوں کی سیرت کا جو حکومت کا کاروبار چلاتے تھے اور تمدن کے نگران تھے اور ان کے عقیدہ، تربیت، طرز حکومت اور اصول سیاست کا، اس لئے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا معمولی کارکنوں کی، پولیس کی حیثیت میں ہوتے یا فوج کی ہیئت میں، خدا ترس، امین، دیانت دار، امانت شعار، دیندار، ترس اور منکسر مزاج پائے جاتے

ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے اور دن کو روزہ دار، عہد وفا کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں۔"[1]

دوسرے کے الفاظ ہیں "وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گزار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں بھی وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کر کے داخل ہوتے ہیں اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں۔"[2]

ایک تیسرے شخص نے ان الفاظ میں تعریف کی "رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں، اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے گویا ان کا کام ہی بس تیر اندازی اور نیزہ بازی ہے، خدا کی یاد میں اس طرح مشغول و تر زبان کہ ان کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے۔"[3]

اسی اخلاقی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدائن کی فتح میں کسریٰ کا مرصع تاج اور اس کا فرش بیش بہا جو لاکھوں اشرفیوں کی مالیت کا تھا فوج کے ہاتھ لگتا ہے لیکن سپاہی کمال ایمانداری سے ذرا بھی تصرف کیے بغیر وہ قائد کے حوالہ کر دیتے ہیں اور قائد حضرت عمرؓ کو بھیج دیتے ہیں، وہ تعجب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو حوالہ کر دیا اور حفاظت کے ساتھ پہنچایا ان کی امانت واقعی قابلِ تعریف ہے۔[4]

دنیا اور دنیا کی زندگی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر و طرزِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کی پہلی جماعت ایسی تھی کہ اس کے سامنے

---

[1] روایت احمد بن مروان المالکی کتاب المجالسہ۔ [2] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) مجلد ۷ صفحہ ۱۶

[3] ایضاً صفحہ ۱۶ [4] سیرۃ عمر بن الخطاب ابن جوزی۔

اس کی حکومت میں نوع انسانی کو پوری کامیابی و سعادت حاصل ہوا اور اس کی قیادت میں اس کا
جو قدم پڑے وہ صحیح پڑے اور صحیح منزل کی طرف اٹھے، دنیا کو تہذیب کا اطمینان اور نظم ایسا ہی
ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہوا انسانوں کی مصلحتوں کا ان سے زیادہ
جاننے والا اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھنے والا دنیا کے لئے ان سے بہتر نگراں و محافظ اور
انسانوں کا ان سے بڑھ کر خیرخواہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا وہ بعض اہل مذاہب کی طرح دنیا کی زندگی کو
لعنت کا طوق نہیں سمجھتے تھے اس کے ساتھ وہ اس کو عیش و عشرت کی آخری فرصت و مہلت بھی
نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی سمجھتے اور اس کے لذائذ اور نعم کو کسی دوسرے دن
کے لئے ذرا انتظار نہ کرتے اسی طرح سے وہ اس زندگی کو کسی سابق جنم کے گناہ کی سزا بھی نہیں سمجھتے تھے
جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے نیز آفتاب پرست اقوام کی طرح وہ دنیا کو خوان یغما بھی نہیں سمجھتے تھے
جس پر وہ بھوکوں کی طرح گر پڑیں اور زمین کی دولتوں اور خزانوں کو پڑا ہوا لاوارث مال نہیں سمجھتے
تھے جس کے لوٹنے کے لئے وہ ٹوٹ پڑیں، وہ کمزور قوموں کو شکار نہیں سمجھتے تھے جس کے شکار
کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں ان کا اعتقاد تھا کہ یہ زندگی آخرت کی ایک نعمت ہے
جس میں اللہ سے قرب حاصل کرنے اور اپنے کمال انسانی تک پہونچنے کا ان کو موقع دیا گیا ہے اور
عمل اور جد و جہد کی ایک مہلت ہے جس کے بعد اس کے لئے کوئی مہلت نہیں۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ — جس نے مرنا اور جینا بنایا تاکہ تم کو جانچے
أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (الملک۔۲) — کہ تم میں کون عمل میں بہتر ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً — ہم نے جو کچھ زمین پر ہے اس کو اس کی رونق
لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا — بنایا ہے تاکہ لوگوں کو جانچیں کہ ان میں
(الکہف۔۷) — زیادہ اچھا کام کرتا ہے۔

وہ اس عالم کو اللہ کی مملکت سمجھتے تھے جس پر اللہ نے ان کو اول بحیثیت انسان کے اور پھر بحیثیت مسلمان کے اپنا نائب اور اپنی زمین کا نگران بنایا۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ۔ ۳۰)

میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ۔ ۲۹)

وہی ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے واسطے پیدا کیا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل۔ ۷۰)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور خشکی و تری دونوں میں اس کی سواری کا سامان کیا اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے بہم کر دیں اور جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں اُن میں سے اکثر پر اُسے پوری پوری برتری دے دی۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (النور۔ ۵۵)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خلافت ضرور عطا کرے گا جیسے ان لوگوں کو خلافت دی تھی جو ان سے پہلے تھے اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے جما کر رہے گا اور خوف جو ان کو لاحق ہے اس کے بدلہ امن دے گا میری بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔

ان کو اللہ نے زمین کی دولتوں سے بغیر اسراف و فضول خرچی کے فائدہ اٹھانے کا حق دیا تھا۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الاعراف ۔ ۳۱)

کھاؤ پیو مگر حد سے نہ گزرو، خدا انہیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے ہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ (الاعراف ۔ ۳۲)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کر دیں؟ کہو یہ نعمتیں تو اس لئے ہیں کہ ایمان والوں کے کام آئیں دنیا کی زندگی میں، قیامت میں خالص ہو کر۔

ان کو دنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگراں اور اتالیق مقرر کیا ہے اور وہ اس پر مامور ہیں کہ وہ ان کی رفتار، سیرت، اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں، کہیں راہ راست سے منحرف ہو جائیں تو اس کو صراط مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دور کرنے میں، رخنوں کو بھرنے میں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۔ ۱۱۰)

تم سب امتوں سے بہتر ہو جو بھیجی گئی عالم میں، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو

بالقسط شہدآء للّٰہ (النساء ۱۳۵) اللہ کی طرف سے گواہ بنو۔

ایک یورپین نومسلم عالم نے مسلمانوں کے اس امتیاز کو اور دنیا کی زندگی کے بارہ میں اس معتدل نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اس کا اقتباس نامناسب نہ ہوگا:

"اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بُری رائے نہیں رکھتا۔ اس کی تعلیم ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ کریں، عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے موجودہ یورپ رائج عیسویت کے خلاف زندگی کو پا لیا کرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر وہ اس کو نگلتا تو ہے لیکن اس کی عزت کرنا نہیں جانتا۔ اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک منزل سمجھتا ہے جس سے گزرنا ہے اس بنا پر انسان کو اس کی تحقیر اور اپنی اس دنیاوی زندگی کی بے وقعتی نہیں کرنی چاہئے زندگی کے سفر میں ہمارا اس دنیا سے گزرنا ضروری، اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ محض ایک واسطہ اور آلہ ہے اور اس کی قیمت اس سے زائد نہیں جو واسطوں اور آلات کی ہوتی ہے اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا قول ہے کہ میری سلطنت یہی دنیا ہے اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دنیا میری سلطنت نہیں، اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے قرآن کریم کو اس جامع دعا کی تعلیم دیتا ہے "ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ" (اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی) اس دنیا اور اس کی چیزوں کی قدر شناسی ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں سنگِ گراں نہیں

مادی ترقی اور خوش حالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ناپسندیدہ شئی ہماری ساری کوششوں اور جدوجہد کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات واسباب پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے اور اگر موجود ہے تو ہم اس کو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو۔ اس اصول کے مطابق اسلام مسلمانوں میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقع پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو۔ اس لئے کہ اسلام ہماری زندگی کی ہر چیز کو اخلاقی اور عملی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے اور وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کرے یا باطل کو۔ اس کے نزدیک کوئی درمیانی چیز نہیں اس لئے وہ عمل پر زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے ہر فرد مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اس کے گردوپیش کے واقعات کا شخصی طور پر جواب دہ سمجھنا چاہیئے اور اپنے متعین دینی مقصد وجود کے لئے ہمہ دم اور ہمہ وقت اور ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصور کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم ارشاد ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یہ بات اسلام کی جارحانہ کاروائی ابتدائی اسلامی فتوحات اور اسلامی تحریک

اخلاقی طور پر حق بجانب ثابت کرتی ہے پس اسلام استعماری (IMPERIALIST) ہے اگر یہ مفہوم انھیں الفاظ سے ادا ہو سکتا ہے لیکن استعمار (IMPERIALISM) کی اس قسم کی تحریک حکومت اور غلبہ کی محبت بالکل نہیں اور نہ انفرادی اور خود غرضی کو اس میں کچھ دخل ہے مجاہدین اولین کو جو چیز میدان جنگ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لے جاتی تھی وہ دوسروں کی دولت و محنت کے ذریعہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا لالچ نہ تھی اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا دنیا کا ڈھانچہ بنا دیا جائے جس میں انسان کے لئے بہتر سے بہتر روحانی ترقی ممکن ہو اسلامی تعلیمات کی رو سے اخلاقی فضیلت کا علم انسان سے اخلاقی ذمہ داری کا مطالبہ کرتا ہے یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان نظری طور پر حق و باطل میں امتیاز کرے مگر حق کی ترقی اور باطل کے زوال کے لئے جد و جہد نہ کرے اسلام کی رو سے اگر انسان حق اور نیکی کے غلبہ اور حکومت کے لئے سعی و جانفشانی کرتا ہے تو وہ زندہ رہتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے اور اگر وہ اس کی مدد و تقویت میں دریغ کرتا ہے اور اس کی حمایت و نصرت سے دست کشی کرتا ہے تو اس کو زوال ہو جائے گا اور وہ بالکل مغلوب ہو جائے گی۔[1]

اسلامی اقتدار اور اسلامی تمدن کے اثرات و نتائج

پہلی صدی ہجری میں جب اسلامی تمدن کا اپنی پوری وسعت اور مظاہر کے ساتھ ظہور ہوا اور اسلامی حکومت کا اپنی صحیح شکل و نظام کے ساتھ قیام، مذاہب، اخلاق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز اور سیاست و اجتماع کی دنیا میں ایک بالکل نیا واقعہ تھا اس انقلاب سے تمدن کے دھارے کا رخ

---

[1] ISLAM AT THE CROSS ROADS BY MOHAMMAD ASAD FORMERLY LEOPOLD WEISS PP. 26 - 29

اور دنیا کے سفر کی سمت بدل گئی۔ اسلام کی یہ عظیم الشان فتح جاہلیت کے لئے ایک ایسی آزمائش اور خطرہ تھا جس سے اس کو اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ابھی تک اس کے حریف (اسلام) کی حیثیت ایک دینی اور روحانی دعوت سے زیادہ نہ تھی۔ اب وفعتہً وہ سب کچھ ہو جاتا ہے، سعادت و نجات کا پورا نظام، روحانیت و مادیت کا مکمل مجموعہ، زندگی اور قوت کا پورا مظہر، ایک مکمل تمدن اور اجتماع، ایک طاقتور حکومت، ایک کامل نظام سیاسی۔

اب ایک طرف ایک ایسا معقول سہل الفہم اور ممکن العمل دین تھا جو سراسر حکمت و معقولیت تھا، دوسری طرف محض اوہام و خرافات اور قصے کہانیاں، ایک طرف الٰہی شریعت اور آسمانی وحی تھی، اس کے مقابلہ میں محض قیاسات اور انسانی تجربہ اور انسانوں کا بنایا ہوا قانون۔

ایک طرف ایسا لبند و برتر تمدن تھا جس کی بنیاد غیر متزلزل اور جس کے اصول غیر متبدل خوف خدا، اعتیاط و امانت کی روح اس کے پورے نظام میں جاری و ساری تھی، اس کے حلقہ میں دولت و عزت کے مقابلہ میں اخلاق و پارسائی اور کھوکھلے مظاہر کے مقابلہ میں روح اور اصلیت کی عزت و قیمت زیادہ تھی، لوگوں میں مساوات تھی، اور اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل تھی تو محض تقویٰ کی بنا پر، لوگوں کی بڑی توجہ اور اصل کوشش آخرت کے لئے تھی، اس لئے طبیعتوں میں اطمینان اور دلوں میں قناعت تھی، زندگی کے سامان و اسباب میں کوئی حرص و مسابقت اور دنیا کی دولت پیداوار اور دلداگی نہیں تھی۔ اس کے مقابلہ میں جاہلی تمدن تھا، پُر شور و پُر ہنگامہ، متزلزل اور مضطرب، بڑا چھوٹے پر ظلم کرتا تھا اور طاقتور کمزور کو کھائے ڈالتا تھا، لہو و لعب اور بداخلاقی میں مسابقت اور جاہ و دولت اور سامان عیش و راحت کے حصول میں سخت مقابلہ تھا، یہاں تک کہ دنیا ایک میدان جنگ اور زندگی عذاب جان بن کر رہ گئی تھی۔

ایک طرف عادل اسلامی حکومت تھی جو اپنی رعیت کو ایک نظر سے دیکھتی تھی، کمزور کو طاقتور

امن کا حق دلاتی تھی لوگوں کے گھروں اور جان و مال کی طرح ان کے اخلاق کی نگرانی و حفاظت بھی اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ان میں سب سے بہتر ان کے حکام تھے اور سب سے زیادہ زاہدانہ زندگی ان لوگوں کی تھی جن کو سب سے زیادہ عیش و راحت کا سامان اور اس کے مواقع حاصل تھے، اس کے مقابلہ میں جاہلی حکومتیں تھیں جہاں ظلم و ستم رانی کا بازار گرم تھا، جس کے کارندوں اور حکومت نے خیانت و ظلم پر کمر بندھ رکھی تھی جس کے افراد لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور ان کی بے آبروئی و خونریزی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتے تھے اور اپنے عمل کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کے اخلاق خراب کرتے تھے، ان میں سب سے بدتر حکام اور بادشاہ تھے، ان کی حکومت میں انسان بھوکوں مرتے اور ان کے جانور اور کتے شکم سیر ہوتے، ان کے محل زر نگار دیواروں اور پردوں میں چھپتے اور لوگوں کو تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہوتا۔

اب لوگوں کو اسلام میں کوئی رکاوٹ اور اس کے قبول کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی، اور جاہلیت میں کوئی وجہ ترجیح نظر نہیں آتی تھی، آدمی کو اسلام قبول کرنے پر کچھ کھونا نہیں پڑتا تھا اور سب کچھ حاصل ہو جاتا تھا، اس کو یقین کی ٹھنڈک، ایمان کی شیرینی، اسلام کی قوت ایک طاقتور حکومت کی سرپرستی اور ایسے دوستوں اور مددگاروں کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی، جو اس پر اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اطمینان قلب اور موت کے بعد کی زندگی کے بارہ میں اعتماد و سکون حاصل ہوتا تھا، لوگ آسانی کے ساتھ جاہلیت کے محاذ سے اسلام کے محاذ کی طرف منتقل ہونے لگے، جاہلیت کے علاقہ میں اسلام پھیلنے لگا اور اسلام کو طاقت اور اقتدار حاصل ہوتا گیا، یہاں تک کہ کمزور طبیعتوں کے لئے بھی کفر و اسلام کے بارہ میں کوئی کشمکش باقی نہیں رہی، اور خالص اللہ کی فرمانبرداری آسان ہو گئی۔

اس انقلاب کا اثر بہت وسیع اور گہرا تھا، خدا پرستی کی راہ جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں دشوار اور خطرات سے بھری ہوئی تھی، اب بہت سہل اور محفوظ ہو گئی، جاہلیت کے حلقہ اور

ماحول میں خدا کی اطاعت مشکل تھی اب اسلامی ماحول میں خدا کی نافرمانی مشکل ہو گئی کل تک برسر بازار اور گلی کوچوں میں فسق و فجور اور جہنم کی طرف دعوت دی جاتی تھی اب ایسا کرنا بہت مشکل تھا، کل تک خدا کی نافرمانی اور اس کی نافرمانی کے اسباب موجود بکثرت اور باعلان تھے اب ان پر کڑی پابندیاں اور ان کے لئے بڑی رکاوٹیں تھیں کل تک اسلام کی تبلیغ یا اس کی طرف دعوت دینا ایک جرم تھا جس کے لئے بڑی احتیاط اور رازداری کی ضرورت تھی اب وہ ایک دین کا شعار تھا جس کے لئے کسی رازداری اور پردہ کی ضرورت نہ تھی نہ دعوت دینے والوں کو کوئی خطرہ تھا اور نہ قبول کرنے والوں کو۔ قرآن مجید نے اس فرق کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (الانفال - ۲۶)	اور وہ وقت یاد کرو جب تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم کمزور سمجھے جاتے تھے تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو اچک نہ لے جائیں پھر اس نے تمہیں ٹھکانا دیا اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔

اس اقتدار و طاقت کی وجہ سے مسلمان لفظی و نفوذی طور پر امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے لگے اور حکم و ممانعت کی قوت ان کو حاصل ہو گئی۔

جس طرح موسم بہار میں نباتات اور درخت اپنے مزاج کے موافق موسم سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح محسوس اور غیر محسوس طریقہ پر اسلامی اقتدار و تمدن کے زمانہ میں لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں

اور اسلام سے متاثر ہونے لگیں، دلوں میں گداز و نرمی پیدا ہونے لگی، اسلام کے اصولِ اخلاق
دل و دماغ میں پیوست ہونے لگے، اشیاء کی قدر و قیمت کے بارہ میں لوگوں کا نقطۂ نظر بدلنے
لگا، کل تک جن چیزوں اور جن صفات کی لوگوں کی نگاہ میں بڑی وقعت و اہمیت تھی اب وہ
جاتی رہی، اور جو چیزیں بے وقعت تھیں اب وہ قیمتی بن گئیں، پرانے پیمانوں کی جگہ نئے پیمانوں
نے لی، جاہلیت، رجعت پسندی اور جمود کی علامت بن گئی اور اس کے متبعین میں احساسِ کمتری
پیدا ہو گیا، اسلام کی طرف انتساب اس کے شعائر و خصوصیات کا اختیار کرنا ایک فخر اور تعریف
کی چیز بن گئی، دنیا اسلام سے آہستہ آہستہ قریب ہو رہی تھی جس طرح اس کرۂ ارضی کے رہنے
والوں کو آج تک اس کی گردش کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح ان قوموں کو اور ان کے افراد کو
اپنے اسلامی رجحانات اور اسلام کے اندرونی اثرات کا احساس نہیں ہوتا تھا، ان اثرات سے علم
و فلسفہ، عقائد، مذاہب، تمدن، لوگوں کے ضمیر اور ان کے باطن ان اثرات کی شہادت دیتے تھے
اور ان کے اصلاحی میلانات اس کی غمازی کرتے تھے، مسلمانوں کے تنزل کے بعد بھی جو اصلاحی
تحریکات ان قوموں میں پیدا ہوئیں وہ اسلامی اثرات اور اسلامی خیالات کا نتیجہ تھیں۔

اسلام نے توحید کی دعوت پیش کی اور بت پرستی اور شرک کی ایسی مذمت اور ہجو کی کہ
بت پرستی اور شرک ہمیشہ کے لئے بے وقعت اور ذلیل ہو گیا، لوگوں کو اس سے شرم آنے لگی، اور
اس سے وہ اپنے کو بری ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے، یا تو وہ بڑی جرأت اور صفائی کے ساتھ
اس کا اقرار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے:۔

اَجَعَلَ الْآلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا	کیا سب معبودوں کو ادل بدل کر کے ایک ہی
اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص - ۵)	معبود قرار دیا، یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے

یا اپنے مذہب کے مشرکانہ اجزاء و اعمال کی تاویل و توجیہ اور اس کی تشریح کی ایسی کوشش کرنے لگے،

وہ توحید سے ملتی جلتی چیز تھی تقریباً عیسائیوں میں ایسے گروہ پیدا ہوئے جو حضرت مسیح کی الوہیت کا انکار اور عقیدہ تثلیث کی توحید نما تشریح کرتے تھے ان میں ایسے مصلح بھی پیدا ہوئے جو عیسائیوں کے مذہبی گروہ اور اہل کلیسا کے اثر و رسوخ کے درمیان وساطت کے منکر تھے ان پر سخت تنقیدیں کرتے تھے اور ان کے مخصوص حقوق کو نہیں مانتے تھے آٹھویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک ایسا گروہ ظاہر ہوا جو پادریوں کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی مخالفت کرتا تھا اور جس کی دعوت یہ تھی کہ صرف اللہ کے سامنے دعا و استغفار اور اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف و اقرار کرنا چاہیے اور اس میں کسی انسانی وساطت کی ضرورت نہیں ہے؟[1]

اسی طرح آٹھویں صدی عیسوی سے نویں صدی تک یورپ میں اس تحریک کا بڑا زور رہا کہ تصاویر اور مجسمے ایک خلاف مذہب فعل ہے اور ان میں کوئی تقدیس نہیں ہے اس تحریک نے اتنا زور پکڑا اور ایسا اثر و اقتدار حاصل کر لیا کہ لیو سوم قسطنطین پنجم اور لیو چہارم جیسے عظیم الشان شاہان روما نے اس کی حمایت اور پشت پناہی کی اور لیو اسوری نے ۷۲۶ء میں ایک فرمان صادر کیا جس میں سرکاری طور پر تصویروں اور مجسموں کی تقدیس کی ممانعت کی گئی تھی ۷۳۰ء میں دوسرے فرمان میں اس کو اس نے بت پرستی قرار دیا تھا مسیحی اور بت پرست یورپ اور رومی یونانی تمدن جس کی تصویر نوازی اور بت تراشی شہرۂ آفاق ہے، میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار و جہاد یقیناً اسلام کی بت شکنی اور اعلان توحید کی صدائے بازگشت تھی جو مغرب میں اسلامی اندلس اور اسلامی تبلیغ و اثرات کے ماتحت پہنچی اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلوڈیس CLAUDIUS جو تورین کا لاٹ پادری اور اس تحریک و دعوت کا بڑا پرجوش علمبردار تھا (یہاں تک کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا) اس کے متعلق تاریخی طور پر معلوم ہے کہ اس کی ولادت اور نشو و نما اندلس میں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مختصر الصدم برالرصل ۃ دلمدین صدا تحقق۔

ہوتی ہے اور یہ دوسری صدی ہجری کا زمانہ ہے جب اسلامی حکومت اور مسلمانوں کا تمدن اپنے عروج پر تھا۔[1]

یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ذہنی اثرات کے اور بہت سے نمونے اور نظیریں ملیں گی۔ خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی اور مورخین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس کے بانی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات پڑے تھے۔ اور صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یورپ کی پوری زندگی اور اس کا تمدن اسلام سے متاثر ہوا ہے۔ رابرٹ بریفالٹ ROBERT BRIFFAULT اپنی کتاب THE MAKING OF HUMANITY میں لکھتا ہے:-

"یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو اور اس کی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہوں جنھوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے۔"[2]

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"صرف طبعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان عظیم ہے) یورپ میں نئی زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور اس کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئی ہیں۔"[3]

اسی طرح ہندوستان کی قوموں کے اخلاق و معاشرت اور قانون سازی میں بھی اسلامی ذہنیت اور اسلامی شریعت کے اثرات نظر آئیں گے۔ عورت کا احترام اور اس کے حقوق کا اعتراف، مختلف انسانی گروہوں کے درمیان مساوات کا اصول اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے اختلاط کے بعد

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مختصر الاسلام ... صفحہ ۲۲۶-۲۲۵ بحوالہ صلاح الدین خدا بخش۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۰
[3] ایضاً صفحہ ۲۰۲

روز بروز زیادہ تسلیم کیا جانے لگا، غرض متمدن اور آباد دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن بعثتِ محمدی اور ظہورِ اسلام کے بعد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔

اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب کے دورِ انحطاط میں بھی اسلام کی سابقہ دعوت اور قوت کے آثار اور یادگاریں باقی تھیں، انھیں میں سے ایک خدا شناسی تھی جو پوری اسلامی دنیا میں عام تھی، خدا کا خیال مسلمان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اُتار دیا گیا تھا کہ وہ ہر قسم کے انقلابات و تغیرات اور دینی تنزل میں بھی نہیں نکل سکا، مسلمان کے لئے فسق و فجور ممکن تھا (اور مسلمانوں کے دورِ تنزل میں اس کا اچھی طرح ظہور ہوا) مگر خدا کا خیال دل و دماغ سے دور نہیں ہو سکا، نفسِ لوّامہ کی ملامت ضمیر کی سرزنش، خدا کی موجودگی کا خیال اور آخرت کا کھٹکا بدمستی اور خود فراموشی کے عالم میں بھی دل میں چٹکیاں لیتا تھا، اور کبھی کبھی اپنا کام کر جاتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ فسّاق و فجار بعض اوقات دفعۃً فسق و فجور سے توبہ کر کے صالحین و متقین کے گروہ میں شامل ہو جاتے، رندانِ خرابات ایک ٹھوکر سے ہوشیار ہو کر کعبہ کی راہ لیتے، بڑے بڑے شاہزادے اور بادشاہ و امیرزادے ایک معمولی سی غیبی تنبیہ سے (جس سے ہزار درجہ زیادہ تنبیہیں مادیت و کفر کے دور میں بے اثر ثابت ہوتی ہیں) تخت و تاج چھوڑ کر فقر و درویشی اور صلاح و تقوے کی زندگی اختیار کر لیتے تھے، بعض مرتبہ قاری نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:-

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ	کیا ایمان والوں کے لئے اس کا وقت
قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ	نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے
الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا	اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے
الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ -	جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں
فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ -	جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا

فَقَسَتْ ۝ | ان پر ایک زمانہ دراز گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ بہت سے آدمی ان میں کے آج کافر ہیں۔

(الحدید-۱۶)

بعض لوگ ایسا معلوم ہوا کہ سوتے سے چونک گئے اور ان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے انقلاب ہو گیا۔ تاریخ ان مثالوں سے لبریز ہے۔

بغداد کے انتہائی تعیش اور غفلت کے دور میں صاحب تاثیر واعظوں اور مخلص ناصحوں کی مجلس مشکل سے ایسے واقعات سے خالی ہوتی تھی۔

مشہور عرب سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) جس نے ۵۸۰ھ میں بغداد دیکھا ہے شیخ رضی الدین قزوینی کی مجلس وعظ کا حال بیان کرتا ہے کہ اثناء وعظ میں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں جاری تھیں، لوگ پروانوں اور متوالوں کی طرح توبہ کے لئے ان کے ہاتھ پر گر رہے تھے اور اپنے بال کاٹ رہے تھے۔[1]

حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۹۷ھ) کی مجلس وعظ میں تو یہ حال تھا کہ لوگ چیخ مار مار کر روتے تھے، لوگوں پر غشی طاری ہو جاتی تھی اور بیہوش ہو ہو کر گرتے تھے اور لوگ ہاتھوں میں اٹھا کر لے جاتے تھے، اپنی پیشانی کے بال ان کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔[2] حافظ ابن جوزیؒ نے خود ایک موقع پر تخمینہ لکھا ہے کہ ایک لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی ہے۔[3] پانچویں صدی کے ایک محدث شیخ اسمٰعیل لاہوری کے متعلق مورخ کے الفاظ ہیں: "جمہور مردم در مجلس وعظ وے بشرف اسلام مشرف شدند۔"[4] ابن بطوطہ نے متعدد ہندوستانی واعظین کی تاثیر کے ایسے ہی واقعات لکھے ہیں۔

---

[1] رحلۃ ابن جبیر ص [2] صید الخاطر و المنتظم [3] تذکرہ علماء

کفر اور بے دینی کے تسلط اور غلبہ کے زمانہ میں اثر پذیری کی ایسی مثالیں مفقود ہوتی ہیں اس دور میں مؤثر سے مؤثر دینی خطابت اور اخلاقی نصائح بے اثر ہوتے ہیں۔

خدا کا خیال اس وقت کی زندگی میں داخل تھا جس سے کسی قوم یا مذہب یا فرقہ و خیال کا آدمی خالی نہ تھا، زبان و ادب میں خداشناس طرز ادا، مذہبی تعبیرات اور حمد و نعت و رسالت کی زبان کے الفاظ و اصطلاحات رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری و ساری تھے کہ اس زبان و ادب کو اس سے معرّا نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلامی تعبیرات، دینی آداب اور جملے غیر مسلموں کی زبان پر اس طرح جاری ہو گئے تھے اور روزمرہ اور محاورات کے اس درجہ جزو بن گئے تھے کہ دوسرے ہم مذہبوں سے ان کی تمیز نہیں ہو سکتی تھی، غیر مسلم ادیب اور فاضل قرآن مجید حفظ کرتے تھے، مشہور غیر مسلم ادیب اور کاتب ابواسحٰق صابی کے متعلق منقول ہے کہ وہ رمضان مبارک کے روزے بھی رکھتا تھا۔

خدا طلبی کا ذوق ساری اسلامی دنیا میں عام تھا، ہزاروں لاکھوں اشخاص اسلامی ملکوں اور شہروں میں دین کی طلب اور مردانِ خدا کی تلاش میں سمندروں، پہاڑوں اور بیابانوں کو عبور کر کے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہنچتے تھے، خدا کی طرف بلانے والوں کی ذات مرجع خلائق اور ان کے مقامات طالبین خدا کے ہجوم سے معمور رہتے تھے اور ان کی آبادی اور رونق حکومت کے مرکزوں اور اہل حکومت کے دفاتر سے کہیں بڑھ کر تھی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس خلفاء عباسیہ کے دربار سے زیادہ پُر ہیبت اور بارونق تھی، امراء و اغنیاء کی اولاد بچپن کے خیال اور خدا طلبی سے خالی نہ تھی، سوانح و تراجم کی کتابیں ایسی مثالوں سے پُر ہیں۔

باب چہارم

مسلمانوں کا تنزل

مسلمانوں کے تنزل کا آغاز اور اس کے اسباب

ایک ادیب نے خوب کہا ہے کہ "انسانی زندگی میں دو ایسے واقعات ہیں جن کا بالکل ٹھیک وقت ہم نہیں بتا سکتے۔ ان میں سے ایک جس کا تعلق فرد کی زندگی سے ہے نیند آنا ہے کوئی شخص آج تک اس خاص لمحہ کا تعین نہیں کر سکا جب جاگنے والا سو جاتا ہے۔ دوسرا واقعہ جس کا تعلق قومی زندگی سے ہے تنزل یا زوال ہے۔ کوئی یہ نہیں بتا سکا کہ فلاں قوم کا زوال کس تاریخ سے شروع ہوا۔ سب کو اس کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ زور پکڑ جاتا ہے۔"

یہ حقیقت اکثر قوموں کے بارہ میں منطبق ہے لیکن امت اسلامیہ کی زندگی میں زوال و تنزل کا آغاز دوسری قوموں کی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور روشن ہے۔ اگر ہم کمال و زوال کے درمیان کی حد کو متعین کرنا چاہیں تو ہم اپنی انگلی اس تاریخی خط پر رکھ دیں گے جو خلافت راشدہ اور ملوکیت عرب یا "مسلمانوں کی بادشاہی" کے درمیان حدِّ فاصل ہے۔

بات یہ تھی کہ براہ راست اسلامی قیادت اور بالواسطہ دنیا کی رہنمائی کی زمام ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کا ہر فرد اپنے ایمان و عقیدہ، اعمال و اخلاق، تربیت و تہذیب نفس کی آراستگی، سیرت کی بلندی اور کمال و اعتدال میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک مستقل معجزہ تھا،

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کے قالب میں ایسا ڈھال دیا تھا کہ ان میں جسم کے علاوہ کسی چیز میں بھی اپنے ماضی سے مماثلت باقی نہیں تھی، نہ میلانات و رجحانات میں، نہ ذہنیت و طرزِ فکر میں، نہ خواہشات میں۔ یہ حضرات جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے دین و دنیا کی جامعیت کا نمونۂ کامل تھے، وہ بیک وقت نمازوں کے امام، مسجدوں کے خطیب، قاضی اور بیت المال کے امین اور خازن اور لشکروں کے سپہ سالار تھے اور ایک وقت میں امورِ جنگ کا انصرام ملکوں اور شہروں کا انتظام اور سلطنت کے مختلف محکموں اور شعبوں کی نگرانی کرتے تھے، ان میں سے ایک ایک شخص ایک ہی وقت میں متقی وزاہد سیاسی کار و بار میں معاملہ فہم قاضی مجتہد فقیہ صاحب تدبیر حاکم اور تجربہ کار سیاسی تھا اس لئے ایک ہی ذات میں (اور وہ خلیفہ و امیر المومنین کی ذات ہوا کرتی تھی) دین و سیاست کا اجتماع ہوتا، اس کے گرد ان لوگوں کی جماعت تھی جو اسی مدرسہ نبوی یا مسجد نبوی کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھے، ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ایک ہی رنگ کے حامل اور ایک ہی سیرت سے متصف تھے، خلیفہ ان سے مشورہ لیتے اور کوئی اہم کام اُن کے مشورہ اور مدد کے بغیر نہ کرتے، پس ان کی روح تمدن کے پورے ڈھانچہ حکومت کے پورے نظام اور لوگوں کی پوری زندگی و معاشرت و اخلاق میں جاری و ساری ہو گئی، ان کے میلانات اور خواہشات کا تمدن پر عکس اور ان کی خصوصیات کا پورا پرتو پڑا، وہاں نہ روحانیت اور مادیت میں کوئی کشمکش تھی، نہ دین و سیاست میں کوئی تصادم، نہ دین و دنیا کی تفریق تھی نہ مصلحت و اصول میں کوئی رسہ کشی، نہ اغراض و اخلاق کے درمیان کوئی مزاحمت تھی نہ طبقوں اور گروہوں کی باہمی جنگ اور خواہشاتِ نفسانی میں باہمی مسابقت و تقابل، غرض ان کا تمدن اور اسلامی سلطنت کی زندگی اس کے بانیوں کے اخلاق و خصوصیات اور اعتدال و جامعیت کی پوری آئینہ دار تھی۔

جہاد اور اجتہاد کا فقدان

اصل یہ ہے کہ اسلام کی امامت[1] بڑی نازک اور وسیع صفات کو چاہتی ہے جو فرد یا جماعت اس منصب پر فائز ہو اس کے لیے ذاتی صلاح و تقویٰ اور عدل کے علاوہ جہاد و اجتہاد کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دو لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی و مطالب سے لبریز۔ جہاد سے مراد ہے عزیز ترین اور اہم ترین مطلوب کے حصول کے لئے اپنی انتہائی طاقت اور وسائل صرف کر دینا۔ مسلمان کا سب سے بڑا مقصود اللہ کی فرماں برداری، اس کی خوشنودی کا حصول اور اس کی بادشاہی اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے۔ اس کے لئے ایک طویل جہاد کی ضرورت ہے جو ہر اس عقیدہ، تربیت اخلاق، اغراض اور خواہشات کے خلاف جاری ہو جو مزاحم ہوں اور ان تمام نفسی و آفاقی (داخلی و خارجی) آلہہ و معبودات باطل کے خلاف جو اللہ کی فرماں برداری اور اخلاص میں حریف اور رقیب ہوں۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی بادشاہی اور اس کے احکام کو اپنے گرد و پیش کی دنیا اور اپنے بنی نوع پر پھیلانے کے لئے جدوجہد کرے۔ یہ اس کا دینی فریضہ ہے، اور خلق خدا پر شفقت اور مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کا بھی بہترین تقاضا ہے، اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات انفرادی اطاعت اور دین داری بھی ماحول کی سازگاری کے بغیر مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں فتنہ ہے۔ دنیا میں جتنے بھی جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان ہیں وہ اللہ کی تکوینی مشیت و احکام اور اس کے طبعی قوانین کے سامنے سرافگندہ ہیں۔

---

[1] یہاں اس سے مراد وہ امامت (امارت) نہیں ہے جس کی تعریف و شرائط کتب فقہ و اصول میں ہیں بلکہ وہ قوت و قابلیت ہے جس سے کوئی مسلمان فرد یا جماعت دنیا کی رہنمائی و پیشوائی کر سکے۔

وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ○
(آل عمران ۳:۸۳)

اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا بےچارگی سے اور اس کی طرف سب پھر کر جائیں گے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ
(الحج ۲۲:۱۸)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو کوئی بھی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی بھی زمین میں ہے نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چارپائے سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور کتنے ہی انسان بھی اور کتنے ہی ایسے ہیں جن پر عذاب لازم ہو گیا۔

اس لیے انسان کی نہ کسی کوشش کو دخل ہے اور نہ اس کے لئے کسی جدوجہد کی ضرورت، موجودات کے لئے موت و حیات، نشوونما کا جو قانون ہے اور ان کے جسم و فطرت کے لئے اللہ نے جو نظام مقرر کر لیا ہے اس پر وہ سب بے چون و چرا عمل پیرا ہیں اور چلتے رہیں گے اور اس سے سرمو انحراف نہیں ہوگا۔ جس مقصد کے لیے مسلمان کی جدوجہد مطلوب ہے وہ خدا کے اس قانون کا نفاذ ہے جو انبیاء لے کر آئے! اور جس کے غلبہ اور قیام کے لئے ان کے پیرو مامور ہیں جس کی مخالف طاقتیں اور قوتیں دنیا میں ہمیشہ رہیں گی، یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اس کی کثیر قسمیں اور صورتیں ہیں جن میں سے ایک جنگ بھی ہے جو بعض اوقات اس کی سب سے افضل قسم ہو جاتی ہے اس کی غایت یہ ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کوئی برابر کی حریف طاقت باقی نہ رہے جو خواہشات اور طبیعتوں کو مخالف سمت کی طرف کھینچے اور بہت سے انسانوں کے لئے کفر و اسلام کے درمیان کشمکش پیش آئے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

اور ان کفار سے یہاں تک جنگ کرو کہ

اس جہاد کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت سے بھی جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس کو گہری واقفیت ہو تاکہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کو پہچان لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ”مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشوونما پایا اور جاہلیت کو وہ نہیں پہچانتا“ یقیناً ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کفر و جاہلیت سے گہری اور تفصیلی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے مظاہر اور صورتوں اور رنگوں کو پہچانتا ہو لیکن بلاشبہ اسلام کی رہنمائی اور کفر و جاہلیت کے خلاف اسلامی لشکر کی قیادت کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عام اور متوسط مسلمانوں سے زیادہ کفر و جاہلیت کو پہچانتا ہو۔

اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ اس منصب پر فائز ہوں ان کی تیاری پوری ہو اور ان کی قوت مکمل ہو۔ ان کے پاس لوہے کا ٹکڑا نہ ہو بلکہ فولاد ہو اور کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو جس کا انسان اکتشاف کر سکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ
وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ
عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ
مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ
يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ

مسلمانو جہاں تک تم سے بن پڑے بہم پہنچاؤ قوت
پیادوں کی اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی دشمنوں کے
مقابلے کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے
رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے
دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور
ان لوگوں کے سوا اور دوسروں پر بھی جن کی تمہیں

لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

(الانفال ۔ ۶۰)

تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کی راہ
میں یعنی جہاد کی تیاری میں تم جو کچھ بھی
خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا لوٹا دیا جائے گا
نہ ہوگا کہ تمہاری حق تلفی ہو۔

اجتہاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہو وہ نئے پیش آنے والے مسائلِ زندگی میں انفراداً یا اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں اور تاریخ اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اچھی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے ہوں جس سے وہ امامت کی مشکلات کو حل کر سکیں اور اشتباہ اور تحیر کے موقع پر اس کی رہنمائی کر سکیں نیز وہ اچھی ذکاوت، مستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو بھی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لئے مفید بنائیں بجائے اس کے کہ اہل باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لئے استعمال کریں اور زمین میں سرکشی اور فساد کے لئے ان سے مدد لیں اہل حق ان سے وہ کام لیں جن کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔

اموی و عباسی خلفاء

لیکن دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصب جلیل پر وہ لوگ حاوی ہو گئے جنہوں نے اس کے لئے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانے کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انھوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت

جیسی باقی تھی ان کا دینی، روحانی، اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو خلافت اسلامیہ کے رہنماؤں کے
شایانِ شان ہے۔ ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکل
آزاد نہیں ہوئی تھیں۔ اسلامی تدریج جیسا تقاضا تھا اور نہ قوتِ اجتہاد جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر
قیادت کے لئے ضروری ہے۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کی ذات کو
مستثنیٰ کر کے عام خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کا یہی حال تھا۔

ملوکیت کے اثرات و نتائج

اس کا نتیجہ ہوا کہ اسلام کی دیوارِ آہنی میں کئی رخنے پیدا ہو گئے جن سے مسلسل فتنے اور
مصائب نفوذ کرتے رہے۔ ان کا اجمالی بیان یہ ہے:-

۱۔ دین و سیاست میں عملی تفریق ہو گئی۔ امراء نے جو حلقۂ علم اور دین میں ایسا مرتبہ نہیں
رکھتے تھے جس سے ان کو علماء اور اہلِ دین کی ضرورت نہ پڑے، انھوں نے حکومت و سیاست
کو تنہا اپنے ہاتھ میں رکھا اور مشیروں میں خصوصی کے طور پر جب چاہا یا جب ان کے مصالح کا
تقاضا ہوا علماء اور اہلِ دین سے مدد لی اور جتنی بات انھوں نے چاہی قبول اور جب چاہا
ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے آزاد ہو گئی اور ایک جلیل بے زنجیر
بن گئی۔ اب اہلِ دین اور اہلِ علم کی صورت یہی کہ یا تو وہ حکومت کے مخالف تھے اور اس کے
خلاف وقتاً فوقتاً خروج کرتے تھے یا سیاسی زندگی سے کنارہ کش تھے اور فوری انقلاب سے
مایوس ہو کر افراد کی اصلاح و تربیت کے کام میں مشغول تھے۔ بعض اپنے ماحول کی خرابی کو دیکھ کر
کڑھتے رہتے تھے اور اس پر دینی و اخلاقی حیثیت سے سخت تنقید کرتے تھے لیکن مجبور تھے۔ بعض
کسی دینی مصلحت کی بنا پر حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے تھے اور اس کے نظام میں شریک ہو کر

جتنی اصلاح ان کے امکان میں تھی کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اپنی ذاتی مصلحت اور کامیابی کے لئے حکومت کے ساتھ اشتراک اور موالات کرتے تھے بہر حال یہ واقعہ ہے کہ نظری اور اعتقادی طور پر تو نہیں لیکن عملاً دین و سیاست میں علیحدگی ہو گئی اور اس بارہ میں خلافت راشدہ سے پہلے دنیا کے نظام سلطنت کا جو حال تھا اس کا ایک رنگ پیدا ہو گیا تھا، دین روز بروز بے زور اور بے دست و پا ہوتا جاتا تھا اور سیاست کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے اور اس کی بے قیدی اور خود اختیاری بڑھ رہی تھی، اسی وقت سے اہل علم و دین اور اہل دنیا کے دو علیحدہ علیحدہ گروہ بن گئے اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی گئی اور بعض اوقات بیگانگی سے بڑھ کر مخالفت کی نوبت آ گئی۔

۲۔ ارکان حکومت یہاں تک کہ بسا اوقات خود خلفاء دین و اخلاق کا کامل نمونہ نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض اشخاص میں جاہلی جراثیم اور میلانات پائے جاتے تھے قدرتی طور پر ان کے رجحان اور نفسیات کا اثر قومی زندگی پر پڑ رہا تھا اور لوگ عموماً انہیں کے اخلاق و عادات و رجحانات کی تقلید کرتے تھے دین کی نگرانی ختم ہو چکی تھی، احتساب اٹھ چکا تھا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا زور ختم ہو چکا تھا اس لئے کہ اس کی پشت پر کوئی طاقت اور حکومت کی حمایت نہیں تھی وہ محض چند دین دار اشخاص کا ذاتی عمل تھا جن کے پاس کوئی قوت اور تعزیر نہیں تھی، اس کے برخلاف بے قیدی اور آزاد زندگی کی ترغیبات بہت تھیں اس لئے جاہلیت کو اسلامی ممالک کے اندر سانس لینے کا موقع ملا اور اس نے سر اٹھایا، عیش و عشرت، ترفع و تنعم کی زندگی عام ہو گئی، تفریحات اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، لذت اندوزی اور نفس پروری کا غلبہ ہوا اور دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں کی ہوس بڑھ گئی، اس اخلاقی تنزل اور اس تفریحی انہماک کے ساتھ کسی قوم کے لئے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دینا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جانشینی کرنا

اللہ اور روزِ آخرت کی یاد دلاتے رہنا، تقویٰ اور دینداری کی ترغیب دینا اور لوگوں کے لئے اعلیٰ اخلاقی نمونہ قائم کرنا بہت مشکل ہے جبکہ ان حالات کے ساتھ اپنے وجود، عزت اور آزادی کو برقرار رکھنا بھی دشوار ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ	اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں بھی اپنا یہی
قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا	دستور (جاری) رکھا ہے جو ان سے پہلے ہو
(الاحزاب ۔ ۶۲)	گزرے ہیں اور آپ خدا کے دستور میں کسی کی
	طرف سے ردوبدل نہ پائیں گے۔

مزید برآں لوگ اپنے اخلاق و اعمال و معاملات میں اسلام کی شرعی سیاست اس کے جنگی قوانین اس کے تمدنی نظام اور اس کی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمائندگی کرتے تھے اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا احترام اور اثر جاتا رہا اور ان کا اعتماد ان لوگوں سے زائل ہو گیا۔ ایک یورپین مؤرخ کے الفاظ میں "اسلام کو اس لئے زوال شروع ہوا کہ انسانیت کو ان لوگوں کی صداقت میں شبہ ہونے لگا جو دین جدید کی نمائندگی کر رہے تھے"۔

فلسفیانہ موشگافیاں

اس دورِ انحطاط میں مسلمان علماء اور مفکرین نے جس قدر علوم مابعد الطبیعیات METAPHYSICS اور یونانیوں کی الٰہیات کی طرف توجہ کی اس قدر علوم طبیعیہ اور عملی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ یہ یونانی فلسفہ اور الٰہیات محض یونانیوں کا علم الاصنام MYTHOLOGY تھا جس کو انھوں نے اپنی چالاکی سے فلسفیانہ الفاظ و اصطلاحات میں ایک عقلی فن کے رنگ میں پیش کیا تھا، وہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا جس کے پیچھے

کوئی حقیقت واہمیت نہ تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کو اس سعی کاوش
اور لاحاصل سے مستغنی کر دیا تھا اور نبوت کے ذریعہ ان کو ذات وصفاتِ الٰہی کا وہ یقینی اور
محکم علم بخشا تھا جس کی موجودگی میں اس چیستان میں اور اللہ کی ذات وصفات کے بارہ میں اس
کیمیاوی تحلیل وتجزیہ کی (جو فلسفۂ الٰہیات وکلام کا طرز ہے) قطعاً ضرورت نہ تھی لیکن
افسوس ہے کہ اہلِ فلسفہ وکلام نے اس نعمتِ عظیم کی قدر نہ کی اور ان مباحث میں جن کا دنیا
وآخرت میں کوئی فائدہ نہ تھا صدیوں تک دردسری و دیدہ ریزی کرتے رہے اور اپنی بہترین
قابلیت وذہانت اس لاحاصل مشغلہ میں صرف کی اس انہماک نے ان کو ان علوم اور تجربوں کی
طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا جو ان کے لئے کائنات کی طبعی قوتیں مسخر کر دیتے اور پھر وہ ان کو
اسلام کے مقاصد ومصالح کا تابع اور خادم بنا کر اسلام کے مادی وروحانی تسلط کو تمام
عالم پر قائم کر دیتے۔ اسی طرح سے انہوں نے فلسفۂ اشراق کے مباحث اور وحدۃ الوجود
کے مسائل میں اپنا ضرورت سے زیادہ وقت اور طاقت صرف کی۔

شرک وبدعات

اس دورِ انحطاط میں مسلمانوں میں شرک وجہالت قدیم جاہلی قوموں کے عقائد وخیالات
اور دینی بگاڑ نے بھی نشوونما شروع کر دیا اور مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے مزاج میں
ایسی بدعات نے در خور جگہ حاصل کر لی جنھوں نے مذہبی زندگی کی ایک بڑی جگہ کو گھیر لیا اور
مسلمانوں کو صحیح دین اور کارآمد دنیا سے مشغول کر دیا۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں
کے درمیان مسلمانوں کو جو کچھ امتیاز وخصوصیت حاصل ہے وہ اس عقیدہ کی بدولت ہے جو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پاس سے لے کر آئے تھے اور اس دین کا امتیاز واعجاز اس کی اصلیت

میں ہے، وہ اسی بارہ میں ممتاز ہے کہ وہ اللہ کی وحی و شریعت اس کی معجزانہ ساخت اور اس کی حکیمانہ صنعت ہے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ   یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ (النمل ۔ ۸۸)

پس جب اس میں انسانوں کی عقلیں دخل دینے لگیں گی اس کے خود ساختہ اعمال و اوہام داخل ہو جائیں گے اور وہ خدانخواستہ اپنی اصلیت کھو دے گا تو دنیا و آخرت کی سعادت کی ضمانت باقی نہیں رہے گی اور وہ اس کا مستحق نہ ہوگا کہ انسانی عقلیں اس کے سامنے سر افگندہ ہوں اور دلوں کو وہ تسخیر کرے۔

دعوت و تجدید کا تسلسل

لیکن واضح رہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے وہ اس پوری مدت میں ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے محفوظ رہا مسلمانوں نے راہ راست سے جہاں جہاں انحراف کیا تھا کتاب و سنت سے مقابلہ کر کے اس کا علم اور احساس ہو جاتا تھا، دین و شریعت نے مسلمانوں کی غلطی میں کبھی ساتھ نہیں دیا، بلکہ ان کے مطالعہ سے غیر اسلامی احوال، مشرکانہ اور مبتدعانہ اعمال و رسوم اور جاہلی اخلاق و عادات کے خلاف نیز طبقۂ امراء اور گروہ سلاطین کے تعیش اور استبداد کے خلاف ایک سخت احتجاج اور جذبۂ جہاد پیدا ہوتا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور اور اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں ایسے عالی ہمت اور اولو العزم اشخاص پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اس امت میں انبیاءؑ کی جانشینی کا حق ادا کیا مسلمانوں کے تن مردہ میں روحِ جہاد پھونکی اور برسوں کی ساکن سطح میں حرکت و تموج پیدا کیا اور وسائل اور علوم میں

اپنی تحریر، زور اور مجتہدانہ قابلیت سے کام لے کر مسلمانوں میں نئی علمی روح اور ذہنی بیداری پیدا کردی۔ ایک مبصر مؤرخ کو جہاد اور تجدید کی تاریخ میں کوئی خلا اور وقفہ نظر نہیں آتا۔ اصلاح کی مشعلیں اور چراغ مسلسل طریقہ پر ایک دوسرے سے روشن ہوتے رہے اور تیز و تند ہواؤں میں بھی عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرا نہیں پھیلنے پایا۔[1]

اسی کے ساتھ جب اسلام یا عالم اسلام کے لیے کوئی نیا خطرہ پیش آیا تو کوئی مردِ مجاہد میدان میں آیا اور اس نے نہ صرف اس خطرہ کو روک دیا بلکہ عالم اسلام میں ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا کردی، اس کی واضح مثال نور الدین اور صلاح الدین کی شخصیتیں ہیں۔

صلیبی خطرہ اور زنگی خاندان

مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات ان کے قبضہ اور تولیت میں تھے لیکن طاقتور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت یونان کی مسلسل ہزیمتوں کی بنا پر اس کو حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا، پانچویں صدی ہجری اور گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ایسے حالات و اسباب پیش آئے کہ یورپ سے صلیبی مجاہدین نے تمام فلسطین کا رخ کیا اور ان کی فوجیں سیلاب اور طوفان کی طرح بڑھ گئیں ۴۹۲ھ ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کرلیا اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ ان کے تصرف میں آگیا۔ مشہور انگریز مؤرخ اسٹینلے لین پول (STANLEY LANE POOL) لکھتا ہے:—

"صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونک دے"

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول

بھی معلوم ہونے لگا کہ درختِ اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی دھجیاں اڑا دیں گے۔[1]

صلیبیوں نے داخلۂ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر نہتے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ان کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مؤرخ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام برپا کیا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمرؓ میں سوار ہو کر گئے گھٹنوں گھٹنوں خون کے چھینٹے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیواروں سے دے مارا گیا یا ان کو چکر دے کر فصیلوں سے پھینک دیا گیا۔"[2]

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی اور عالم اسلام پر خطرہ کی گھنٹی تھی، مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ رینالڈ نے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا تھا۔ واقعۂ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی تھی۔

عین اس کش مکش اور بے حسی اور مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا جس کی موصل سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، یہ موصل کا زنگی خاندان تھا، جس کے مورث اعلیٰ عماد الدین زنگی (م ۵۴۱ھ) اور اس کے فرزند نور الدین زنگی (م ۵۶۹ھ) نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور بیت المقدس کے علاوہ (جس کی فتح صلاح الدین کے لئے مقدر تھی) تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، نور الدین اپنی شرافتِ نفس، زہد و ورع، حسن انتظام، عدل و انصاف، انکسار و تواضع، شوقِ جہاد اور ایمان و یقین کے لحاظ سے

---

[1] سلطان صلاح الدین از اسٹینلے لین پول مترجم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ص ۳۲

[2] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA VOL. VI. ART. "CRUSADES"

اسلامی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مشہور مورخ ابن الاثیر جزری جو ان کے ہم عصر ہیں اپنی تاریخ الکامل میں لکھتے ہیں:-

میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیز کے بعد نورالدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ عادل سلطان میری نظر سے نہیں گزرا۔[1]

صلاح الدین کی قیادت

نورالدین کے بعد ان کے تربیت یافتہ سلطان صلاح الدین نے صلیبی دنیا کے مقابلہ میں عالم اسلام کی قیادت سنبھالی اور آخر متعدد معرکوں کے بعد انھوں نے حطین (فلسطین) کے میدان میں ۲۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ (۴ جولائی ۱۱۸۷ء) کو صلیبیوں کو ایسی شکست دی جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ لین پول اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:-

• ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس نے گرفتار کیا تھا خیمے کی رسی میں باندھے لے جاتا دیکھا گیا۔ ٹوٹی ہوئی صلیبیں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں اور مُردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے خربوزوں کے کھیت میں خربوزے پڑے نظر آتے ہیں۔ مدتوں تک جنگ کا میدان جہاں یہ خونریز لڑائی ہوئی تھی اور جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے مشہور رہا۔[2]

حطین کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے ۲۷ رجب ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) کو بیت المقدس کو

---

[1] الکامل، ج ۱۱ ص ۲۲۵ [2] سلطان صلاح الدین ص ۱۶۵

دوبارہ حاصل کیا اور اس آرزو کی تکمیل کی جو ۹۰ برس سے مسلمانوں کے دلوں کو بے چین کیے ہوئے تھی سلطان کے رفیق و معتمد قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:۔

"ہر طرف دعا و تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا بیت المقدس میں (۹۰ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبۂ صخرہ پر جو صلیب نصب تھی وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا اور اسلام کی فتح مندی اور نصرت الٰہی کی دلیل آنکھوں نظر آرہی تھی۔"[1]

سلطان صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:۔

"اگر صلاح الدین کے کارناموں میں صرف یہی کارنامہ دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو دوبارہ حاصل کیا؟ تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شجاعت میں یکتا اور بے مثل شخص تھا۔"[2]

بیت المقدس کی فتح اور صلیبیوں کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر امڈ پڑا ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا اور اس کے افراد اور چند حلیف، جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خون آشام جنگوں کے بعد ۵۸۸ھ میں رملہ پر دونوں حریف جو تھک کر چور ہو گئے تھے صلح ہوئی۔ بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے ساحل پر عکہ کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا۔ صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی اور جس کو ان الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے

۱۔ تاریخ ابی الفداء حموی
۲۔ سلطان صلاح الدین صفحہ ۲۰۰

نے اس کے سپرد کیا تھا اس کے ہاتھوں مکمل ہوا لین پول لکھتا ہے:۔

"جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی۔ پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے پہلے دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی۔ ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے تو صور سے لے کر یافا تک ساحل پر پتلی سی زمین کی ایک پٹی کے سوا تمام ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔"[۱]

سلطان صلاح الدین اعلیٰ تنظیمی قابلیت اور قائدانہ خصوصیات کا مالک تھا۔ وہ نہ صرف سپہ سالار و فاتح تھا بلکہ محبوب قائد اور ہر دلعزیز سپاہی بھی تھا۔ اس نے صدیوں کے بعد منتشر و پراگندہ اسلامی ریاستوں اور طاقتوں اور متفرق اور باہم مخالف مسلمان قوموں اور قبائل کو جہاد کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا [illegible] کے بعد اس کی قیادت میں عالم اسلام نے ایک عظیم اور پرخلوص جنگ کی جس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"تیسری جنگ صلیبی میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔ صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی شدید و خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی مگر کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا۔ کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا۔"[۲]

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

۱؎ سلطان صلاح الدین ص [illegible] ۲؎ ایضاً ص [illegible]

کرد، ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے اور طلبی پر غلاموں ہی کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی اور باوجود قومی جھگڑوں اور رقابتوں کی موجودگی کے سلطان نے ان کو ایسا شیر و شکر کر رکھا تھا کہ تمام لشکر ایک واحد نظر آتا تھا۔[۱]

صلاح الدین کے بعد

۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ نامور فرزند دنیا سے رخصت ہوا۔ صلاح الدین کی وفات کے بعد گزشتہ سو سال اور اس کی بروقت قیادت نے عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے عرصہ تک کے لئے محفوظ کر دیا۔ عالم اسلام بہت کچھ صرف ہو گیا لیکن صلیبیوں نے ان جنگوں سے فائدہ اٹھایا اور عالم اسلام کی کمزوری کا صحیح اندازہ کر لینے کے بعد وہ نئے صلیبی حملہ کی تیاریاں کی نوبت آٹھویں صدی میں آئی۔ یہ جنگیں اب مصروف ہو گئے لیکن عالم اسلام پر پھر غفلت طاری ہو گئی اور باہمی اختلافات اور خانہ جنگیوں نے پھر سر اٹھایا۔ صلاح الدین کے بعد عالم اسلام کو پھر ایسا مخلص قائد اور رہنما نصیب نہیں ہوا جو اسلام کی بے غرض خدمت کے لئے بیتاب ہو اور جس کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ ہو اور جس پر عالم اسلام کو اس درجہ اعتماد اور اس کی ذات سے تعلق ہو جیسے صلاح الدین کے ساتھ تھا۔ عالم اسلام پھر ایک بار خود غرضیوں، خانہ جنگیوں اور سازشوں کا شکار ہو گیا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک انحطاط اور تنزل چھا گیا۔

جاہلیت کے لئے رکاوٹ

لیکن مسلمان اپنی ساری خرابیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنے انحراف کے

۱۔ یوسف بن صلاح الدین ص

باوصف اپنی تمام معاصر جاہلی قوموں کے مقابلہ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شاہراہ سے قریب تر اور خدا کے نبی امی ﷺ کی نام لیوا و فرمانبردار تھی اس کا وجود اور اس کا رہا سہا اقتدار جاہلیت کے لئے پھیلنے اور ترقی کرنے میں بڑی زبردست رکاوٹ اور سد سکندری کا کام دے رہا تھا، وہ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود دنیا کی ایک اہم طاقت تھی جس سے حکومتیں خائف رہتی تھیں اور جس کی ان کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی لیکن بغیر اس کے کہ باہر کے لوگ محسوس کر سکیں اندرونی طور پر یہ طاقت کمزور ہوتی رہی یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا سیاسی انتشار، اخلاقی کمزوری اور ضعف پورے طور پر نمایاں ہوگیا اور اسلامی طاقت کا وہ مہیب سایہ جو دور سے نظر آتا تھا، اوجھل ہوگیا اور اس کے ہٹتے ہی مسلمانوں پر وحشی قوموں اور حریف طاقتوں کا نرغہ ہوا اور اسلامی ممالک ایک لاوارث مال کی طرح فاتحوں میں تقسیم ہونے لگے۔

ہنگامۂ تاتار

ان وحشیانہ حملوں میں سب سے بڑا حملہ تاتاریوں کا حملہ تھا جو سیلاب کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔ تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان بہت دہشت زدہ تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا۔ ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آگیا، مورخ ابن اثیر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے:۔

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا

ذکر کروں یا نہ کروں اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں
اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا
جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے، کاش میں نہ پیدا ہوتا کاش میں
اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے
لکھنے پر آمادہ کیا پھر بھی مجھے تردد تھا لیکن میں نے دیکھا کہ نہ لکھنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔

یہ وہ حادثہ عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی
اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے اگر کوئی
شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں نہیں پیش آیا تو وہ کچھ غلط
دعویٰ نہ ہوگا اس لئے کہ تاریخ میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا شاید
دنیا قیامت تک (یاجوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے ان وحشیوں نے کسی پر
رحم نہیں کھایا انھوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا عورتوں کے پیٹ چاک
کر دیئے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ
اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ یہ حادثہ عالم گیر و عالم آشوب تھا ایک طوفان کی طرح
اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر پھیل گیا۔[1]

۶۵۶ھ میں تاتاری (ہلاکو) بغداد میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کی اینٹ
سے اینٹ بجا دی، مورخ ابن کثیر بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کی غارت گری و خونریزی کا
ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا چالیس دن کے بعد

---

[1] الکامل ابن اثیر ج ۱۲ صفحہ ۲۰۲-۲۰۳

یہ کل شہر جو دنیا کا پُر رونق ترین شہر تھا بالکل ویران و تاراج ہو گیا کہ ڈھونڈنے سے آدمی دکھائی دیتے تھے بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری گرانی، وبا اور فنا فتنوں کا دور دورہ تھا۔[1]

مصری افواج کے مقابلے میں تاتاریوں کی شکست

عراق و شام کے قبضے کے بعد تاتاریوں کا رُخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارتگری سے بچا ہوا تھا۔ سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصری اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بُری طرح سے بھاگے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیف الدین قطز کے بعد الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کو شکست ممکن نہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

بایں ہمہ تاتاری عراق سے لے کر ایران و ترکستان تک قابض تھے اور خود دارالاسلام بغداد ان کے قبضہ میں تھا۔ ایک نیم وحشی بت پرست قوم کا عالم اسلام کے علمی و تہذیبی مرکز پر قابض ہونا ایک افسوس ناک واقعہ تھا جس کا برا اثر عالم اسلام اور پوری زندگی اور تمدن و اخلاق پر اثر پڑ رہا تھا۔ عالم اسلام میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو ان کو عراق سے بے دخل کر سکے اس وقت اسلام کی روحانی طاقت اور قوت تسخیر کا ایک معجزہ ظاہر ہوا اور چند گمنام مخلص داعیوں اور علماء امراء دربار کی توجہ اور کوشش سے تاتاری سلاطین و امراء میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی۔ اور اس طرح اسلام نے اس ناقابل تسخیر قوم کو فتح کر لیا جس نے سارے عالم اسلام کو ایک بار فتح کر لیا تھا۔ ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"اس سال چنگیز خان کا پڑپوتا قازان تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف با اسلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر پھینکا اور لٹائے گئے۔ اس نے اپنا نام محمود رکھا اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی۔ بہت سے بت خانے گرا دیے اور ان پر جزیہ مقرر کیا۔ بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا اور لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا۔"[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۳، ص ۳۴۰

تاتاری حملے کا عالم اسلام پر اثر

تاتاری حملہ سے عالم اسلام کو ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس کے سنبھلنے کے لئے مدت درکار تھی، تاتاری حملوں سے مسلمانوں کے قوائے فکریہ میں اضمحلال و افسردگی اور طبیعتوں میں یاس انگیزی اور جمود پیدا ہو گیا، اس حملہ سے علوم و فنون، ادب و شاعری، تصنیف و تالیف اور اخلاق و معاشرت سب پر اثر پڑا تھا، علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ، جدت و اصلاح اور تغیر و ترقی کے بجائے اب اہلِ علم اور حاملین دین کو اس کی فکر تھی کہ وہ موجودہ سرمایہ کی حفاظت کا مستقل انتظام کر سکیں، اور کسی طرح اس علمی و ادبی ذخیرہ کو تباہی سے بچا سکیں جو اب ان کی تولیت اور امانت میں تھا، انسانیت و تہذیب کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ دنیا کی زمام اقتدار ان جاہلی اور وحشی قوموں کے ہاتھ میں آگئی تھی جو کوئی آسمانی دین رکھتے تھے اور نہ کسی علم و تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کے مالک تھے، ان کی قیادت میں کسی علمی و دینی ترقی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی، ان کے اسلام قبول کر لینے کے بعد اگرچہ مسلمان ان کی غارتگری اور خونآشامی سے محفوظ ہو گئے تھے اور ان کو دینی آزادی حاصل ہو گئی تھی اور اسلام حکمراں طبقہ کا مذہب بن گیا تھا، مگر ان جدید الاسلام تاتاریوں میں بہرحال دینی و علمی قیادت اور اسلامی امامت کی صلاحیت نہ تھی، اور اس صلاحیت کے پیدا ہونے کے لئے ایک طویل مدت درکار تھی، اس وقت ایک ایسی تازہ دم عالی حوصلہ با بصیرت قوم کی ضرورت تھی جو گرتے ہوئے عالم اسلامی کو سنبھال سکے، اس میں پھر نئی زندگی اور نئی روح پیدا کر دے اور عالم اسلامی کی قیادت کا فرض انجام دینے کی کوشش کرے۔

میدان قیادت میں عثمانی ترکوں کی آمد اور عالم اسلامی کا ایک سنبھالا

کچھ ہی عرصے کے بعد آٹھویں صدی میں عثمانی ترک تاریخ کے منظر عام پر آئے، انھوں نے

دنیا کو عام طور پر اور مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف اس وقت متوجہ کیا جب سلطان محمد فاتح نے ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں اپنی چوبیس برس کی عمر میں بازنطینی سلطنت کے ناقابل تسخیر دارالسلطنت قسطنطنیہ کو فتح کر لیا اس واقعہ سے مسلمانوں میں ایک نئی اُمنگ اور نیا جوش پیدا ہوگیا ترک (جن کی قیادت آل عثمان کر رہے تھے) اس کے اہل تھے کہ ان پر اسلامی اقوام کی قیادت کے بارہ میں مسلمانوں کی طاقت کو از سر نو واپس لانے میں اور دنیا میں ان کے کھوئے ہوئے مرتبہ اور مقام کو حاصل کرنے میں اعتماد کیا جائے ان کا قسطنطنیہ کو فتح کر لینا جس کو مسلمان آٹھ سو برس تک بار بار کی کوششوں کے باوجود فتح نہیں کر سکے تھے ان کی قابلیت وقوت اور فنون جنگ میں مرتبۂ اجتہاد کو پہنچ جانے کی دلیل تھی اور یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنگی طاقت اور سامان جنگ میں اپنی تمام معاصر قوموں سے فائق ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے علم وعمل کی طاقت اور اجتہاد سے کام لے سکیں اور قائد قوم کے لئے یہ تمام صفات بمنزلہ شرائط کے ہیں۔

BARON CARRA DE VAUX اپنی کتاب "مفکرین اسلام" کے پہلے حصہ میں محمد فاتح کے تذکرہ میں لکھتا ہے:۔

"یہ فتح محض بخت و اتفاق سے حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کا سبب محض بازنطینی سلطنت کی کمزوری تھی اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان بہت پہلے سے اس کے لئے ضروری انتظامات کر رہا تھا اور اس کے زمانہ میں علم کی جتنی طاقت تھی اس سے کام لے رہا تھا توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپ اس زمانہ میں بن سکتی ہے بنائی جائے اس نے اس کے لئے ہنگری کے ایک انجینیر کی خدمات حاصل کیں جس نے اس کے لئے

ایک ایسی توپ بنائی جو تین سو کلو کے وزن کا گولہ پھینکتی تھی اور اس کی ایک میل سے زیادہ دوری تھی کہتے ہیں کہ اس توپ کو کھینچنے کے لئے سات سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اس کے بھرنے کے لئے دو گھنٹے چاہیے تھے جب محمد فاتح قسطنطنیہ فتح کرنے چلا تو اس کی قیادت میں تین لاکھ سپاہی تھے اور زبردست توپخانہ اس کا بحری بیڑہ جو قسطنطنیہ کا سمندر کی جانب سے محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک سو بیس جنگی کشتیوں پر مشتمل تھا اس نے اپنی عقل و اجتہاد سے یہ تجویز کیا کہ جنگی بیڑہ کا ایک حصہ خشکی کے ذریعے خلیج تک پہنچایا جائے اس نے لکڑیوں پر چربی مل کر ستر جہاز قاسم پاشا کی سمت سے سمندر میں اتار دیئے۔

محمد فاتح سے یورپ اس قدر مرعوب اور خوف زدہ تھا کہ اس کے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشن مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ تین روز تک مسلسل شکرانہ کی نمازیں پڑھی جائیں۔

ترکوں کی خصوصیات

مسلمان ترکی قوم میں درحقیقت کچھ ایسی خصوصیات تھیں جن سے وہ مسلمانوں کی قیادت کی مستحق تھی۔

۱۔ وہ ایک بلند حوصلہ پرجوش اور زندہ قوم تھی جس میں جہاد کی روح تھی اور جو بدویت کی زندگی اور سادگی سے قریب العہد ہونے کی وجہ سے ان اخلاقی اور اجتماعی امراض سے محفوظ تھی جن میں اسلامی قومیں مشرق میں مبتلا ہو کر کمزور ہو چکی تھیں۔

۲۔ اس کے پاس ایسی جنگی طاقت تھی جس سے وہ اسلام کے مادی اور روحانی تسلط کو پھیلا سکے

۱؎ خلاصہ تاریخ عثمان (از محمد جمیل بیہم) صفحہ ۲۴

اور حریف قوموں کی دست درازیوں کو روک سکے اور دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہو سکے۔
ایک وقت میں عثمانی سلاطین تین براعظم یورپ ایشیا اور افریقہ میں حکومت کرتے تھے اسلامی مشرق ایران سے مراکش تک ان کے زیر فرمان تھا، ایشیائے کوچک کو وہ زیر کر چکے تھے اور یورپ میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ویانا کی دیواروں تک پہونچ گئے تھے بحر متوسط کے وہ تنہا مالک تھے جس پر کسی دوسری قوم یا سلطنت کا کوئی اثر نہ تھا، پطرس اعظم (PETER THE GREAT) کے معتمد نے ایک مرتبہ قسطنطنیہ سے قیصر کو لکھا تھا کہ سلطان بحر اسود کو اپنا گھر سمجھتے ہیں جس میں کسی غیر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ترکوں کے بحری بیڑہ کا مقابلہ سارا یورپ مل کر بھی نہیں کر سکتا تھا، ۱۵۳۸ء میں پاپائے اعظم، وینس، اسپین، پرتگال اور مالٹا کی متحدہ بحری طاقت نے اس بیڑہ کو شکست دینی چاہی لیکن شکست کھائی، سلیمان اعظم کے زمانہ میں ترکوں کو بحری و بری، اور سیاسی اور روحانی اقتدار حاصل تھا اس کے زمانہ میں عثمانی حکومت کے حدود شمال میں دریائے ساوا (SAVA) جنوب میں نیل کے دہانہ اور بحر ہند تک، مشرق میں قفقاز کے سلسلہ کوہ اور مغرب میں کوہ اطلس تک پہونچ گئے تھے اور چار لاکھ مربع میل کا رقبہ اس کے زیر حکومت تھا، سلطنت عثمانیہ کا بحری بیڑہ تین ہزار فوجی جہازوں پر مشتمل تھا، روم کے علاوہ قدیم دنیا کا ہر مشہور شہر حکومت عثمانیہ کے زیر فرمان تھا۔[1]

یورپ سارا ان سے ہیبت زدہ تھا اس کے بڑے بڑے بادشاہ عثمانی سلاطین کی حفاظت اور پناہ میں داخل ہوتے تھے ان کے احترام میں کلیساؤں کے گھنٹے بند ہو جاتے تھے۔

۳- بین الاقوامی قیادت کے لئے ان کو بہترین جغرافیائی مرکز حاصل تھا، وہ جزیرہ نمائے بلقان سے بیک وقت ایشیا اور یورپ کی نگرانی کر سکتے تھے ان کا دارالسلطنت بحر اسود اور بحر ابیض کے

۱؎ تلخیص از تاریخ عثمانی محمد جمیل بیگ ج ۱ ص [illegible]

درمیان واقع اور ایشیا اور یورپ کی خشکیوں کا نقطۂ اتصال تھا، اس لئے ایک ایسی حکومت کا جس کو تینوں براعظم (یورپ، ایشیا اور افریقہ) کی بیک وقت نگرانی کرنی تھی وہ بہترین پایۂ تخت تھا، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر کبھی ساری دنیا کی ایک متحدہ حکومت قائم ہوئی تو قسطنطنیہ ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کا دارالسلطنت بنے۔"[1]

وہ یورپ میں تھے اور یورپ کو مستقبل قریب میں بڑی اہمیت اور حیثیت حاصل ہونے والی تھی، زندگی کی طاقتیں اور ترقی کے محرکات و عناصر اس کے سینہ میں ابل رہے تھے، اگر اللہ توفیق دیتا تو ترکوں کے لئے یہ ممکن تھا کہ علم و عقل کے میدان میں پیش قدمی کریں، اور یورپ کی عیسائی قوموں سے بازی لے جائیں اور دنیا کے پیشوا بن کر اس سے پہلے کہ یورپ دنیا کی عنان قیادت ہاتھ میں لے کر اس کو ہلاکت و تباہی کی طرف لے جائے، وہ اس کو حق و ہدایت کی منزل کی طرف جس کا نشان اُن کو اسلام کے طفیل میں مل چکا تھا لے چلیں۔

ترکوں کا تنزل

لیکن ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی و عروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل و انحطاط شروع ہو گیا اور قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہو گئے، آپس میں حسد و بغض کا نشوونما ہوا، بادشاہ مستبد اور جابر ہونے لگے، حکمرانوں کی تربیت کا انتظام بگڑ گیا، اخلاق میں انحطاط شروع ہو گیا، حکام اور سپہ سالار قوم و سلطنت سے خیانت اور غداری کرنے لگے، قوم میں راحت طلبی اور عافیت کوشی پیدا ہو گئی، غرض زوال پذیر قوموں کی وہ تمام صفات پیدا ہو گئیں جن کی تفصیل ترکوں کی تاریخ کی کتابوں میں ہے اور یہ اس کا موقع نہیں۔[2]

---

[1] فلسفہ تاریخ اسلامی از محمد جمیل بیہم ص ۱۵۶

[2] ایضاً

ترکوں کا جمود اور پسماندگی

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ و عسکری تنظیم و ترقی میں بھی۔ قرآن مجید کی یہ آیت انھوں نے بالکل فراموش کر دی۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ	مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت
وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ	پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے
بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ	مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا رکھو
وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ	کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے
(الانفال ۔ ۸)	دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے نیز ان
	لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔

اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے حافظے سے گویا محو ہو گیا تھا۔ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیث وجدھا فھو احق بھا (دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں اس کو مل جائے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے) ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے ان کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی وہ وصیت پیش نظر رکھنی چاہئے تھی جو انھوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ:

"اس بات کو کبھی نہ بھولو کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو اور ایک اہم ناکے پر کھڑے ہوئے ہو اس لئے تم کو ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہئے کیونکہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں"[1]

---

[1] تاریخ مصر، جرجی زیدان۔

لیکن افسوس ہے کہ ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے وہ اپنی جگہ پر رہے اور یورپین قومیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ مشہور ترکی فاضلہ خالدہ ادیب خانم نے ترکوں کے اس علمی اور تعلیمی جمود کا بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے' وہ کہتی ہیں :۔

"جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی ترکی کے علماء اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے' مدرسۂ سلیمانیہ اور مدرسۂ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے' مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم و حکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی' یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا' یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظام تعلیم پر حاوی رہا' ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے علماء کا یہ طرز خیال حقیقتاً اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا' فلسفہ کلام یا علم کلام خواہ وہ عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا یونانیوں کے فلسفہ پر مبنی ہے' اس پر کم و بیش ارسطو کے خیالات کا رنگ غالب ہے جو ایک وثنی فلسفی تھا' یہاں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم مختصر الفاظ میں عیسائی علماء اور مسلمان علماء کے طرز خیال کا مقابلہ کریں۔

قرآن کریم میں عالم طبیعی کی تخلیق کے مسئلہ کا کہیں تفصیل سے ذکر نہیں ہے' اس کی تعلیم میں زیادہ اہمیت اخلاقی و معاشرتی زندگی کو دی گئی ہے' اس کا خاص مقصد حسن و قبح' خیر و شر میں امتیاز کرنا ہے وہ دنیا کے لئے ایک قانون عمل لے کر آیا ہے' مابعد الطبیعی مسائل اور روحانی معارف بھی جہاں کہیں بیان کئے گئے ہیں' ان میں کوئی پیچیدگی یا اشکال نہیں' اس کی بنیادی تعلیم توحید ہے' اسی وجہ سے اسلام ایک نہایت ہی سادہ

مذہب کا اندازہ اس میں اور مذاہب سے کہیں زیادہ اس کی گنجائش ہے کہ عالم طبیعی کے نئے نظریات کو قبول کر سکے مگر یہ سادگی اور وسعت نظر جو شیخ علمی تحقیقات کے لئے اس قدر سازگار تھی کہ مسلمانوں میں زیادہ دن قائم نہ رہ سکی چنانچہ پانچویں صدی میں علماء اور متکلمین نے صرف فقہ بلکہ الٰہیات کو بھی اصول و ضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا یعنی تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔ اسی زمانہ میں اسلامی فلسفہ میں ارسطو کے خیالات داخل ہوگئے۔

بخلاف اس کے دین عیسوی میں جیسے مسیح کے مذہب کی بجائے سینٹ پال کا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے کتاب پیدائش کے اندر عالم طبیعی کی مفصل تفسیر موجود ہے جب اُن لوگوں نے خدا کا کلام تسلیم کر چکے تھے اس لئے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اس تفسیر عالم کی حقانیت کو ثابت کریں اس تاویل میں مشاہدہ ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اس لئے استدلال سے مدد لینا پڑی ارسطو کا دامن انھوں نے اس لئے پکڑا کہ اس کی منطق سحر کی سی خاصیت رکھتی تھی۔

جب مغرب نے فطرت کا مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ تحلیل اور تجزیہ کے ذریعے کرنا شروع کیا تو ارباب کلیسا کے ہوش اُڑ گئے ادھر نئے علمی طریقوں کی مدد سے بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے ادھر عیسائی علماء کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اب کلیسا کی حکومت کا خاتمہ ہے چنانچہ مغرب میں اس دور کا آغاز ہوا جس میں بڑے بڑے سائنسدان جو عالم طبیعی کے دائرہ کے اندر تحقیق میں مصروف تھے قتل کر دیئے جاتے تھے۔

سائنس اور مذہب کے خونریز معرکوں کے بعد آخر عیسوی کلیسا کو شکست تسلیم کرنا پڑی اس نے اپنے مدارس اور کلیسوں کے نصاب میں سائنس کو داخل کر لیا اس کی وجہ روشنیاں جو پہلے . لیکن اسلامی مدارس کی طرح فلسفہ سائنس اور علوم جدیدہ کا مرکز

بن گئیں، مگر اس کے ساتھ اس نے ارسطاطالیسی فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کا اثر تعلیم یافتہ طبقہ کے کم سے کم ایک عنصر پر بدستور باقی رہا، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادری نئے علوم پر عبور رکھتے تھے اور نئے زمانہ کے نوجوانوں سے ہر موضوع پر بحث کر سکتے تھے۔

عثمانیوں کے یہاں علماء کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی، انھوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا، جب تک کہ مکتب اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا، ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ رشد و ہدایت اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت نہ تھی، اسہل تو یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں، چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔[1]

عالم اسلام کا عام ذہنی و علمی انحطاط

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، دماغ تھکے تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں اور ایک عالمگیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتدا ذکر کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی ہجری

---

[1] ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش، از خالدہ ادیب خانم۔

وہ آٹھویں صدی تھی جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب و شاعری، حکمت و فن میں ندرت و تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہی وہ صدی ہے جس میں مقدمہ ابن خلدون جیسی انقلابی تصنیف عالم اسلام کو حاصل ہوئی۔ دسویں صدی سے بہت واضح طور پر افسردگی، خستگی، تقلید اور عدم توانائی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ افسردگی اور اضمحلال کسی خاص شعبہ اور کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، دینی علوم، شعر و ادب، انشا و تاریخ، تعلیمی نصاب، نظام سب کے سب کم و بیش اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھئے۔ سیکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (GENIUS) کے لقب کا اطلاق درست ہو، جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو یا کسی خاص علم میں اس نے کوئی گرانقدر اضافہ کیا ہو۔ پچھلی صدیوں میں ہم بمشکل چند افراد کا استثناء کر سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کی عام علمی و ذہنی سطح سے بہت بلند تھے اور جنھوں نے دینی یا علمی دائرہ میں کوئی بڑا انقلابی کارنامہ یا علمی شاہکار پیش کیا ہے۔ خوش قسمتی سے ان تمام مستثنیٰ افراد کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے، ان میں سے ایک حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) ہیں جن کے مکتوبات اسلام کے علمی و دینی سرمایہ میں ایک قیمتی اضافہ ہیں اور جنھوں نے پورے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) ہیں جن کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ"، "ازالۃ الخفا"، "الفوز الکبیر" اور "رسالہ الانصاف" اپنے اپنے موضوع پر بالکل منفرد تصنیفات ہیں۔ تیسرے ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) جنھوں نے اپنی تصنیف "تکمیل الاذہان" اور رسالہ "اسرار المحبۃ" میں بعض نئے خیالات کا اظہار کیا، چوتھے شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ (ش ۱۲۴۶ھ) جن کی کتاب "منصب امامت" اور "عبقات" اجتہادی شان رکھتی ہے اور اپنے اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ اسی طرح فرنگی محل کا خاندان اور یورپ کے بعض تعلیمی سلسلے اپنی ذکاوت و ذہانت

میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں اور انھوں نے اپنے وقت کے تعلیمی حلقوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، مگر ان کی ذہانت اور علمی کمالات دینیات کے دائرہ سے بہت کم تجاوز کرتے ہیں۔

صرف علم دین پر منحصر نہیں، ادب و شاعری بھی اپنی زندگی اور توانائی کھو چکی تھی اور اس پر بھی تقلید و تصنع کا غلبہ تھا، نثر و انشا پردازی کو تکلف و تصنع، قافیہ پیمائی، لفظی صناعی اور عبارت آرائی نے بے رونق اور بے روح بنا رکھا تھا، دوستوں کے خطوط، تاریخ کی کتابیں اور دفتری تحریریں اور فرامین بھی اس عیب سے پاک نہیں تھے، کہیں کہیں ادب و انشا کا کوئی ایسا نمونہ مل جاتا ہے جو اس زمانہ کے مذاقِ عام سے الگ اور پست سطح سے بلند نظر آتا ہے۔

تعلیمی حلقے اور مدارس سخت جمود و تقلید کا شکار اور ایک علمی و فکری انحطاط میں گرفتار نظر آتے ہیں، متقدمین کی علم آموز اور ذوق آفریں کتابیں نصابِ تعلیم سے رفتہ رفتہ خارج کر دی گئیں، اُن کی جگہ پر ان متاخرین کی کتابیں آگئیں جو اپنے فن میں درجۂ اجتہاد نہیں رکھتے تھے، اور متقدمین کے صرف مقلد یا شارح تھے، متون کی جگہ شروح و حواشی نے لے لی، ان کی تالیف میں ان کے مصنفین نے کتاب کے بارہ میں سخت کفایت شعاری سے کام لیا تھا اور عام فہم اور واضح زبان کے بجائے اشارات و رموز میں لکھا تھا، اس سب سے اس ذہنی و علمی انحطاط اور پستی کا اندازہ ہوگا جو پورے عالمِ اسلام پر طاری تھی، اور جس سے اس کا کوئی گوشہ اور زندگی کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں تھا۔

ترکوں کے مشرقی معاصر

دولتِ عثمانیہ کی ہمعصر و ہمسر دو طاقتور مشرقی حکومتیں تھیں، ہندوستان میں مغلیہ سلطنت جس کی بنیاد ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں بابر کے مضبوط ہاتھوں سے پڑی تھی، جو سلطان سلیم اول کا معاصر تھا،

اور جس کے تخت پر بیٹھنے کے بعد یکے بعد دیگرے طاقتور بادشاہ آئے ترکی کے بعد مشرق کی سب سے بڑی عظمت اور پرشکوہ سلطنت تھی یہ اسی خاندان کا آخری طاقتور بادشاہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر تھا جو سلطنت کی وسعت فتوحات کی کثرت شہرت اور دینداری اور دینی علم اور اولوالعزمی میں ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے اورنگ زیب۔ ۹۰ سال سے زائد عمر پائی اور مسلسل پچاس برس حکومت کی اس کی وفات ۱۱۱۸ھ یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی یہ زمانہ یورپ کی بیداری اور تعمیر و ترقی کا خاص دور ہے لیکن بدقسمتی سے اورنگ زیب کے سب جانشین نااہل پست ہمت اور عیش پسند نکلے وہ یورپ کے خطرات کا مقابلہ اور امت اسلامیہ کی حفاظت کرنے کے اہل تو کیا ثابت ہوتے اپنے ملک و سلطنت کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور بالآخر اپنی نااہلی کمزوری اور نااتفاقی سے انگریزی حکومت کے قیام و استحکام انگلستان کی ترقی و تمول اور صنعتی انقلاب کا باعث ہوئے اور بالواسطہ اکثر اسلامی ممالک کی غلامی کا سبب بنے[1]۔

---

[1] بروکس ایڈمز اپنی کتاب قانون تہذیب انحطاط کے صفحہ ۲۶۳-۲۶۴ پر لکھتا ہے: جنگ پلاسی کے بعد بنگال کا مال غنیمت لندن پہنچنا شروع ہوا اور اس کا نتیجہ بھی بہت جلد رونما ہوا کیونکہ صنعتی انقلاب جس کے اثرات آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں نمایاں ہیں شاید وجود میں نہ آتا اگر پلاسی کی لڑائی نہ ہوئی ہوتی کیونکہ ہندوستان ہی کا خزانہ اس کا محرک و معاون ہوا (۲) جب ہندوستان کا خزانہ انگلستان پہنچنا شروع ہوا اور سرمایہ میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو اس تحریک میں بہت جلد ایک روح پیدا ہو گئی (۳) جب سے دنیا وجود میں آئی ہے شاید کسی روپے سے اتنا منافع حاصل نہیں ہوا جتنا ہندوستان کے مال غنیمت سے ہوا کیونکہ تقریباً پچاس برس تک انگلستان کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے: پلاسی کی لڑائی سے پہلے جب تک ہندوستان کے خزانے وصول ہو کر انگلستان نہیں آنے لگے تھے ہمارے ملک کا ستارہ عروج پر نہیں تھا (یہ حقیقت ہے) کہ انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال کی بے شمار دولت اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی۔ ([illegible])

دوسری بڑی مشرقی حکومت ایران کی صفوی سلطنت ہے جو ایک بڑی متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت تھی لیکن شیعیت کے غلو و تعصب و دینی حکومت سے نبرد آزمائی نے اس کو کسی اور کام کی فرصت نہ دی اور وہ بہترین زمانہ جو یورپ کی تعمیر و تنظیم کا تھا، عثمانی ترکی حکومت کے حدود پر حملہ کرنے اور کبھی اپنی حفاظت و مدافعت میں گزر گیا۔

یہ دونوں سلطنتیں اپنے مسائل و معاملات میں ایسی الجھی ہوئی تھیں اور بیرونی دنیا سے اتنی بے تعلق و بے خبر تھیں کہ ان کو یورپ و ہندوستان کے ممالک کا تو ذکر کیا ہے مشرق اوسط اور اسلامی ممالک کے حالات و واقعات کی خبر بھی کم رہتی، اسلامی سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور رابطے اور پورے اسلامی ممالک کا اتحاد قائم کرنے کا مسئلہ تو شاید ان حکومتوں کے ذمہ داروں کے کبھی خیال میں بھی آیا ہو، یہ بات نہیں آئی تھی کہ مشرق کی ان حکومتوں سے امید ہو سکتی تھی یورپ کی تعلیمی اور جنگی حالات کا مطالعہ اور بیرونی ممالک سے علمی و صنعتی استفادہ تو بہت دور کی بات تھی جس کی طرف کسی کا خیال جانا بھی مشکل تھا۔

اولوالعزم افراد

اس دور خزاں میں بھی اسلام کا درخت برگ و بار لاتا رہا اور خزاں میں اس نے بعض ایسے پھول اور پھل پیدا کئے جن کی مثال موسم بہار میں بھی بکثرت نہیں ملتی اور جن کی نظیر سے دوسری قوموں کی تاریخ خالی ہے یہ دور قومی انحطاط و اضمحلال لیکن انفرادی عزیمت اور شخصی جدوجہد کا دور نظر آتا ہے مختلف ممالک میں ایسے صاحب عزم بلند حوصلہ اور بیدار مغز قائد اور مجاہد پیدا ہوئے جنہوں نے ان آمادۂ زوال اور رو بہ انحطاط قوموں اور ملکوں میں کچھ عرصہ کے لئے نئی زندگی پیدا کر دی، ہندوستان پر سلطان ٹیپو جیسا عالی ہمت بلند نظر اور غیور بادشاہ پیدا ہوا جو قریب تھا کہ ہندوستان کو غیر ملکی خطرے سے پاک کر دے دوسری طرف حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا صاحب عزیمت اور پُر تاثیر داعی

اور مجاہد پیدا ہوا جو خلافتِ راشدہ کے اصول و منہاج پر ایسی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا
تھا جس کا حلقہ ہندوستان سے بخارا تک وسیع تھا۔ اس کی دعوت و تربیت نے ہزاروں کی تعداد
میں ایسے بلند سیرت مجاہد جو صدق، ایثار پیشہ داعی اور سپاہی پیدا کر دیئے جنہوں نے اپنے ایمان
یقین، للہیت و خلوص اور دینی جوش و حمیت سے "قرونِ اولیٰ" کی یاد تازہ کر دی، لیکن
قومی انحطاط، اجتماعی پراگندگی اور بے نظمی اور سیاسی بے شعوری اس درجہ کو پہونچ چکی تھی کہ
ایسی عظیم اور مثالی شخصیتیں بھی مسلمانوں کے حالات اور ان کے تنزل و انحطاط کی رفتار میں کوئی
بڑی تبدیلی نہ پیدا کر سکیں اور امت بحیثیت مجموعی ان مجاہدانہ اور تجدیدی کوششوں سے فائدہ
نہ اٹھا سکی۔

یورپ کی صنعتی و طبیعیاتی ترقیاں

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی ایسے ترک، تنزل و انحطاط، علمی پسماندگی اور
جمود کا شکار ہو چکے تھے۔ تاریخِ انسانی کا یہ وہ اہم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے
یورپ اس دیرینہ لمبی نیند سے بیدار ہو چکا تھا اور ایک جوش و جنون کی حالت میں اپنی غفلت اور
جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبۂ حیات میں برق رفتاری سے ترقی کر رہا تھا،
طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اسرار کو منکشف اور نئے معلوم حقائق اور نئے اقلیموں کو دریافت
کر رہا تھا۔ ہر علم و فن میں اس کی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے انکشافات جاری تھے
اس مختصر سی مدت میں اس کے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہد فن پیدا ہوئے کوپرنیکس
COPERNICUS برونو BRUNOE گیلیلو GALILEO کیپلر (KEPLER) اور نیوٹن NEWTON
وہ عالم اور محقق تھے جنہوں نے ریاضیات و طبیعیات کا ایک جدید نظام پیدا کر دیا، بیانوں اور مجاہدانہ

کولمبس COLUMBUS واسکوڈی گاما (VASCO DA GAMA) اور میگلن (MAGUIN) جیسے عالی ہمت اور اولوالعزم پیدا ہوئے جنھوں نے نئی دنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کئے۔

قوموں کی تاریخ اس دور میں نئے سرے سے ڈھل رہی تھی اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ کتنی کتنی دن اور ایک ایک دن کتنی کتنی برس کے برابر تھا جس نے فرصت و تیاری کا ایک لمحہ کھو دیا اس نے ایک طویل زمانہ ضائع کر دیا افسوس ہے کہ مسلمان قوموں نے اس وقت لمحات ضائع نہیں کئے بلکہ صدیاں ضائع کیں اور یورپین قوموں نے ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا اور صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کی۔

علم و صنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سولہویں صدی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی اٹھارویں صدی عیسوی میں ترکی پریس و مطابع، حفظان صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم کے نئے طرز کے مدارس سے روشناس ہوا اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ (BALOON) کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھا نہ صرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ترکی سے اس میدان میں بازی لے جا چکی تھیں بلکہ مصر بھی بعض مفید چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کر چکا تھا ترکی سے چار سال پہلے مصر میں ریلوے کا نظام قائم ہو چکا تھا ڈاک کے ٹکٹ بھی ترکی سے چند مہینے پہلے مصر میں رائج ہو چکے تھے۔[1]

جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا نمائندہ تھا تو دوسرے عربی و اسلامی ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ان ملکوں میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی (VOLNEY) نے

---

[1] نئی ایجادات کی تاریخ مطبوعہ دار الہلال مصر۔

(جس نے اٹھارویں صدی میں مصر کی سیر کی ہے اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے) اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہیں کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا۔"[1]

پھر مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت و علوم نظریہ اور صنعت و حرفت ہی میں نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر و ہمہ پہلو انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا حتیٰ کہ وہ اپنے فنون جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے تھے حالانکہ ترکوں کو درجۂ امامت و اجتہاد حاصل تھا اور ان ہی کی فوقیت کا دنیا کو اعتراف تھا لیکن یورپ اپنی ایجاد و اجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت بڑھ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ ترک جنگی طاقت میں یورپ کی عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس واقعہ سے حکومت عثمانی کی کچھ آنکھیں کھلیں، اور اس نے چند یورپین ماہرین فن کی خدمات حاصل کر کے فوج کی از سر نو تنظیم و تربیت کا کام شروع کیا۔ لیکن اصلاح و ترقی کا اصل قدم سلطان سلیم ثالث نے (جس کی تعلیم شاہانہ با تعلیم و تربیت ہوئی تھی) انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا۔ نئے طرز کے مدارس قائم کیے جن میں سے انجینئرنگ کالج میں وہ خود تعلیم دیتا تھا۔ نظام جدید کے نام سے ایک نئی فوج کی بنیاد بھی ڈالی اور سیاسی نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں لیکن قوم اور سلطنت کے جمود کا یہ حال تھا کہ پرانی فوج نے بلوہ کر کے سلطان کو قتل کر ڈالا۔ اس اصلاحی مہم میں محمود ثانی نے (۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۹ء تک حکومت کی) اور اس کے بعد عبدالمجید اول (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء) نے جانشینی کی اور ترکی نے ترقی کے کچھ قدم بڑھائے۔

---

[1] زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث (ڈاکٹر احمد امین) ص

ترقی کے میدان میں مسلمان ترکی نے جو فاصلہ طے کیا ذرا اس کا مقابلہ اس فاصلہ سے کیجئے جو یورپ نے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں طے کیا، ترقی کے میدان میں ان دونوں کی دوڑ میں کچھوے اور خرگوش کا مقابلہ تھا، فرق اتنا ہے کہ خرگوش برابر بیدار اور مشغول تھا اور کچھوا اپنی سست رفتاری کے باوجود کبھی کبھی سو بھی جاتا تھا۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مراکش، الجزائر، مصر، ہندوستان اور ترکستان میں مشرق کی مسلمان اقوام اور مغربی قوموں اور طاقتوں کے درمیان جو معرکے پیش آئے ان کا فیصلہ دراصل سولھویں اور سترھویں صدی میں ہو گیا تھا، اور اسی وقت ان کے نتیجہ کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔

باب پنجم

بین الاقوامی سیادت و قیادت کا مغربی عہد اور اس کے اثرات

ترکوں کے تنزل و انحطاط سے عالمگیر طاقت و اقتدار اور ذہنی اور تہذیبی قیادت یورپ کی غیر مسلم قوموں کی طرف منتقل ہو گئی جنہوں نے عرصۂ دراز سے اس کی تیاری کی تھی اور جن کی کوئی حریف مساوی درجہ کی طاقت میدان میں نہ تھی، مغرب سے مشرق تک کوئی ملک ان کے اثر اور نفوذ سے خارج نہ رہا، قومیں یا تو مادی اور سیاسی حیثیت سے ان کی غلام اور زیر فرمان تھیں، یا ذہنی، علمی اور تہذیبی حیثیت سے زیر اثر اور زیر اقتدار تھیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان اثرات کا جائزہ لیں جو قیادت کے اس انتقال اور تبدیلی نے دنیا کی ذہنیت، قوموں کے اخلاق، تمدن و اجتماع، اور انسانی میلانات و رجحانات میں پیدا کیا، اور اس کا فیصلہ کریں کہ انسانیت کو اس انقلاب سے کیا فائدہ پہونچا یا نقصان، یہ ضروری ہے کہ ہم مغربی تمدن کی فطرت، ساخت اور روح کو اور ان مغربی قوموں کے فلسفۂ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کیسے پیدا ہوا اور اس نے کس طرح نشو و نما حاصل کی۔

مغربی تہذیب کا شجرہ نسب

بیسویں صدی کی مغربی تہذیب (جیسا کہ بعض سطحی النظر سمجھتے ہیں) کوئی ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں ہوئی ہے دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال کی پرانی ہے اس کا نسبی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ اور عقلی و علمی سرمایہ چھوڑا تھا اس کے حصہ میں آیا اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئے۔

یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی یہ پہلا تمدن تھا جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوا اور اس میں مغربی نفسیات کا پورے طور پر ظہور ہوا۔ یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی جس میں ایک ہی مغربی روح کام کر رہی تھی مغربی قومیں صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج، ان کے فلسفہ، علوم و ادب اور افکار کو سینہ سے لگائے رہیں انیسویں صدی میں انہیں خصوصیات کے ساتھ انھوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا، اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔

اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم پہلے یونانی اور رومی تہذیب سے واقفیت پیدا کریں اور ان کے مزاج اور روح کو پہچان لیں تاکہ ہم بصیرت کے ساتھ بیسویں صدی کی مغربی تہذیب کی تنقید کر سکیں۔

یونانی تہذیب

یونانی تہذیب کی تحلیل و تنقید کرنے سے ان اجزاء کو نظر انداز کر دینے کے بعد جو اس میں

بلکہ فروعات اور مظاہر ہیں اور جو عام انسانی تہذیبوں کے درمیان مشترک ہیں۔ اس کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔

۲۔ خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳۔ دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد و لذائذ کا اہتمام شدید۔

۴۔ حبِّ وطن میں افراط و غلو۔

ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مختصر لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے تنہا "مادیت" کا لفظ کافی ہے۔ پس یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز "مادیت" ہے۔ یونانیوں کا علم فلسفہ شاعری حتی کہ دین سب ان کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور خلعت مادیت اور انسانی شکل کے بغیر نہ کرسکا۔ انھوں نے ان صفات کے مجسمے تراشے اور ان کے لئے معبد تعمیر کئے تاکہ محسوس طریقہ پر ان سے تعلق رکھیں۔ ان کے ہاں ایک روزی کا دیوتا تھا، ایک رحمت کا اور ایک قہر و عذاب کا۔ پھر ان کی طرف انھوں نے مادی جسم کے تمام خصوصیات اور متعلقات منسوب کئے اور ان کے گرد قصے کہانیوں کا ایک جال پھیلا دیا۔ انھوں نے معانی مجردہ کو بھی اجسام و اشکال کی شکل میں پیش کیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک محبت کا ایک دیوتا تھا اور ایک حسن کا۔ ارسطو کے فلسفہ میں عقولِ عشرہ اور افلاکِ تسعہ کا جو مجموعہ ملتا ہے وہ بھی اسی مادی عقلیت کا کرشمہ ہے جس کے اثر سے یونانی فطرت کبھی آزاد نہیں ہونے پائی۔

مغربی علماء نے بھی یونانی تہذیب میں مادیت کے غلبہ کو تسلیم کیا ہے اور اپنی تصنیفات اور علمی مباحث میں اس کی طرف توجہ کی ہے۔ چند سال پہلے ڈاکٹر آس نے جنیوا میں "یورپی تمدن کیا ہے؟" کے عنوان سے تین لیکچر دیئے تھے۔ ان کا ایک اقتباس رسالہ ادیب عالم کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے:-

موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا۔ اس کا اصل اصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشو و نما اور سب سے بڑا حسن خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈراما، فلسفہ، سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی، کہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچنے پائے، یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہے نہ باطنیت کا، نہ علم دین ہے نہ پیشوایان دین کا طبقہ۔

متعدد مغربی علماء نے یونانیوں کی دینی کمزوری اور اس کی بے اثری، خشیت و خوف اور غمی کے اعمال و رسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف لیکی لکھتا ہے کہ یونانی تحریک تمام تر عقلی اور ریاضی تھی برخلاف اس کے مصری تحریک یکسر روحانی و باطنی تھی، وہ رومی مصنف اپولیس کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "مصری دیوتاؤں کی عزت آہ و زاری سے ہوتی اور یونانی دیوتاؤں کی رقص و سرود سے" پھر خود کہتا ہے کہ "اس میں شبہ نہیں کہ اس مقولہ کے آخری جزء کی تصدیق تاریخ یونان میں قدم قدم پر ہوتی ہے درحقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن، کھیل اور تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی اس میں اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے جتنا اس میں، اس مذہب میں خدا کا تقدس اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے بالکل کافی تھا"[1]

لیکن یہ حقیقت قطعاً ناقابل استعجاب نہیں، مغرب کی مادہ پرست اور محسوسات

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ از لیکی ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی صفحہ ۲۴۹-۲۵۶

فطرت و مزاج کے علاوہ یونانیوں کا فلسفۂ الٰہیات اور اس کے عقائد کی ساخت کچھ ایسی
واقع ہوئی تھی کہ خشوع و خضوع، انابت اور حُب الٰی اللہ کی کیفیت اُن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی
تھی۔ ذاتِ باری کے تمام صفات ہر قسم کے اختیار، فعل و تصرف اور خلق و امر کی نفی کرنے اور اس کو
بالکل بے صفت اور معطل قرار دینے اور اس کائنات کی پیدائش و انتظام کو اپنے خود تراشیدہ اور
مفروضہ عقولِ عشرہ کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ کرنے کا نتیجہ [illegible] یہی ہو سکتا ہے کہ
زندگی میں خدا کی کوئی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق اور دلچسپی باقی نہ رہ جائے، نہ اس سے
کوئی امید ہو، نہ اس کا کوئی خوف، نہ دل میں اس کی ہیبت ہو، نہ محبت، اور نہ عجز و
مصیبت کے وقت اس سے دعا و التجا ہو، اس لئے کہ وہ اس فلسفہ کے مطابق ایک بالکل
معزول و معطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت، وہ عقلِ اول
پیدا کر کے عالم سے بالکل بے تعلق و کنارہ کش ہو گیا، اس لئے اس عقیدہ کے ماننے والوں کی زندگی خدا
ایسی گزرتی ہے اور گزرنی چاہئے کہ گویا خدا نہیں ہے اور [illegible] خدا کی زندگی سے [illegible]
بیان ہے کہ خدا نے عقلِ اول کو پیدا کیا ہے، وہ کسی حیثیت سے [illegible] جب ہم دیکھتے ہیں کہ
یونانیوں میں خشوع اور خضوع کی کمی تھی اور ان کی عبادات اور دعائیں ایک قالبِ بے روح
سے زیادہ نہ تھے اور وہ یہ کہ خدا کی بزرگی سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے تو ہم کو ذرا بھی تعجب
نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ "تاریخ میں آدمی سیکڑوں صناعوں اور شہسواروں کا تذکرہ پڑھتا ہے
لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع و خضوع اور ان سے بندگی کا رابطہ نہیں پیدا
ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خدا کو اس کائنات میں متصرف ہو کر مانا اور
اپنے کو اس کا محتاج سمجھے۔

دنیوی زندگی کے انتہائی شوق و محبت، اس کی قدر و قیمت میں افراط و غلو، جسم پرستی اور

تصاویر کے شغف، سرود و موسیقی کے انہماک، فنونِ لطیفہ کی قدردانی، اور غیر محدود شخصی آزادی پر مبالغہ آمیز زور دینے سے یونانی اخلاق و معاشرت پر بُرا اثر پڑا، اخلاقی ابتری اور ہر نظام کے خلاف بغاوت و احتجاج روزمرہ کا فیشن بن گیا، خواہشاتِ نفس کی پیروی، زندگی سے زیادہ سے زیادہ تمتّع اور لطف اندوزی اور بوالہوسی، روشن خیالی اور آزادی کا نشان سمجھا جانے لگا، سقراط ایک جمہوری نوجوان کی سیرت اور طرزِ زندگی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے روشن خیال اور زندہ دل نوجوان کا سراپا اس سے ذرا مختلف نہیں معلوم ہوتا۔

> "اگر اس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے سارے شوق اور خواہشات یکساں قابلِ احترام اور تعمیل کے لائق نہیں، بعض خواہشات پسندیدہ اور لائقِ احترام ہیں، اور ان کی تکمیل و تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں، اور بعض ناروا اور ناپسندیدہ، ان سے اجتناب ہی بہتر ہے اور ان پر پابندی اور بندش عائد کرنا ضروری ہے، وہ شخص اس صحیح قانون کو قبول نہیں کرتا اور اس کے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا، جب اس کے سامنے یہ معقول باتیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ تمسخر کے ساتھ اپنا سر ہلاتا ہے اور بڑے زور کے ساتھ یہ تقریر کرتا ہے کہ انسان کی تمام خواہشات اور اس کے سارے شوق یکساں قابلِ احترام ہیں، اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی بھی گزارتا ہے اور اپنے تمام خواہشاتِ نفس کی تسکین اور اپنے ہر شوق کی تکمیل کرتا رہتا ہے اور جب وقت اس کا جس بات کا جی چاہتا ہے گزرتا ہے، کبھی وہ مدہوش و بدمست نغمہ و سرود میں مشغول ہو گا، اور کبھی اس کو خیال آجائے گا تو برت رکھ کر صرف پانی پینے پر اکتفا کرے گا، کبھی تو جی تربیت اور قواعد سیکھتا ہوا نظر آئے گا، کبھی بالکل بیکار اور سست دکھائی دے گا اور ہر چیز کو بالائے طاق رکھ دے گا، کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگے گا، دوسرے وقت میں سیاسی زندگی میں شریک ہو جائے گا،

اور وقت کے تقاضا کے مطابق تقرر کرتا ہوا سا جائے گا کبھی فوجی لوگوں کی تعریف
کرنے لگے گا اور ان کی طرف اس کا میلان پیدا ہو جائے گا کبھی کاسب تاجر بن کر
کے تجارت شروع کر دے گا غرض اس کی زندگی کا کوئی نظام اور ضابطہ نہیں ہوتا
ہے کہ وہ اس زندگی کو بہت پرلطف اور خوشگوار اور آزاد سمجھتا ہے اور اخیر تک
اسی طرز پر زندگی گزارتا ہے۔[1]

مغربی فطرت اور مزاج کا ایک خاصہ وطن پرستی ہے ایشیا کے مقابلہ میں وطنیت کا
جذبہ یورپ میں زیادہ قوی اور عام ہے اس میں کچھ جغرافیائی حیثیت کا بھی دخل ہے ایشیا میں
طبعی علاقے زیادہ وسیع، مختلف قسم کی آب وہوا، پہاڑ اور دریاؤں کی مختلف قسموں پر مشتمل ہیں
وہ زیادہ زرخیز ہیں اور زندگی کے وسائل کی ان میں فراوانی ہے اس بنا پر عام طور پر ایشیا میں
سلطنت کا میلان فطری طور پر وسعت اور مرکزیت کی طرف ہے اور اس کی سرزمین میں دنیا کی
وسیع ترین سلطنتیں قائم ہوئیں اس کے برخلاف یورپ میں زندگی کی کشمکش نسبتاً شدید اور
مسلسل طریقہ پر پائی جاتی ہے اس کی آبادی گنجان، علاقے تنگ اور وسائل معیشت محدود ہیں،
پہاڑوں اور دریاؤں کی طبعی سرحدوں نے مغربی اقوام کو مستقل تنگ فطری دائروں میں محصور کر دیا
ہے خصوصاً یورپ کا وسطی، مغربی اور جنوبی حصہ وسیع ریاستوں کے نشوونما کے لئے موزوں نہیں
اس لئے قدیم یورپ میں بھی سیاسی تصور شہری ریاستوں سے آگے نہیں بڑھ سکا جن کا رقبہ چند میل
سے زیادہ وسیع نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بالکل خود مختار ہوتی تھیں اس کا سب سے بڑا نمونہ یونان میں
ملتا ہے جہاں قدیم ترین عہد سے بیسیوں چھوٹے چھوٹے خود مختار شہروں کا تذکرہ ملتا ہے۔
اس بنا پر یہ بات قابل استعجاب نہیں کہ یونانی وطنیت پر محکم ایمان رکھتے تھے لیکن

---

[1] "ریاست" افلاطون۔

تسلیم کرتا ہے کہ یونان میں وطنیت ہی کا غلبہ تھا اور جہانیت یا آفاقیت جس کے متعلق کبھی سقراط اور انکساغورس نے اظہار خیال کیا ہے کوئی مقبول خیال اور نصب العین نہ تھا اور اس کے حامی یونان میں بہت کم تھے ارسطو کا سارا نظام اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے اجماع حکماء سے فضائل اخلاق کی جو فہرست تیار کی گئی تھی اس کا عنوان اولین حب الوطنی تھا ارسطو اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں اس طرز خیال کا یونانی حلقوں میں اتنا اثر اور غلبہ ہو گیا تھا کہ جب ایک فلاسفر نے یہ کہا کہ میری ہمدردیوں کا حلقہ صرف میرے ذاتی وطن تک محدود نہیں بلکہ سارے یونان پر محیط ہے تو لوگ حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے۔[1]

رومی تہذیب

یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے اور قوت حکومت کی تنظیم سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں ان سے فوقیت لے گئے لیکن علم و فلسفہ ادب شاعری تہذیب و شائستگی اور تمدن میں وہ یونانیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکے ان چیزوں میں یونانیوں کا سکہ تمام دنیا پر اور خود فاتح رومیوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ رومی ابھی اپنے عسکری دور میں تھے اس لئے انھوں نے طبعی طور پر ذہنی کمالات اور لطافت و نفاست کی باتوں میں یونانیوں ہی کو اپنا امام تسلیم کیا اور انہیں کے علوم فلسفہ اور خیالات کی خوشہ چینی کی لیکی لکھتا ہے کہ یونانی اپنا گرامر، قانون و ادب صدہا سال سے رکھتے آئے تھے دراں حالیکہ روما دور عسکریت میں تنہا جو ادب کا تاثیر تک نہیں رکھتا تھا بلکہ جس کی زبان تک ادائے مطلب و خیالات عالیہ کی ترجمانی پر قاصر تھی

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ صفحہ ۱۸۹، ۱۸۴

روما کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یونانی تمدن سے مغلوب ہو جائے اور ہر شعبۂ علم میں اس سے مرعوب ہے چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قدیم ترین رومی مورخین یونانی ہی زبان میں تصنیف کرتے تھے اور یہ دستور عرصۂ دراز تک قائم رہا اور اکیلی تصانیف اور تالیف پر کیا موقوف ہے اطوار و خصائل، طرز معاشرت، جذبات و احساسات غرض ہر شعبۂ حیات میں یونانی تمدن رومی تمدن پر غالب آگیا، رومی بلا تکلف یونانیوں کی تقلید کرتے تھے اور اسی تقلید پر فخر کرتے تھے۔[1]

اسی طرح علم و ادب اور عادات و اخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا فلسفہ اور تجربہ بلکہ یونانی نفسیات رومیوں میں منتقل ہو گئی اور ان کے رگ و پے میں پیوست ہو گئی۔ یوں بھی رومی اپنا مذاق فطرت و مزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں کچھ زیادہ مختلف نہ تھے زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں دونوں کے درمیان بڑی حد تک مشابہت تھی، خصوصاً رومی بھی یقین کرنے کے عادی تھے، زندگی کی قدر و قیمت میں یہاں بھی اتنا ہی غلو اور افراط تھا، دینی عقائد و حقائق کے بارہ میں یہ بھی بہت ضعیف الایمان اور آزاد خیال تھے، مذہبی نظام اور مذہبی اعمال و رسوم کا کوئی خاص احترام اور وقار نہ تھا، قومیت اور وطنیت میں یہاں بھی شدت اور مبالغہ پایا جاتا تھا مزید یہ کہ طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہونچا ہوا تھا۔

رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی اپنے مذہب و عقائد میں راسخ الایمان نہ تھے اور درحقیقت وہ اس بارہ میں معذور بھی ہیں اس لئے کہ جو مشرکانہ اور وہم پرستانہ مذہب روم میں رائج تھا اس کا مقتضا یہ تھا کہ رومی علم میں جس قدر ترقی کرتے جائیں اور ان کے دماغ روشن ہوتے جائیں اتنی ہی اس مذہب کی بے توقیری اور اس کی عظمت میں کمی واقع ہو جائے اور یہ لوگ بالخصوص نے پہلے ہی دن سے طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں کو سیاست امور دنیا سے کوئی تعلق

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ صفحہ ۱۹۲

نہیں۔ سسرو (CICERO) بیان کرتا ہے کہ تھیٹر میں جب اس مضمون کے اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں تو لوگ انہیں نہایت ذوق وشوق سے سنتے تھے[1] ـــــ سینٹ آگسٹائن (ST. AUGASTINE) اور حیرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ رومن بت پرست مندروں میں تو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور تھیٹروں میں ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے[2]۔ رومی مذہب کی گرفت اپنے پیروؤں پر اتنی ڈھیلی ہو گئی تھی اور جذبۂ مذہبی اتنا سرد پڑچکا تھا کہ لوگ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور اشتعال میں آکر گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ لیکی لکھتا ہے کہ مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً بالکل فنا ہو گیا' جذبۂ تقدس تقریباً مٹ گیا اور اس کے مظاہر ہر شخص کو نظر آنے لگے چنانچہ جب اغسطس (AUGUSTUS) کا بیڑہ غرق ہو گیا تو اس نے غصہ میں آکر نیپچون (NEPTUNE) (سمندر کے دیوتا) کے بت کو مسمار کر دیا۔ جب جرمینکس (GERMANICUS) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیوتاؤں کے قربان گاہوں پر خوب پتھراؤ کیا[3]۔

رومی قوم کے اخلاق، سیاست اور معاشرت میں مذہب کا کوئی اثر اور ان کے احکام اور تعلیمات پر اس کا کوئی اقتدار و نگرانی باقی نہیں رہی تھی۔ مذہب میں کوئی گہرائی اور قوت باقی نہیں بنائی گئی کہ وہ دل کی گہرائی سے ابھرتا اور روح پر حکومت کرتا، وہ محض ایک رسم و رواج بن کر رہ گیا تھا۔ سیاست و حکومت کا تقاضا تھا کہ خواہ وہ برائے نام ہی رہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے۔ لیکی لکھتا ہے "رومی مذہب کی اصل بنا خود غرضی پر تھی، اس کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ افراد و قوم کا حال دنیا اور وبا اور مصائب سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ روم میں گو صدہا ہیرو و جانباز پیدا ہوئے لیکن نفس کش زاہد ایک بھی نہ اٹھا۔ یہاں ایثار کی جو بہتر سے بہتر مثالیں ملتی ہیں وہ بھی مذہب کے اثر سے

[1] تاریخ اخلاق یورپ ص ۲۳۷ [2] ایضاً ص ۲۳۸ [3] ایضاً ص ۲۴۲

آزاد اور وطن پرستی پر مبنی تھیں۔[1]

رومیوں کا ایک بڑا امتیاز و خصوصیت ان کی شاہنشاہیت پسندی اور استعماری ذہن اور زندگی کا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ ہے یہی وہ ترکہ ہے جو مغربی یورپ کو اپنے رومی مورثوں سے ملا ہے جرمن نو مسلم عالم محمد اسد صاحب نے اپنی کتاب (ISLAM AT THE CROSS ROADS) میں اس کا بڑی خوبی سے تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں:-

" رومی شہنشاہی پر جو خاص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری کا خیال اور بلاد و وطن کے لئے دوسری قوموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لوٹ کھسوٹ کرنا تھا، رومی رؤسا و امراء اور اونچے طبقہ کے لوگ اپنے نئے فارغ البالی اور امارت کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لئے کسی ظلم و بے دردی کو عیب نہیں سمجھتے تھے، باقی وہ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ ہے وہ محض رومیوں کے لئے تھا، یہ مخصوص سیرت اور کیرکٹر زندگی اور تمدن کے محض مادی تصور ہی پر قائم ہو سکتا تھا اگرچہ ان کی مادیت میں کچھ شائستگی اور لطافتِ ذوق پیدا ہو گئی تھی لیکن تمام روحانی قدروں سے وہ بالکل بیگانہ تھی، رومیوں نے کبھی اپنی حقیقی اور واقعیت کے ساتھ دینداری کا مزا نہیں چکھا تھا، ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی حکایات و خرافات کی پھیکی نقل تھے، انھوں نے محض اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت کے خیال سے ان کا رواج تسلیم کر لیا تھا، دیوتاؤں کو اپنی عملی زندگی میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کا کام صرف اتنا تھا کہ جب ان سے درخواست کی جائے تو اپنے مجاوروں کی زبانی پیشین گوئیاں کر دیں، لیکن ان کا تصرف بیچ میں کبھی نہیں رہا تھا کہ وہ لوگوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں۔[2]

---

[1] مادیت و اخلاق یورپ ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۳۰-۳۱

جمہوری دور کے آخر میں روم میں اخلاقی انحطاط اور حیوانی ہوس رانی اور تعیش کا ایسا سیلاب آیا کہ رومی اس میں بالکل ڈوب گئے اور وہ اخلاقی نظام و ضوابط جو رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اجتماع اور معاشرت کی عمارت میں ایسا تزلزل آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آ رہے۔ ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی مشہور کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" میں اس کی قلمی تصویر کھینچی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما انتہائے ترقی پر پہنچ گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ آخیر کو پہونچ چکی تھی، اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی، ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو ایک مسلسل عیش بنا لے، پاکبازی و حفظ نفس کے خوانِ نعمت پر بہترین نمکدان ہے اور اعتدال، سلسلۂ حفظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے، ان کے دسترخوان سونے چاندی کے برتنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے، ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمربستہ کھڑے رہتے تھے، ماہرویانِ روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں، ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں، عالی شان حماموں اور دلکش تماشہ گاہوں اور جوش انگیز دنگلوں سے جہاں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے، اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا، دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ عبادت اور پرستش کے لائق

اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے مال اور املاک کی ضبطی صوبجات کے محاصل کی تشخیص زر اور باج کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولت روما اس زندہ قوت کا نشان یا علامت ہے غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اس ناخوشگوار ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔[1]

عیسائیوں کی آمد اور رومیوں کا قبول مسیحیت

ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ جس کی اہمیت کو کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا مسیحیت کا بت پرست روما کے تخت سلطنت پر فائز ہو جانا ہے یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ قسطنطین جس نے مسیحیت قبول کر لی تھی ۳۲۴ء میں شہنشاہ روما کے تخت پر بیٹھا اور اس طرح سے مسیحیت نے قدیم بت پرستی پر فتح پائی اور دفعتاً اس کو ایسی وسیع سلطنت اور غیر محدود اقتدار حاصل ہو گیا جس کا وہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی چونکہ قسطنطین کو عیسائیوں کی سرفروشی فداکاری اور زبردست قربانیوں سے تخت سلطنت ہاتھ آیا تھا اس لئے اس نے عیسائیوں کو اس کا پورا صلہ دیا اور سلطنت میں پورے طور پر شریک کیا۔

مسیحیت میں بت پرستی کی آمیزش

لیکن حقیقتاً مذہب عیسوی کے لئے یہ ایک بڑا نامبارک واقعہ تھا اس نے عظیم الشان

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس مترجمہ مولوی ظفر علی خاں ص ۹۸

سلطنت تو حاصل کر لی لیکن بڑی قیمت یعنی مذہبی متاع کھو دی۔ عیسائی میدانِ جنگ میں تو فتحیاب ہوئے لیکن مذاہب و ادیان کے معرکہ میں انھوں نے شکست کھائی۔ رومی بت پرستوں اور خود عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اس میں سب سے بڑا ہاتھ خود مسیحیت کے محافظ ناموس اور علم بردارِ اعظم قسطنطین کا ہے۔ ڈریپر لکھتا ہے:۔

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنھیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ پرجوش حامی بن گئے چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن باطن مشرک بت پرست تھے لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی قسطنطین نے کہ وہ بھی انھیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرزِ عمل کا سدباب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔[1]"

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے گروہ کا سنبھالے تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اسے بھی نہ تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصالِ کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہے کہ اسلام نے اپنے مدِ مقابل کو مطلقاً نیست و نابود کر دیا اور نئے عقائد کو

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۵۳ [illegible]

بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔

اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جسے مذہبی اختلافات سے بہت کم رغبت رکھتے تھے اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی یا دونوں متخاصم جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اسی میں نظر آتی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت و ارتباط پیدا کیا جائے اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار بت پرستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر مسیحی مذہب باقی رہ جائے گا؟[1]

بت پرستی اور مسیحیت کا یہ معجون مرکب جس سے مسیحی مذہب کی روح اور اس کا حسن نکل چکا تھا اس لائق نہ تھا کہ رومیوں کی بگڑی ہوئی طبائع فاسد سیرت و اخلاق کو سنبھال سکے اور ان میں پاک صاف مذہبی زندگی کی روح پھونک سکے اور رومیوں کی تاریخ میں اور بالواسطہ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے تابناک عہد کا آغاز کر سکے اس کے برخلاف اس نے رہبانیت کی بدعت نکالی جو شاید انسانیت و تمدن کے حق میں بت پرست رومہ کی حیوانیت سے زیادہ وبال جان تھی یورپ کی مادہ پرستی اور لادینیت میں اس مردم آزار اور آدم بیزار دشمن فطرت رہبانیت کو بہت کچھ دخل ہے اس لئے کچھ تفصیل کے ساتھ اس کے تذکرہ کی ضرورت ہے۔

جنونِ رہبانیت

رہبانیت میں اتنا غلو اور افراط پیدا ہو گیا تھا کہ اس زمانہ میں اس کا قیاس کرنا بھی

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس ص [illegible]

مشکل ہے "تاریخ اخلاق یورپ" سے اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد مؤرخین کے اختلافِ بیان کی وجہ سے قطعی طور پر نہیں بتائی جا سکتی تاہم ان کی کثرت اور تحریکِ رہبانیت کی اشاعت و مقبولیت کا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکتا ہے سینٹ جیروم کے زمانہ میں ایسٹر کی تقریب پر تقریباً پچاس ہزار راہبوں کا مجمع ہوتا تھا چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے، سینٹ سراپین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ خود مصر کے شہروں کی آبادی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی۔ دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی، مؤرخین نے اس کی بے شمار حیرت خیز مثالیں پیش کی ہیں، سینٹ میکیریس اسکندری کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سوتے رہے تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈستی رہیں نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے، ان کے مرید سینٹ یوسیبس تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنویں کے اندر مقیم رہے، ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے، ایک مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے، جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے، بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے، ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے، راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے، اہلِ زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا، جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرتبہ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر

وہ جتنے متعفن و غلیظ ہوتے سینٹ اتھانیسس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انتونی نے
پاؤں کبھی نہیں دھوئے۔ عمر اپنے پیر دھونے کے عصیان کا مرتکب نہیں ہوا سینٹ ابراہام نے
پچاس سال تک زندگی میں اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ راہب لوگ بڑے
بڑے تاسف اور تحسر سے فرماتے ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام
جانتے تھے۔ اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں۔ راہب مسلکوں کا جنہیں بہکے ہوئے پھرتے
تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار
نہیں رہ گیا تھا جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی اس کے نام پر پبلک میں
ہر طرف داد و رہ ہوتی تھی پہلے جو اثر و اقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا،
وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا پادری رہبانیت کے لئے لڑکوں کا
اغوا کرتے تھے سینٹ امبروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اسے
دیکھ کر مائیں اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند رکھتی تھیں۔ تحریک رہبانیت کا اخلاقی
نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے محاسن مردانگی و بہادری سے متعلق ہیں وہ سب کے سب معیوب قرار پاگئے
شائستگی، مروت، دلی خوش طبعی صفات کوئی فی حقیقی شجاعت جرأت کو عابدان مرتاض کبھی
ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرنے دیتے تھے۔ دوسرا اہم نتیجہ رہبانی فرقوں کی شہرت کا یہ
تھا کہ خانگی زندگی کی شیریں ترین تعلقات متزلزل ہو گئیں۔ اور دلوں سے والدین کا احترام و ادب کافور
ہو گیا۔ اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزہ کے ساتھ قساوت قلبی
کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے یہ زاہدان صحرا اور عابدان مرتاض
اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے بہنوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو بیٹا بیٹی
سمجھ کر انہیں بے دل و وارث شخص دوسروں کے گھر والوں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے ان کو چھوڑ دیا

تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اخروی حاصل ہو، انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین جئیں یا مریں، لیکی نے اس سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی آنسو نکل آتے ہیں، عورتوں کے سایہ سے وہ بھاگتے تھے، ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے، اپنی ماؤں، بیویوں اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیت کبیرہ سمجھتے تھے، لیکی نے اس سلسلہ کے جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی آتی ہے کبھی رونا۔

فطرت دشمنی کا اثر اخلاق و تمدن پر

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس انتہا پسند رہبانیت نے رومیوں کی مادیت کے غلو اور شدت میں اور ان کی بہیمانہ خواہشات پرستی میں کچھ اعتدال و تخفیف پیدا کر دی ہوگی، ایسا ہونا نہیں ہوتا، یہ بات فطرت انسانی کے خلاف ہے اور مذاہب و اخلاق کا تجربہ بھی اس کے برخلاف ہے، دراصل جو چیز سرکش مادیت میں اعتدال پیدا کر کے اس کو ایک معتدل زندگی میں تبدیل کر سکتی ہے، وہ صرف انبیاء کا روحانی دینی و اخلاقی حکیمانہ نظام ہے جو انسان کی فطرت سلیم کے عین مطابق ہو اور اس بات کے درپے نہ ہو کہ وہ فطرت کو بالکل تبدیل کر دے، اس کا مقصد اس کا ازالہ (مٹا دینا) نہ ہو بلکہ امالہ (پھیر دینا) ہو، وہ اس کا رخ شر سے خیر کی طرف تبدیل کر دے، اسلام کا طرز عمل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارک یہی ہے، عرب بہادر و جنگجو تھے، آپ نے ان کی شجاعت کو معدوم نہیں کیا بلکہ صرف قبائلی خانہ جنگی اور جاہلی جذبۂ انتقام سے اس کو موڑ کر جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف پھیر دیا، عرب فیاض اور عالی حوصلہ تھے لیکن ان کی فیاضی اور عالی حوصلگی فخر و نام و نمود میں صرف ہوتی تھی

آپ نے اس کو راہ خدا میں خرچ کرنے پر لگا دیا۔ غرض یہ کہ آپ نے ان کے جاہلی خصائص و اخلاق کو اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا اور ان کو صحیح اور نیک رخ دیا۔ آپ نے جاہلیت کی جگہ اسلام کا پورا نظام اور ہر چیز کا بدل بہترین شکل میں عطا فرمایا۔ طبیعت اور نفوس کو تازگی اور تفریح کے مواقع بھی عطا فرمائے۔ اس لئے کہ[1] بقول ایک صاحب القدر عالم شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے انسانی طبیعتیں ہمیشہ کسی چیز سے اسی وقت دست بردار ہوتی ہیں جب ان کو اس کا بدل مل جاتا ہو انسان فطرتاً کچھ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا عمل اور مشغولیت ہے تعطل بیکار و معطل ہو جانا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔[2] انبیاء کرام تبدیل فطرت کے لئے نہیں بلکہ تکمیل فطرت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ حدیث و سیرت میں اس کی متعدد نظیریں ملیں گی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت اہل مدینہ کے دو تہوار تھے جن میں وہ تفریح کرتے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیسے دو دن ہیں لوگوں نے کہا کہ ہم ایام جاہلیت میں ان میں تفریح کرتے تھے۔ فرمایا اللہ تعالے نے تم کو اس سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں عید الاضحی و عید الفطر۔[3] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عید کے دن ایک مرتبہ میرے پاس انصار کی دو لڑکیاں وہ گیت گا رہی تھیں جو بعاث کی جنگ میں کہی گئی تھیں اور وہ گانے والی بھی نہیں تھیں۔ اتنے میں حضرت ابو بکر تشریف لائے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں شیطان کی گیتیں بجنے لگی ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بکر ہر قوم کی ایک عید ہے اور یہ ہماری عید ہے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ابو بکر جانے دو یہ عید کے دن ہیں۔[4]

اس کے برخلاف رومی عیسائیت نے بیکار فطرت کو تبدیل اور فنا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور

١؎ کتاب اقتضاء الصراط المستقیم ص ۲۳ ٢؎ کتاب النبوات از امام ابن تیمیہ۔ ٣؎ ابو داؤد، نسائی

٤؎ بخاری و مسلم۔

ایسا نظام پیش کیا جس کی فطرت متحمل نہیں ہو سکتی، اس نے انسان کی طاقت سے زیادہ انسان پر بوجھ ڈالا، روم کی سابقہ انتہائی مادیت کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر لوگوں نے طوعاً و کرہاً اس کو برداشت کیا، لیکن جلد ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا، اور دبی ہوئی مظلوم فطرت نے سخت انتقام لیا، یہی اس غالی رہبانیت، فطرت کے حقائق سے چشم پوشی اور ناعاقبت اندیشی سے مسیحیت لوگوں کے اخلاق و عادات اور ہلاکت کے غار میں گرتے ہوئے تمدن کا ہاتھ نہ پکڑ سکی، حالت یہ تھی کہ عیسائی ممالک میں بیک وقت مسیحیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چل رہی تھیں بلکہ شاید زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ رہبانیت تو صحراؤں میں گوشہ نشین تھی، اور شہری زندگی پر اس کا کوئی اقتدار نہ تھا، اور اس کے برخلاف فسق و فجور کی تحریک شہروں کے اندر اپنے پورے جوش و تلاطم پر تھی، لیکی مسیحی دنیا کے اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

"اخلاق میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی، دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلامانہ خوشامد، اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی، دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھولے کھا رہی تھی، بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد اور راہب پیدا ہوئے تھے، وہاں تھے جہاں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی، غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے، رائے عامہ اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا، البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا، لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف

ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغابازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم و تشدد، شقاوت و بے حیائی اتنی نہ تھی لیکن اس کے ساتھ حریت فکر، آزاد خیالی و جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔[1]

ارباب کلیسا کی عیش پرستی اور دنیا داری

رہبانیت اور مذہب کا سلبی نظام خلاف فطرت ضرور تھا لیکن نئے مذہب کے اثرات اور اس کے روحانی اقتدار نے فطرت کو دبا رکھا تھا لیکن تھوڑے دنوں کے بعد خود مذہبی مرکزوں اور حلقوں میں وہ تمام عیوب اور عیش پرستی شروع ہوگئی جس کے خلاف رہبانیت کی تحریک شروع کی گئی تھی، یہاں تک کہ وہ اخلاقی انحطاط و پستی اور تنعم و عیش پرستی میں خالص دنیادار حلقوں سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے۔ حکومت کو مجبوراً ان مذہبی دعوتوں کا سلسلہ بند کرنا پڑا جن کا مقصد مسیحیوں میں اخوت و محبت پیدا کرنا تھا۔ اسی طرح سے شہداء و اولیاء کے عرس اور ان کی برسیاں ممنوع قرار دی گئیں کیونکہ یہ خالص مذہبی تقریبات فسق و بے حیائی کا اڈہ بن گئی تھیں۔ بڑے بڑے پادریوں پر بڑے بڑے اخلاقی جرائم کا الزام تھا۔ سینٹ جیروم کا مقولہ ہے کہ اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور دولتمندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی ہے۔ خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامان تجارت کی طرح بکتے تھے اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا۔ جنت کے قبالے جائیداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح، مغفرت کے پروانے، نقض قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ بے تکلف بکتے تھے۔ مذہبی عہدہ دار سخت راشی و سود خوار تھے

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم ص ۱

فضول خرچی اور اسراف کا حال یہ تھا کہ پاپائے انوسینٹ ہشتم نے پاپائی کا تاج رہن رکھا اور پاپائے بینیڈکٹ نہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی پہلے وہ خرچ کی اس کے بعد اپنی دولت جب یہ بھی کافی نہ ہوئی تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پیشگی سے وصول کر کے صرف کر ڈالا بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔[1]

غرض یہ کہ کلیسا کی تاریخ اور ارباب کلیسا کی سیرت قرآن کی اس آیت کی پوری پوری تفسیر تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ	مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کے
الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ	علماء اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ	ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق
عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔	ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انھیں
(التوبۃ ـ ۳۴)	روکتے ہیں۔

حکومت و کلیسا کی کشمکش

گیارھویں صدی عیسوی میں حکومت و کلیسا کی کشمکش شروع ہوئی اور اس نے بڑی شدت اختیار کر لی ابتداء میں پوپ کو اس جنگ میں فتح ہوئی اور پوپ کا اقتدار و اعزاز اتنا بڑھ گیا کہ شہنشاہ ہنری چہارم ۱۰۷۷ء میں اس بات پر مجبور ہوا کہ کنوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس۔

سفارش پر اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے پاؤں اُون پہنے ہوئے آیا
پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے اس کی غلطی معاف کی، اس کے بعد حکومت و کلیسا کی آویزش رہی
کبھی پوپ کو فتح اور کبھی شکست ہوئی یہاں تک کہ انجام کار حکومت کے مقابلہ میں کلیسا کو دبنا پڑا اور اس
پوری مدت کشمکش میں لوگ مذہب، سیاست اور کلیسا و ریاست کی دوہری غلامی میں گرفتار رہے۔

اقتدار کا غلط استعمال اور یورپ کے تمدن پر برا اثر

پوپ قرون وسطیٰ میں بڑے وسیع اقتدار اور ایسی عظیم الشان طاقت کے مالک تھے جو شاید
روما کو بھی حاصل نہ تھی، ان کے لئے یہ بہت آسانی سے ممکن تھا کہ وہ دین کے زیر سایہ یورپ کو علم
اور تمدن میں ترقی دینے کا ذریعہ بن سکتے تھے اگر پاپایان روما اپنی ہوس رانیوں اور دنیاوی چپقلشوں میں
مبتلا نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ ان کے ایک اشارہ پر تمام براعظم بالاتفاق ایسی ترقی کرتا کہ
دنیا دنگ رہ جاتی، ان کے نائب بے روک ٹوک ہر ملک میں جا سکتے تھے اور آئرلینڈ سے لے کر بوہیمیا اور
اٹلی سے چل کر اسکاٹ لینڈ تک مختلف آبادیوں سے بات چیت کر سکتے تھے، ایک زبان ہونے کی وجہ سے
وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں دخیل ہو گئے اور ہر ملک میں انہیں ایسے ہوشیار اور معاملہ فہم حلیف
ہاتھ آگئے تھے جو ایک ہی زبان بولتے تھے اور عام امور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار رہتے۔

لیکن مسیحیت اور مسیحی اقوام کی بدقسمتی تھی کہ ارباب کلیسا نے اس زبردست طاقت کا ناجائز
استعمال کیا، انہوں نے اس سے اپنے شخصی اثر و اقتدار کے لئے فائدہ اٹھایا اور یورپ بدستور پستی،
جہالت و خرافات کی تاریکیوں میں پڑا رہا، اور تمدن اور تہذیب کو ترقی ہونے کے بجائے سخت تنزل ہوا،
براعظم یورپ کی آبادی ہزار سال میں بھی اور ملک انگلستان کی آبادی پانچ سو سال میں بھی دوچند نہ ہو سکی،
اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑا دخل اس بات کو ہے کہ بے شمار پادری اور راہب تجرد کی زندگی گزاری

تبلیغ کرتے تھے اس کے سبب کلیسا نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے اس لئے کہ ان کا خیال تھا ان کی آمدنی پر جو دعا اور تبرکات کے ذریعہ ہوتی تھی اثر پڑتا تھا اور طبیب اس منفعت میں کلیسا کے رقیب بن سکتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک زبردست وبائیں اور امراض پھیلے اور موت کی گرم بازاری ہوئی۔ انیئس سلویس نے ۱۴۳۵ء میں جزائر برطانیہ کی جو سیاحت کی ہے اس میں اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں اس سے اس ملک کی تمدنی انحطاط افلاس اور فاقہ زدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتب مقدسہ میں الحاق و تحریف اور اس کے نتائج

لیکن اہل دین کی سب سے خطرناک غلطی جس سے انھوں نے اس مذہب کو جس کے وہ نمائندے تھے اور خود اپنے کو سخت ترین نقصان پہونچایا یہ تھی کہ انھوں نے اپنی مقدس دینی کتابوں میں ان تاریخی جغرافیائی و طبعی نظریات اور معلومات کو داخل کر دیا جو اس زمانہ کی تحقیقات اور مسلمات تھے اور انسانی علم ان کے زمانہ تک اسی حد تک پہونچا تھا لیکن وہ انسانی علم کی حد نہ تھی اور اگر اس زمانہ میں وہ حد سمجھی گئی تھی تو وہ فی الاصل آخری حد نہ تھی اس لئے کہ انسانی علم تدریجی ترقی پذیر اور سائرہ ہے جس کا قیام عارضی ہے اس پر کوئی پائدار عمارت نہیں قائم کی جاسکتی وہ بعض اوقات ریت کی طرح کھسک جاتا ہے اور عمارت منہدم ہو جاتی ہے ارباب کلیسا نے غالباً خوش نیتی سے ایسا کیا تھا ان کا مقصد شاید یہ تھا کہ اس سے ان آسمانی کتابوں کی عظمت و شان اور خصوصیت میں اضافہ ہوگا لیکن آگے چل کر یہی چیز ان کے لئے وبال جان اور مذہب و عقلیت کے اس اہم معرکہ کا سبب ہوئی جس میں مذہب اور وہ مذہب جس پر انسانی علم کی آمیزش تھی بری طرح شکست کھائی اور یورپ میں اہل مذہب کو ایسا زوال ہوا جس کے بعد پھر عروج نہ ہوسکا

اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ یورپ لادینی ہو گیا۔

اہل مذہب نے صرف اسی الحاق اور تحریف پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان تمام جغرافیائی تاریخی اور طبعی معلومات کو جو لوگوں میں اس زمانہ میں مشہور تھیں کتب مقدسہ کے بعض شارحین و مفسرین نے ان کا تذکرہ کیا تھا دینی تقدس کا جامہ پہنا دیا اور ان کو مذہبی رنگ دے کر ان کو مسیحی تعلیمات و اصول میں شامل کر لیا جن پر اعتقاد رکھنا ایک مسیحی کے لئے ضروری تھا اس موضوع پر انھوں نے کتابیں تصنیف کیں اور اس جغرافیہ کو جس کی کوئی آسمانی سند نہ تھی جغرافیہ مسیحی TOPOGRAPHY CHRISTIAN کا نام دیا اور اس کے تسلیم کرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا ان کی تکفیر کی۔

مذہب و عقلیت کی کشمکش اور ارباب کلیسا کے مظالم

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں عقلیت کا کوہ آتش فشاں پھٹ چکا تھا علماء طبیعیات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے انھوں نے ان بے اصل نظریات کی تردید کی جو جغرافیہ اور تاریخ اور طبیعیات سے متعلق ان مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے اور بڑی جسارت اور آزادی کے ساتھ ان کی علمی تنقید کی اور بے تکلف ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا اس کے ساتھ انھوں نے اپنے علمی انکشافات اور تجربوں کا بھی اعلان کر دیا اب کیا تھا مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہو گئی ارباب کلیسا نے جو اقتدار اور طاقت کے مالک تھے ان کی تکفیر کی اور دین مسیحی کے لئے ان کے خون بہانے اور ان کے مال و متاع ضبط کر لینے کی اجازت دی احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جو بقول پوپ کے "ان ملاحدہ اور زندیقوں کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں" ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے

انجام دیا۔ اس کے جاسوس بر اعظم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارہ میں محکمۂ احتساب نے تفتیش اور تجسس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایک عیسائی عالم کہتا ہے کہ "ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے" اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزائیں دیں ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں۔ جن میں بتیس ہزار کو زندہ جلایا گیا۔ انہیں میں زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو BRUNO بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو GALILEO کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔

اہلِ تجدد کی مذہب کے خلاف بغاوت اور بیزاری

آخر کار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے مذہب و جمعیت کے نمائندوں کے خلاف علمِ جنگ بلند کر دیا۔ وہ مذہبی گروہ کے اس تشدد و جمود اور محکمۂ احتساب کے ان مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان تمام عقائد، علم، اخلاق و آداب سے نفرت ہو گئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی ہے یا اس سے ان کا تعلق ثابت ہوتا ہے ان کے دل میں ابتداءً مسیحی مذہب کے خلاف اور رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف عداوت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ جنگ جو ابتداءً علوم و عقلیت کے علمبرداروں اور مذہب مسیحی (در حقیقت سینٹ پال کے مذہب) کے نمائندوں کے درمیان تھی بعد میں علم و دین کی باہمی جنگ کی صورت

اس نے اختیار کر لی، روشن خیالوں اور عقلیت کے علم برداروں نے بطور ردِ عمل یہ طے کر لیا کہ علم و مذہب ایک دوسرے کے ضد اور مقابل واقع ہوئے ہیں، جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے، اور دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہیں، جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی، اس لئے علم و عقلیت کے ساتھ وفاداری کے لئے ضروری ہے کہ مذہب سے منھ موڑ لیا جائے، ان کے سامنے جب دین و مذہب کا نام آتا تو وحشت نمائندگانِ مذہب اور اربابِ کلیسا کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور ان بے گناہ علماء اور محققین کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنھوں نے انتہائی مظلومیت اور بے بسی کی حالت میں ان جلادوں کے ہاتھوں بڑی اذیت کی موت پائی، مذہبی گروہ کے نام سے ان کی نگاہوں کے سامنے پُر تعصب چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، خون فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور پادریوں کے بھیجے دماغ ہی آ جاتے، چنانچہ مذہب سے وحشت اور نفرت کو انھوں نے ایک اصولِ زندگی کے طور پر طے کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی نفرت و کراہیت کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

روشن خیالوں کی عجلت پسندی اور جمود و تعصب

ان روشن خیالوں اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر و سکون، مطالعہ اور غور و فکر کی قوت اور عقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک اربابِ کلیسا کا جمود، جہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بے تعلقی اختیار کر لینا کہاں تک حق بجانب ہے، لیکن غصہ اور اہلِ مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسے کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے انھوں نے دین کے ساتھ کوئی رواداری اور مصلحت پسندی نہیں کی۔

ان میں اتنی طلب صادق اور اپنی قوم کی خیر خواہی اور فراخ حوصلگی بھی نہ تھی کہ وہ دین اسلام کا مطالعہ کرتے جو ان کی بہت سی معاصر قوموں کا دین تھا اور جو نہایت آسانی کے ساتھ مسیحی عقائد و مذہب و عقلیت کی باہمی خونریزی کی کشمکش سے نجات دیتا جو معقول و مستحسن امور کا مطالبہ کرتا، غیر معقول اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتا، دنیا کی بے ضرر اور پاک لذتوں اور فوائد کی ان کو اجازت دیتا، مضر اور قابل نفرت اشیاء کو ممنوع قرار دیتا اور ان بے جا زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹ دیتا جو تحریف شدہ مذاہب اور تشدد پسند اہل مذہب اور اہل حکومت نے ان کے جسم میں ڈال رکھی تھیں۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ	(محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) ان کو
عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں پاکیزہ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ	چیزیں حلال کرتے ہیں گندی چیزیں حرام
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي	ٹھہراتے ہیں اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں
كَانَتْ عَلَيْهِمْ	جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں ان پھندوں
(الاعراف - ۱۵۷)	سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں۔

لیکن قومی عصبیت اور ان دیواروں کی وجہ سے جو صلیبی جنگوں نے عیسوی مغرب اور اسلامی مشرق کے درمیان اور ارباب کلیسا کی افترا پردازیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف کھڑی کر دی تھیں، نیز مطالعہ و تحقیق کی محنت برداشت نہ کرنے اور موت کے بعد کی زندگی اور نجات اخروی سے آزاد و بے فکر ہونے کی وجہ سے انھوں نے اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

مزید کچھ دخل مسلمانوں کی تبلیغی کوتاہیوں کو بھی ہے کہ انھوں نے صدیوں یورپ جیسے اہم براعظم میں اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے تعارف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ اسلامی حکومت کے عروج اور یورپ کی سلطنتوں سے معاصرانہ و مساویانہ تعلقات ہونے کی

وجہ سے ان کو اس کے مواقع حاصل تھے۔

غرض اہل یورپ ایسے نازک موقع پر اسلام کی رہنمائی اور اس کی مسیحائی سے محروم رہے۔

یورپ کی مادیت

بہرحال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آگیا اور یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہوگیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آگئی، اگرچہ یہ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں اس کی رفتار سست تھی لیکن قوت و عزم کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت کرنی شروع کی۔ علماء فلسفہ و علوم طبیعیات نے کائنات میں اس طرز پر غور و بحث کرنی شروع کی کہ گویا اس کا کوئی خالق ہے نہ منتظم و حاکم اور طبیعیات اور مادہ کے اور کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس عالم میں تصرف اور اس کا نظم و نسق کرتی ہے۔ وہ عالم طبیعی اور اس کے ظواہر و آثار کی تشریح و توجیہ خالص میکانیکی طریقہ پر کرنے لگے اور اس کا نام علمی اور تحقیقی طرز قرار دیا، اور ہر ایسا بحث و نظر کا طریقہ جس کی بنیاد خدا کے وجود اور اس کے یقین پر ہو تقلیدی اور غیر علمی طریقہ کہا جانے لگا اور اس کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ اس راستہ کی منزل یہی تھی کہ انھوں نے چلتے چلتے حرکت اور مادہ کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیا اور ہر اس چیز کے ماننے سے عذر کیا جو حواس اور تجربہ کے اندر نہ آسکے اور جس کا وزن اور شمار یا پیمائش نہ ہو سکے، اس کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا وجود اور تمام حقائق مابعد الطبیعیات ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا عقل و علم سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔

ان لوگوں نے ایک زمانہ دراز تک خدا کا انکار نہیں کیا اور مذہب کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا اور فی الواقع سب کے سب منکر بھی نہ تھے لیکن طریق فکر اور بحث و نظر جو انہوں

انھوں نے اختیار کی تھی، وہ ایسے دین کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی تھی جس کی پوری عمارت ایمان بالغیب اور وحی و نبوت کی بنیاد پر ہے اور جو حیات اُخروی پر اس قدر زور دیتا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی حواس و تجربہ کے تحت میں نہیں آتی اور وزن و شمار اور پیمائش سے اس کی تحقیق نہیں کی جا سکتی، اس لئے روز بروز ان کو دینی عقائد میں اضطراب اور ان کے ماننے میں تذبذب پیدا ہو گیا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کے لوگ مدت دراز تک مادی نقطۂ نظر، مادی زندگی اور دینی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے، مذہبی تقلید سے وہ ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے اور عیسوی دنیا میں مذہبی ماحول ابھی باقی تھا، اخلاقی اور اجتماعی مصالح کا بھی تقاضا تھا کہ خواہ برائے نام ہی سہی، مذہبی نظام ضرور برقرار رہنا چاہیے جو قوم کے افراد کے درمیان رابطہ قائم رکھے اور ملک کو اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے محفوظ رکھے، لیکن مادی تہذیب کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مذہب اور اس کے رسوم اس کا ساتھ نہ دے سکے، مادیت اور روحانی مذہب کے جمع کرنے میں خاصی تکلیف، تکلف اور تضیع اوقات تھا، اس لئے کچھ مدت کے بعد اس تکلف کو برطرف کیا اور صاف صاف لادینیت اور مادہ پرستی اختیار کر لی، اس زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف، ادیب، معلم اجتماعی اور سیاسی پیدا ہوئے جنھوں نے مادیت کا صور پھونکا اور اہل ملک کے دل و دماغ میں الحاد کے بیج بو دیئے، علماء اخلاق، اخلاق کی مادی تشریح کرتے تھے، کبھی فلسفۂ افادیت کی وکالت کرتے اور کبھی لذتیت کی، میکاویلی (MACHIAVELLI ۱۵۲۷-۱۴۶۹) جیسے اہل سیاست نے دین و سیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے رکھی تھی اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں، پبلک اور پرائیویٹ اور طے کر دیا تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت ہی ہے تو وہ محض انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس کو امور سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے، حکومت ہر چیز پر

مقدم اور ہر شے سے بیش قیمت ہے۔ مذہب عیسوی کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، یہاں کی دنیاوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں، مذہبی اور نیکوکار انسانوں کا وجود حکومت کے لئے کچھ مفید نہیں، اس لئے کہ وہ دین کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ بادشاہوں اور حکام کو ہر طریقے سے منافع اختیار کرنے چاہئیں اور اگر حکومت کا فائدہ ہوتا ہو اور کوئی سیاسی مصلحت مقتضی ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب دہی خیانت اور نفاق میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے۔ یہ دعوت و تبلیغ پورے طور پر کامیاب ہوئی اور وطنیت و قومیت (جو مذہب قدیم کی جگہ لے رہی تھی) نے بھی اس کی پوری امداد کی۔

مصنفین اہل قلم اور اہل دماغ نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور خطابت و شاعری سے قدیم اخلاق اور اجتماعی نظامات کے خلاف سارے ملک میں ایک بغاوت برپا کردی، انھوں نے معصیت کو خوشنما اور دل فریب بنا کر پیش کیا، طبیعتوں کو ہر قید و بند سے اور فرد کو ہر ذمہ داری و جواب دہی سے آزاد ہونے کی اور مطلق آزادی، بے قیدی کی کھلی تبلیغ کی، زندگی سے پورے پورے تمتع، مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی اور اس زندگی کی قیمت میں بڑے غلو اور مبالغے سے کام لیا، عقل، لذت اور ظاہر و محسوس، مادی نفع کے سوا ہر چیز کا انکار و تحقیر کی۔

اس طرح سے انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی زندگی کی بُت پرست یونان اور روما کی جاہلی زندگی کا مرقع بن گئی، گویا اس کا نیا اڈیشن تھا جو انیسویں صدی میں نئے اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا، یونان اور روما کے جن نقوش کو مشرقی عیسویت نے مدھم کردیا تھا، انیسویں صدی کے نقاشوں نے ان کو پھر ابھار کر دیا، اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، آج کی مغربی قومیں انھیں یونانی، رومی اور مغربی اقوام کی جانشین، وارث اور خلف الرشید ہیں، موجودہ مغربی تہذیب

اور قدیم یونانی اور رومی تہذیب میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے یورپ کی موجودہ مذہبی زندگی روحانیت اور باطنی کیفیت سے اسی طرح عاری ہے جیسے یونانیوں کی مذہبیت تھی، ذہنی طور پر خشوع وخضوع اور مذہبی سنجیدگی کی کمی زندگی میں لہو ولعب کی کثرت کا بھی یہی حال ہے جو یونان میں تھا اور یہ صحیح ہے علماء طبیعیات وحکمت کے ان نظریات اور تحقیقات کو جنھوں نے یورپ میں پوری مقبولیت حاصل کر لی اور دین ومذہب کی پوری پوری جگہ لے لی ہے، اسی طرح زندگی کی امور لذت طلبی اور دولت اور دنیا میں شوق کی جو بھی کیفیت ہے جو سقراط نے اپنے زمانہ کے جمہوری نوجوانوں کی بیان کی ہے نیز مذہبی شکوک، مذہب، دینی نظام، اور مذہبی فرائض ورسوم کی بے وقعتی میں بھی یورپ یونان ورومہ سے پیچھے نہیں ہے۔

مسیحیت یا مادہ پرستی؟

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ مسیحیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے، مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اس کی قدم قدم پر تصدیق ہوتی ہے۔

(ISLAM AT THE CROSS ROADS) کا مصنف لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریق پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ تطبیق کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں یورپ کا عام اور متوسط آدمی وہ جمہوری ہو یا فاشسٹ سرمایہ دار ہو یا اشتراکی ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا وہ صرف ایک مذہب جانتا ہے وہ کیا ہے مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان کو

زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پُر راحت اور آزاد و بے قید بنانے، اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست کارخانے ہیں، تھیٹر و تفریح گاہیں، کیمیاوی دار الصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مرکز، اس مذہب کے پروہت بینکوں کے افسران ہیں، انجینئر، ادا کار عورتیں، الکٹریسیٹی، فلم اسٹار اور تجارت و صنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہواباز ہیں، طاقت و لذت کی اس ہوس اور چھچھورپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کر دینے کے لئے تُلے بیٹھے ہیں اگر ان کی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہو گیا، اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا اس کے نزدیک معیار صرف مادی کامیابی ہے۔[1]

مغربی تہذیب صاف صاف پر زور طریقہ پر خدا کا انکار نہیں کرتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذہنی نظام میں اللہ کی کوئی جگہ نہیں اور اس کے سامنے نہیں وہ کوئی فائدہ محسوس کرتی ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے۔[2]

پروفیسر جوڈ (Joad) جو لندن یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ و علم نفس کے صدر رہ چکے ہیں GUIDE TO MODERN WICKEDNESS میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں:-

"میں نے بیشمار طلبا اور طالبات کی جو سب کے سب بیس سے کچھ اوپر کے تھے ایک جماعت سے سوال کیا کہ ان میں سے کتنے کسی معنی میں عیسائی ہیں؟ صرف تین نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا اور عیسائی ہونے کا اقرار کیا، سات نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ

---

[1] ISLAM AT THE CROSS ROADS — FIFTH EDITION, P. 51

[2] ایضاً P. 40

پر کبھی غور نہیں کیا، باقی ۶۳ نے صاف صاف کہا کہ وہ کھلے طور پر مسیحیت کے خلاف ہیں میرا خیال ہے کہ مسیحیت کے ماننے والوں کا یہ تناسب اس ملک میں کوئی استثنائی اور غیر معمولی مثال نہیں ہاں البتہ اگر یہ سوال پچاس سال یا بیس سال اُدھر کیا جاتا تو اس کے جوابات ان جوابات سے مختلف ہوتے اس بنا پر بہت تھوڑے لوگ ہوں گے جو کینن بیری CANON BARRY کے اس بارہ میں ہم خیال ہوں کہ ایک بڑے پیمانہ پر مسیحی بیداری اور ترقی دنیا کو نجات دے سکتی ہے میری رائے میں ان کے اس دعوے کو حق بجانب ثابت کرنے والی کوئی چیز نہیں ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ ان کی خواہش ہو ایسا بہت ہوتا ہے کہ خواہشات خیالات پیدا کر دیتی ہیں لیکن وہ دلائل اور ثبوت نہیں پیدا کر سکتیں اس ملک کے حالات و آثار صاف بتلا رہے ہیں کہ مسیحی کلیسا آئندہ صدی میں اپنی عمر پوری کر دے گا، ایک روزنامہ اخبار کے اقتباس ذیل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ستر برس کے ایک بوڑھے نے ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے وہ کتاب مقدس کے پرانے نسخوں کو بے وقعتوں کی ذات مصنوعی ریشم کا پارچہ اور نوٹوں میں تبدیل کر سکے گا یہ مشین کارڈف فیکٹری CARDIF FACTORY اور ایسے دوسرے کارخانوں میں لگا دی گئی ہے اور کتاب مقدس کے نسخوں سے جنگی سامان تیار ہو رہا ہے موجد نے اس مشین سے بڑی دولت پیدا کی ہے۔[1]

پس کہاں ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے کان دیے ہیں۔

۱؎ GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 114 (15)

زر پرستی

یہی مصنف اپنی دوسری کتاب PHILOSOPHY FOR OUR TIMES میں لکھتا ہے:۔

"صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے۔ حصولِ دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر جملہ محرکاتِ عمل سے زیادہ کام کرتی رہی ہے کیونکہ دولت حصولِ ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی ضمانت اور شان و عظمت ہی سے انسان کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ سیاسیات، ادب، سنیما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجا وغیرہ کے منبروں سے سال بسال اپنے پڑھنے سننے والوں کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں جذبۂ حصول انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہے۔"

یہ دولت پرستی ہمارے مذہبی اعتقادات سے متصادم ہے کیونکہ مذہب یقین دلاتا ہے کہ غریبی اچھی اور دولت مندی بُری ہی نہیں بلکہ دولت مند کا نیک بننے کا اتنا ہی کم امکان ہے جتنا کہ غریب کو زیادہ ہے اگرچہ تقاضائے دانش و تعلیم مذہب متفقہ طور پر یہی سکھاتے ہیں کہ خدا پرستی اور حصولِ جنت غریبی کے ساتھ ہے تاہم لوگوں نے تعلیم مذہب کو سچا سمجھ کر اس پر عامل ہونے کا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا اور موجودہ حصولِ دولت کو مستقل حصولِ راحت آسمانی پر بخوشی ترجیح دیتے رہے ہیں۔ غالباً ان کا خیال رہا ہے کہ بسترِ مرگ پر توبہ کر کے وہ آخرت میں اتنا ہی فائدہ حاصل کر سکیں گے جتنا کہ یہاں اس دنیا کی مخزونہ دولت سے ان کے اس تخیل کو (SAMUEL BUTLER) نے اپنی کتابوں میں یوں ظاہر کیا ہے کہ بے شمار مصنفین کہتے ہیں کہ ہم خدا اور دولت کی ساتھ ساتھ پرستش نہیں کر سکتے ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ آسان نہیں لیکن قابلِ حصول چیز ہے

آسان ہوتی ہی کب ہیں۔؟

ہمارے اصول کچھ ہی کیوں نہ ہوں، واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہم تنگ کے پکے معتقد ہیں؛ ہم دولت کے اتنے ہی دلدادہ ہیں اور ہمارا یہ اعتقاد کہ دولت ہی فرد و سلطنت کی عظمت کا باعث ہوتی ہے اس قدر راسخ ہے کہ اس سے دنیا کے دو محرک اصول قائم کئے گئے ہیں جو کہ اعلیٰ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک عدم مداخلت کا معاشی اصول ہے جو کہ انیسویں صدی پر غالب رہا، اس اصول کا دعویٰ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے عمل کو زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پر منحصر رکھتا ہے گویا ان کا مذہب لذتیت یہ ہے کہ عمل کا محرک لذتِ جذبات دلی نہیں بلکہ لذتِ تقاضائے دولت ہے۔

دوسرا اصول جو کہ بیسویں صدی میں غالب نظر آتا ہے، مارکس کا اصول معاشی تقدیر و تنظیم ہے، یہ اصول بتلاتا ہے کہ انسان کا معاشی نظام ہمیشہ ان کی مالی ضروریات پر مبنی ہوتا ہے اور یہی نظام اُن کے ادب، اخلاقیات، مذہب، منطق نیز نظام حکومت کا خالق ہوتا ہے، ان دونوں اصولوں کی مقبولیت کا انحصار اسی قدر و منزلت پر ہے جو کہ ہمارے مرد و عورت نمایاں طور پر دولت کے انفرادی اور سیاسی سیادتِ حسن پر رکھتے ہیں۔[1]

یہی مصنف اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے۔"[2]

مسٹر جان گنتھر مشہور امریکی اخبار نویس نے اپنی کتاب INSIDE EUROPE میں اس زر پرستی کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:۔

---

[1] PHILOSOPHY FOR OUR TIMES P.P. 338-40

[2] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 84, 115

• انگریز ہفتہ میں چھ روز بیشتر تو بینک آف انگلینڈ کا رخ کرتا ہے صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رخ کرتا ہے:

خدا فراموشی و خود فراموشی

ان لوگوں سے جو کسی دوسری زندگی پر ایمان اور لذت و منفعت یا شخصی و قومی سربلندی کے علاوہ کسی مقصد عالی پر یقین نہیں رکھتے اور اللہ سے ان کو کچھ ایسا ہی سا برائے نام تعلق ہے اس کی توقع کرنا کہاں تک صحیح ہو گی کہ ان میں کسی مصیبت یا خطرہ کے موقع پر تضرع اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو گی قرآن مشرکین کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خطرہ اور مصیبت کے وقت خدا ہی کو پکارتے تھے اور ان کو ایسے موقع پر صرف خدا ہی یاد آتا ہے لیکن یورپ کے مادہ پرست مادیت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں اور ظاہری اسباب و عقل ان پر اتنے غالب آگئے ہیں ان کی زندگی میں خدا سے اتنا استغنا اور دلوں میں اتنی سختی اور بے حسی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ قرآن مجید کی ان آیتوں کا مصداق بن گئے ہیں:-

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ
فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ
لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ
فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن
قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام ۴۲-۴۳)

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف رسول
بھیجے پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں
گرفتار کیا تاکہ وہ خدا کے حضور میں عاجزی کریں
پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب ان پر ہمارا عذاب آیا
لیکن (اصل یہ ہے کہ) ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان
نے ان کے کاموں کو آراستہ کر کے دکھایا۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ فَمَا
اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ
(المؤمنون ۷۶)

اور ہم نے پکڑا تھا ان کو آفت میں پھر نہ عاجزی کی
اپنے رب کے آگے اور نہ گڑگڑائے۔

چنانچہ آپ کو جنگ کے سخت ترین موقع اور نازک ترین گھڑیوں میں بھی خدا کی طرف توجہ و انابت کی کیفیت دل کی شکستگی اور شان عجز و بندگی نظر نہ آئے گی اور نہ قوم کے اخلاق و اعمال اور تفریحات و دلچسپیوں میں کوئی فرق نظر آئے گا مغرب کے مفکرین اس ضبط اور بے حسی کو تحمل کہتے ہیں اور اس کا نام ان کے یہاں استقلال نفس، قوت قلب اور قومی عزت نفس و خودداری ہے، مشرقی خدا پرست اور مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہی قساوت قلب، غفلت، لہو و لعب میں انہماک اور بدہوشی و خود فراموشی ہے۔

"لندن کی ایک رات" کے عنوان کے تحت لندن میں بسنے والے ایک ہندوستانی مسلم[1] کے ہوائی حملوں کے زمانہ کی آپ بیتی سناتے ہیں:-

> "اس رات ہم سب دوست احباب کئی دن اور کئی رات کے متواتر حملوں سے تنگ آکر ایک نہایت پرتکلف کی محفل ہندوستانی دعوت کے انتظام میں مصروف تھے، مالک مکان نے اپنا باورچی خانہ اور اس کا سب سامان حوالے کر دیا تھا اور پیانو اور گراموفون بھی ناچ کے لئے خالی کر دیا تھا، کوئی چھ بجے ہوں گے اور ہم دسترخوان پر بیٹھے، کھانا آگیا، کھانا کھا کر ہم لوگ ناچ رہے تھے کہ دفعۃً خطرہ کا سائرن بجا، پہلے تو ایک دم سب خاموش ہوگئے مگر پھر چند منٹ کے بعد ایک بولا کیا مصلحت ہے؟ ایک لڑکی نے جواب دیا ناچتے رہیے، چنانچہ ہم سب ناچتے رہے، اور گراموفون اور قہقہوں سے سارا مکان تو کیا سارا محلہ گونجنے لگا۔"

اس اقتباس سے پہلے اوپر کی سطریں یہ ہیں:-

> "ٹھیک دس دن کے بعد یہ معمول ہوگیا کہ روز شام کے وقت سات آٹھ بجے سائرن بجا، دشمن کے ہوائی جہاز کی گھڑگھڑ سنائی دینے لگتی، سرچ لائٹ کا عجب سماں

---

[1] ہوائی حملہ، مصنفہ ترجمہ حضرت مولوی ذکی ایم اے۔

آسمان پر چھا جاتا تو میں دھنسنے لگتیں اور زمین و آسمان ہل جاتے اس وقت اگر سینما ہوتا تو تصویر کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے بند ہو جاتا اور پردہ پر یہ لفظ آ جاتے "ابھی ہوائی حملہ شروع ہوا ہے مگر تصویر جاری رہے گی جو لوگ پناہ خانہ میں جانا چاہیں ان کا راستہ نیچے بائیں طرف کو ہے" مگر سب بیٹھے رہتے اور تصویر پھر جاری ہو جاتی[1]۔

اس تفریحی انہماک اور خود فراموشی کی مثال قدیم یونان و روما کی تاریخ میں مل سکتی ہے، تاریخ کی روایت ہے کہ پامپی آئی کا کوہ آتش فشاں جب پھٹا ہے اور آسمان سے آگ کے شعلے اور انگارے برسے اور زمین سے زلزلہ آیا ہے تو دن کا وقت تھا اور لوگ ایمفی تھیٹر میں اس عظیم الشان منڈوے میں جس میں بیک وقت بیس ہزار انسانوں کا جلسہ گاہ تھا، بیٹھے ہوئے سدھے ہوئے درندوں کو زندہ انسانی جسموں کو نوچتے کھسوٹتے اور دانتوں سے نوچتے اور چیرتے پھاڑتے دیکھ رہے تھے، اس ظالمانہ لہو و لعب کی عین مشغولیت میں زلزلہ آیا اور آگ آسمان سے برسنا شروع ہوئی کچھ جہاں بیٹھے بیٹھے تھے وہیں جل کر اور بھسم ہو کر رہ گئے کچھ باہر نکلے تو ان پر گندھک جیسے جسم پر سے سر نکل گئے کتنے یہیں ختم ہوئے کچھ خوش نصیب تھے جنہوں نے کشتیوں اور جہازوں میں بھاگ کر جان بچائی، شہر اٹھارہ سو برس تک دنیا کے نقشہ سے غائب ہو گیا، انیسویں صدی کے وسط میں پتہ چلا کہ معدوم نہیں ہوا ہے صرف گرد و غبار کی کثرت سے چھپ گیا ہے کھدائی شروع ہوئی اور برسوں کے بعد شہر عبرت کا عجائب خانہ بنا ہوا اسی طرح جوں کا توں نکل آیا۔

أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَى أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝ (الاعراف - ۹۸)	کیا بستیوں والے اس بات سے نڈر ہو گئے کہ ہمارا عذاب آ پہنچے دن چڑھے جب وہ کھیل میں مشغول ہوں۔

---

[1] ہوائی حملہ ختم

خدا شناس، خدا پرست انسانوں کا طرزِ عمل اور سیرت و اخلاق جنگوں اور خطرات کے موقع پر اس طرزِ عمل سے جس قدر مختلف اور مباین ہے اس کا اندازہ کچھ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ	اے ایمان والو! جب تمہارا دشمن سے سامنا
فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا	ہو تو ثابت قدم رہو اور اس موقع پر اللہ کو
لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الانفال۔ ۴۵)	زیادہ سے زیادہ یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

صحابۂ کرام بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی پریشان کن امر پیش آتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فوراً نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے۔ بدر کے معرکہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صفیں برابر کیں اور عریش میں تشریف لا کر اللہ سے مناجات اور گریہ و زاری شروع کر دی آپ فرماتے جاتے تھے کہ۔

"اے اللہ اگر یہ جماعت آج ہلاک ہو گئی تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہ جائے گا۔"

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

مغربی مزاج ایک مشرقی کی نظر میں

بس مادیت طبیعی تاریخی اور علمی اسباب کی بنا پر تاریخ کے قدیم ترین عہد سے مغربی تہذیب اور مغربی زندگی کی روح اور اس کا مزاج بن گئی ہے مغرب کے اس امتیاز کی طرف مغرب و مشرق کے متعدد علماء نے توجہ دلائی ہے علماء مشرق میں سے صاحب نظر اور صاحب فراست سیاح عبد الرحمٰن کواکبی (م ۱۳۲۰ھ) نے اس صدی کی ابتدا میں اپنی کتاب "طبائع الاستبداد" میں اس حقیقت کا ذکر کیا ہے :۔

"مغربی اپنی زندگی میں مادہ پرست، طبیعت کا مضبوط اور معاملہ کا سخت ہوتا ہے، اس کی طبیعت خود غرض، کینہ ور اور انتقامی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بلند اصولوں

اور شریفانہ جذبات میں سے اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا جو مشرقی مسیحیت نے
اس کو عطا کئے تھے، ایک جرمن ہی کو لو، مزاج کا خشک اور طبیعت کا اکھڑ، اس کے
نزدیک ایک کمزور انسان زندہ رہنے کا مستحق ہی نہیں، اس کے نزدیک ہر قسم کی برتری
قوت ہی میں پائی جاتی ہے اور قوتوں کا سرچشمہ مال ہے وہ علم کا ضرور قدردان ہے
لیکن مال ہی کے خاطر، وہ عزت کا بھی شائق ہے لیکن مال ہی کی غرض سے، لاطینی
اور اطالوی کی فطرت میں خود پسندی اور تنگ عقلی ہے اس کے نزدیک عقل نام ہے
آزادی اور بے قیدی کا، زندگی کہتے ہیں بے حیائی کو، عزت نام ہے زینت و لباس
اور لوگوں پر غالب آجانے کا۔

مغربی فطرت و نفسیات کی یہ صحیح تفسیر و تحلیل ہے، مرحوم کرد علی نے ان دو قوموں کو تو
محض نمونے کے طور پر انتخاب کیا، ورنہ جزئی یا قومی خصائص کے علاوہ مادہ پرستی، دولت
کے عشق، خود غرضی اور مسابقت میں مغرب کی ساری قومیں شریک ہیں۔

روحانیت میں مادیت

یہ مادہ پرستانہ روح یورپ کے تمام سیاسی اجتماعی اور اخلاقی قدیم و جدید نظامات میں
جاری و ساری نظر آنے لگی حتیٰ کہ اس روحانی تحریک کی جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے
روح بھی مادیت ہی ہے وہ بھی دوسری صنعتوں اور فنون کی طرح ایک سائنس اور آرٹ ہے جس کا
مقصد یہ ہے کہ عالم روحانیت کے عجائبات کی سیر کی جائے اس کے اسرار معلوم کئے جائیں مجرد
روحوں سے بات چیت کی جائے اور تفریح و تسکین نفس کا سامان بہم پہنچایا جائے مشرق کی اسلامی
روحانیت و تصوف کے برخلاف اس کا تزکیہ نفس، اصلاح قلب، خشیت الٰہی، عمل صالح، اور بے نفسی

اور موت کے بعد کی زندگی اور اس کی تیاری سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح سے وہ کام جن میں اہل یورپ میں لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں محض مادی اغراض کے لئے ہوتے ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو کسی نہ کسی مادی غرض و غایت پر وہ مبنی اور ختم ہوتے ہیں مثلاً شہرت، تاریخ میں تذکرہ، جذبۂ مسابقت، قومی و وطنی اعزاز و فخر، ان میں کہیں خدا کی رضا مطلوب نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف مسلمان ہر کام میں خدا کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے اور رضاء الٰہی کی رضا کے لئے عمل کرنا چاہتا ہے جو چیزیں مغرب میں اعلیٰ مقصود ہیں وہ یہاں قابل احتراز اور لائق اجتناب ہیں جو چیز مغرب میں فخر و ناز کی ہے مسلمان کے لئے ننگ و عار ہے ؎

آنچہ فخر تست آں ننگ من است

قرآن مجید کی آیت ہے:-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا	کہو ہم تمہیں خبر دیں کہ وہ لوگ اپنے کاموں
الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ	میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے جن کی ساری
الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ	کوشش دنیا کی زندگی میں کھوئی گئی اور وہ
صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ	اس دھوکہ میں پڑے رہے کہ وہ خوب کام کر رہے
رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ	یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی آیتوں سے
فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا	اور اس کے حضور میں حاضر ہونے کے منکر ہوئے
(الکہف ۱۰۳-۱۰۵)	پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور ہم
	قیامت کے دن ان کا کوئی وزن تسلیم
	نہ کریں گے۔
وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ	اور دنیا میں جو یہ لوگ عمل کر گئے ہیں ان کو

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۞ (الفرقان ـ ۲۳) — طرف ہم متوجہ ہوں گے اور ان کو اعمال رائیگاں کر دیں گے جیسے بکھری ہوئی دھول۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری کی بنا پر لڑتا ہے ایک شخص غیرت و جوش میں آکر اور ایک شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے ان میں سے کون سا اللہ کے راستہ میں شمار ہوگا؟ آپ نے فرمایا صرف وہ جنگ جو اس غرض سے کی جائے کہ اللہ کی بات اونچی ہو وہی فی سبیل اللہ ہے۔ اس اصول و حقیقت کے جو لوگ قائل تھے ان کو اپنے کاموں اور نیکیوں کے چھپانے کا بڑا اہتمام رہتا تھا اور اس پر بھی ہر وقت ریا کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خاص دعا کے الفاظ ہیں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ عَمَلِیْ کُلَّہٗ صَالِحًا وَّاجْعَلْہُ لِوَجْھِکَ خَالِصًا وَّلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِیْہِ شَیْئًا یعنی اے اللہ میرے تمام اعمال کو صالح بنا اور ان کو خالص اپنی ذات ہی کے لئے رکھ اور اپنے سوا کسی کا اس میں حصہ نہ بنا۔

اقتصادی وحدۃ الوجود

مادی نقطۂ نظر والے بھی طریق فکر و سبب میں استغراق و فنا کے ایسے درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ معنویات، اخلاص اور دلائل عقل سب کو بالکل بھول گئے۔ فلسفۂ اشتراکیت کا امام کارل مارکس (KARL MARX 1818–1883) اس مادی استغراق اور فنا کی بہترین مثال ہے، اس کے نزدیک پوری انسانی تاریخ (سوائے اس زمانہ کے جب زندگی عالم طفولیت میں تھی) معاشرتی طبقوں کی باہمی جنگ کی داستان ہے وہ اقتصادی پہلو کے علاوہ انسانی زندگی کے تمام دوسرے پہلوؤں کی اہمیت اور اثر کا منکر ہے وہ دین، اخلاق، روح، قلب حتیٰ کہ عقل کو کوئی وزن نہیں دیتا اور اس کے نزدیک ان میں سے کسی کو بھی انسان کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، تاریخ کی تمام جنگیں اقتصادی

و انقلابات محض ایک انتقام تھا جو چھوٹا اور خالی پیٹ ایک بڑے اور بھرے ہوئے پیٹ سے لینا چاہتا تھا، وہ محض ایک جدوجہد تھی جو اقتصادی نظام کی تشکیل جدید اور ذرائع پیداوار کے طریقوں کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں پیش آئی اور اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مذہبی جنگیں بھی اس کے نزدیک اقتصادی طبقات کی باہمی کش مکش کا نتیجہ تھیں ایک جماعت دولت کے ذرائع اور پیداوار کے طریقوں پر قابض ہو گئی تھی اور دوسری اس میں شرکت کرنا اور اپنا واجبی حصہ لینا چاہتی تھی یا ان کی از سر نو تشکیل و تنظیم کرنا چاہتی تھی پہلی جماعت کے مدافعت کرنے پر وہ جنگیں شورشیں اور انقلابات واقع ہوئے جن کو تاریخ مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے یہ ایک طرفہ فلسفہ کسی مذہبی جہاد کسی دینی اصلاح کسی روحانی جدوجہد کو اس کلیہ سے مستثنیٰ کرنے کے لئے تیار نہیں یہ ہے مغرب کا مادی تصوف اور یورپ کا اقتصادی فلسفہ وحدۃ الوجود۔

یورپ کا نعرہ "لاموجود الا البطن والمعدۃ"

چونکہ مشرقیوں پر روحانیت اور خدا شناسی اور خدا طلبی کا غلبہ تھا اس لئے اس سلسلہ میں جن لوگوں پر استغراق طاری ہوا اور مغلوب الحال ہوئے انہوں نے اللہ کے سوا ہر شے کے وجود کی نفی کی اور غلبہ حال میں لاموجود الا اللہ کا نعرہ بلند کیا، یورپ کے مفکرین پر چونکہ مادیت کا غلبہ تھا اور اس میں ان کو درجۂ استغراق و فنا حاصل تھا اس لئے اپنے غلبۂ حال میں انہوں نے اقتصادی پہلو کے علاوہ ہر چیز کی نفی کی اور لاموجود الا البطن والمعدۃ کی آواز بلند کی، مشرق کے صوفی انسان کو سایۂ ربانی سمجھتے تھے اور بعض مغلوب الحال "انا الحق" پکار اٹھتے تھے، مغرب کے مادہ (یا معدہ) پرست انسان کو صرف ایک وجود حیوانی سمجھتے ہیں اور آج ہر طرف سے انا [illegible]ت کی صدائیں آ رہی ہیں۔

ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کا اثر

یہ محض خیال آرائی نہیں ہے انیسویں صدی عیسوی سے یورپ میں ایسے نظریات و علمی تحقیقات پیش آئے جن سے انسان اور اس کے مسائل زندگی کے متعلق حیوانی نقطۂ نگاہ کی تائید اور تقویت ہوئی ڈاروِن نے ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب اصل الانواع ORIGIN OF SPECIES میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ جانور ہے جو اپنے ہزاروں سال کے نوعی سفر میں منزل بمنزل درجہ بدرجہ AMOEBA سے بندر اور بندر سے انسانی شکل کو پہونچا اس کتاب نے سارے یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وقت کا سب سے بڑا موضوع بحث اور موضوع سخن بن گیا اس نظریۂ ارتقاء نے انسانی مسائل پر غور کرنے کا رُخ بدل دیا اور حیوانات کی تاریخ نشأ وارتقاء اور ان کے عادات واطوار وخصائص سے خاص دلچسپی پیدا کردی اس نظریے نے اعتقاد پیدا کردیا کہ کائنات بغیر کسی غیر طبیعی طاقت کی مداخلت کے چل رہی ہے اور طبیعی قوانین کے علاوہ اس کی کوئی علت نہیں۔

مبادی اور نتائج اور ذہنی واخلاقی اور عملی اثرات میں یہ نظریہ دین سے متناقض ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل دین ہے جو کسی اور دین کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا اہل مذہب کی مخالفت اور ان کے خطرات اس بارہ میں حق بجانب تھے پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:-

"اس پریشانی اور اضطراب کا اندازہ لگانا ہمارے لئے اس وقت مشکل ہے جو کہ اصلاف کو ڈاروِن کی کتاب کے نتائج سے پیش آیا یا ان شہادتوں سے جن پر اس کے نتائج مبنی تھے ڈاروِن نے ثابت کیا یا خیال کیا جاتا ہے کہ ثابت کیا کہ کرۂ ارض پر زندگی کا ارتقاء امیبا AMOEBA اور جیلی فش JELLYFISH کے ابتدائی ظہور سے

اس کی ابتدائی شکلوں تک مسلسل درجہ بدرجہ ہر نسل کے ترقی یافتہ ترین اور آخری شکل ہیں۔

اس کے برعکس ڈارون کے زمانے کے لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ انسان پہلے خوب صورت تھا اس

مخلوق تھا اور اس نے درحقیقت فرشتے کے درجہ سے تنزل کیا ہے لیکن ڈارون کے نزدیک انسان

ایک ترقی یافتہ بندر ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بڑا خوش گوار لگا کہ انسان ایک زوال پذیر

فرشتے کے بجائے ایک ترقی یافتہ بندر ثابت ہو، ان کو یہ نظریہ بالکل پسند آیا اور انھوں نے

انسان کو اس مخمصہ سے نجات دے دی اور اس معیار کو دوبارہ پانے کی عظمت کی کوشش سے بچا لیا؟

علمی اور تحقیقی طور پر مختلف نقائص اور خلا موجود ہونے کے باوجود عوام اور لوگوں کی اکثریت نے بے سمجھے اور بے سوچے اس نظریہ کو قبول کر لیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہن پہلے سے اس کے لئے تیار تھے۔ لوگوں کو اس میں ایک خوبی یہ بھی نظر آئی کہ وہ مذہب اور اہل مذہب کا حریف تھا۔ اہل مذہب کے لئے حیاتیات اور ڈارون کے اس بڑھتے ہوئے دھارے اور رسائل و مطبوعات کے اس سیلاب کا مقابلہ ناممکن ہو گیا اور بالآخر کلیسا نے اس جنگ میں ہتھیار ڈال دیئے۔

خیالات، تہذیب، ادب، سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں پر اس نظریہ نے بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔ عہد فطرت کی طرف بازگشت کا خیال، عریانی کا ذوق اور بہت سے اعمال و اخلاق اسی خیال کا نتیجہ ہیں کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ بندر ہے۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بقول مسٹر جیرڈ انگلستان میں ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جو انسانوں کی خانگی زندگی کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہے، وہ صرف حیوانات کے گلہ کی زندگی ہی سے واقف ہے![1]

وطنیت و قومیت کا نشو و نما

اوپر گزر چکا ہے کہ وطنیت و قومیت کا جذبہ، قومی فخر اور جغرافیائی تقسیم کا نیا پیمانہ

---

[1] (GUIDE TO MODERN WICKEDNESS : P. 235-36)

مغربی فطرت کا تقاضہ ہے جو مغربی نسل میں برابر منتقل ہوتا رہا ہے۔ مسیحیت جب یورپ میں پہنچی تو اگرچہ وہ اپنی اصل شکل میں نہ تھی اور اس میں کمزوری پیدا ہو چکی تھی لیکن اس میں بہرحال حضرت مسیح کی تعلیمات کا اثر اور آسمانی مذاہب کی خصوصیات تھیں۔ مذہب خواہ کتنا بگڑ جائے نسل و وطن کی بنا پر انسانوں کے درمیان تفریق کا قائل نہیں ہو سکتا اس لئے اس نے یورپ کی منتشر قوموں کو رومی کلیسا کے ماتحت دین کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا اور عیسوی دنیا کو ایک خاندان بنا دیا! تاریخ اخلاقیات کے مصنف کے بقول حب وطن اور قومی عصبیت عام خلائق دوستی میں منتقل ہو گئی اور اس ذہنی تبدیلی کا اندازہ مسیحی علماء کے اقوال سے ہوتا ہے مثلاً ترتولین کہتا ہے کہ ہم ایک جمہوریت کو جانتے ہیں اور وہ عالم ہے اور یہی کہتا ہے کہ ہمارا ایک وطن ہے جس کی بنا منشاء خدا سے پڑی ہے۔

لیکن جب لوتھر (MARTIN LUTHER) (۱۴۸۳ء - ۱۵۴۶ء) نے اپنی مشہور دینی اصلاحی تحریک کا علم بلند کیا اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم سے مدد لی اور بالآخر رومی کلیسا کو اس مقابلہ میں شکست ہوئی تو قومیں جو اب تک دین میں گندھی ہوئی تھیں اس کی لڑی ٹوٹ گئی اور وہ منتشر و متفرق ہو گئیں۔ وہ روز بروز اندرونی طور پر خود مختار ہوتی گئیں۔ یورپ میں مسیحیت کے زوال کے ساتھ ساتھ قومیت و وطنیت کا عروج ہوتا گیا گویا کہ دین و مذہب اور قومیت و وطنیت ترازو کے دو پلڑے تھے کہ جس قدر ایک نیچا ہوتا تھا اسی قدر دوسرا اونچا ہوتا تھا اور یہ معلوم ہی ہے کہ دین کا پلڑا ہلکا ہی ہوتا چلا گیا اس لئے اس کے حریف یعنی قومیت و وطنیت کا پلڑا بھاری ہوتا گیا۔ مشہور انگریز فاضل لارڈ لوتھین (LORD LOTHIAN) نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"جب لوتھر کی تحریک نے (جس کو دینی اصلاح کی تحریک کہا جاتا ہے) یورپ کی

ثقافتی (کلچرل) اور دینی وحدت کا خاتمہ کر دیا تو براعظم مختلف قومی حکومتوں میں تقسیم ہو گیا جن کے جھگڑے اور مقابلے دنیا کے امن کے لئے ایک دائمی اور مستقل خطرہ بن گئے۔

دینی انحطاط اور دینی اصول و اخلاق کے زوال کی وجہ سے قومیت اور وطنیت کے طرز خیال کو جو فروغ ہوا اس کی طرف بھی فاضل موصوف نے متوجہ کیا ہے:-

"دین جو انسان کا ضروری رہنما، اخلاقی مقصد کے حصول اور انسانی زندگی کی عزت اور معنویت کا واحد ذریعہ ہے اس کے اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا ایسے سیاسی مذاہب خیالات کی گرویدہ ہو گئی جن کی بنیاد نسل اور طبقات کے اختلاف پر ہے علوم طبعی کے اثر سے اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مادی ترقی ہی اعلیٰ مقصد ہے اسی وجہ سے زندگی کی مشکلات اور اس کی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے لئے اپنی روح اور زندگی کے درمیان ایسی تطبیق دینا مشکل ہو گیا جو اس کو اس عصر کی سب سے بڑی مصیبت قومیت سے نجات دے سکے:"

مغرب کا تکبر اور مشرق کے خلاف تعصب

مذہبی نظام کی شکست اور جذبۂ قومیت کے فروغ کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ پورا یورپ پورے مشرق کے مقابلہ میں ایک حریف کیمپ بن گیا اس نے مغرب و مشرق آرین نسل اور دوسری نسلوں کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ لیا اور یہ طے کر دیا کہ اس خط کے اندر جتنی قومیں یا تہذیبیں ہیں اور مسلّم واجب التسلیم ہیں ان کو دنیا کی تمام قوموں، تہذیبوں اور علم و ادب پر برتری اور فوقیت حاصل ہے ان کو حکومت کرنے، باقی رہنے اور پھولنے پھلنا چاہیے اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو مغلوب و محکوم رہنا چاہیے اور زندگی و ترقی کا کوئی حق نہیں یا یہ کہ یہی طرز خیال اپنے زمانہ میں یونانیوں اور

دیوں کا تھا۔ وہ دنیا میں صرف اپنے کو مہذب شمار کرتے تھے اور باہر کی ہر چیز کو خصوصاً جو چیز بحر اٹلانٹک کے مشرق میں واقع ہو بربری کے نام سے پکارتے تھے۔

قومیت کی حد بندیاں

یورپ کی قوموں اور سلطنتوں نے اپنے کو ایک مستقل دنیا فرض کر لیا ہے قدرت نے پہاڑوں اور دریاؤں کے بڑی طبعی حدود قائم کر دیئے ہیں اور قوموں نے نئے گرد سب اسی مقصد اور استحکام کے چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ لئے ہیں ان کے نزدیک ان کے باہر دنیا و انسان کا وجود نہیں پایا جاتا ان کو ان حدود کے باہر کسی چیز کا احترام اور قدر نہیں انھوں نے تو وطن کو ایک مستقل معبود بنا لیا ہے اور عبادت و تقدیس کا جتنا تعلق عابد و معبود کے درمیان ہوتا ہے انھوں نے اس خود ساختہ معبود کے ساتھ قائم کر لیا اسی کے لئے ذات کی قربانیاں ہیں اسی کے راستے میں جنگ ہے اسی کی خاطر جینا اور مرنا ہے اسی پر چڑھاوے کے لئے مختلف صنعتیں اور انسانوں کا خون بہایا جاتا ہے اس دین قومیت کا عقیدہ اولین یہ ہے کہ قوم ہر چیز پر مقدم اور ہر چیز سے بالا و برتر ہے اس قوم سے افضل زیادہ شریف زیادہ ذکی زیادہ طاقتور حکومت و سیادت، قوموں کی نگرانی و ہدایت اور دنیا کی حفاظت کی اہل سطح زمین پر کوئی دوسری قوم نہیں پائی جاتی اس کے دریاؤں کا پانی امرت اس کی مٹی سونا اور اس کے کانٹے پھول ہیں۔ یہ دین قومیت کسی انسان کو کسی ملک میں بسنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دیتا جب تک وہ اس پر ایمان نہ لائے۔

قوم پرستی کا تخم ایک ہی طرح کے برگ و بار لاتا ہے یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم قوم پرستی پر ایمان رکھتی ہو اور دست درازی نہ کرتی ہو یا کرنا چاہتی ہو اور اپنے سوا دوسروں کی تحقیر و تنقیص سے پاک ہو جیسے کہ یہ ممکن نہیں کہ انسان شراب کے جام پر جام چڑھائے اور نہ وہ بہکے نہ اسے نشہ آئے

درمیاں قعر دریا تختہ بندم کردۂ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

خصوصاً جب کہ علم، ادب، شعر، فلسفہ، تاریخ، یہاں تک کہ علوم طبعیہ اس نشۂ قومیت کو اور تیز اور اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہتے ہیں اور ہر طرح سے قوم میں خودبینی، غرور، تعلّی اور اپنے ماضی پر فخر و تکبر کی پرورش ہوتی رہتی ہے اور کسی قسم کی اخلاقی اور مذہبی رکاوٹ نہیں ہوتی اور دنیا کی باگ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو قومی شوکت و عظمت کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتے۔

قوم پرستی کے عناصر نفرت اور خوف

نفرت اور خوف قوم پرستانہ زندگی کے ضروری عناصر ہیں جن کے بغیر اس میں جان نہیں آتی، قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک کہ قوم کے لئے کوئی چیز نفرت کرنے کے لئے اور کچھ ڈرنے کے لئے نہ ہو، چنانچہ قومی رہنما نفرت اور خوف کے ذریعہ سے اس کے جذبات برانگیختہ کرتے رہتے ہیں اور اس کی اس دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان و اشتعال اور جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں، وہ نفرت اور خوف کی آگ بجھنے نہیں دیتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا کر چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بڑھا کر اور کسی نہ کسی حقیقی یا فرضی حریف کو سامنے لا کر قوم کے جذبۂ نفرت و خوف کو زندہ اور متحرک رکھتے ہیں اور اسی میں اپنی حکومت یا قیادت کی زندگی اور اپنی بقا سمجھتے ہیں، پروفیسر جوڈ نے اس کی جو فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل و توجیہ کی ہے ـــ وہ حسب ذیل ہے۔

"وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جن کے ذریعہ بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم یا عشق اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لئے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں

وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کرلیں جس سے
وہ نفرت کرے اور اس کے لئے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کرلیں جس سے وہ ڈرے۔
میں بھی اگر قوموں کو متحد کرنا چاہوں تو مجھے چاہئے کہ میں ان کے لئے کسی اور سیارہ پر
کوئی دشمن ایجاد کروں، مثلاً چاند پر جس سے یہ سب قومیں ڈریں۔ اس بنا پر قطعاً حیرت
کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ مسلسل کرتی ہیں نفرت
اور خوف ہی کے جذبات کے زیر اثر ہیں انہیں جذبات پر ان سلطنتوں پر حکمرانی کرنے
والوں کی زندگی موقوف ہے اور انہیں جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد ہے[1]۔

واقعہ یہ ہے کہ خالص قوم پرستانہ ذہن اور اس کا طریقۂ کار (TECHNIQUE) یہی ہے کہ
نفرت اور خوف کو قائم رکھا جائے انہیں دو جذبات پر گزشتہ و موجودہ قوم پرست حکومتوں کی
بنیاد رہی ہے اور انہیں دونوں جذبات نے اُن بڑی بڑی جنگوں کو پیدا کیا ہے جن کی داستان
تاریخ میں نظر آتی ہے اور جن کے آثار دنیا میں ابھی موجود ہیں۔ اسلام اس قوم پرستی کو، جو اپنی قوم کی
جا و بے جا پاسداری اور دوسروں سے نفرت اور خوف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور جس میں اصول
وصداقت کا سوال نہیں، "عصبیت" اور "حمیتِ جاہلیت" قرار دیتا ہے اور ہر ایسی امداد
وحمایت و جوش و حمیت اور جنگ و جدال کو حرام قرار دیتا ہے جس کی بنیاد محض قومی یا جماعتی
عصبیت پر ہو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرمایا:۔

لیس منا من دعا الی عصبیۃ — وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی جتھہ بندی
ولیس منا من قاتل علی عصبیۃ — کی دعوت دے، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے
ولیس منا من مات علی عصبیۃ[2] — جو کسی جتھہ بندی اور پاسداری کے لئے

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 150-51
[2] ابوداؤد۔

جنگ کرے، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے

جو جتھہ بندی کی حالت میں مرے۔

جو شخص اس قوم پرستی اور جاہلی عصبیت کی جنگ میں مارا جائے اس کی موت "جاہلی" (غیر اسلامی) قرار دی گئی ہے، اور ایک حدیث میں اس کو امت سے خارج بتلایا گیا ہے۔

من قاتل تحت رأیة عمیة یغضب بعصبیة او یدعو الی عصبیة او ینصر عصبیة فقتل فقتلة جاھلیة۔[1]

جو شخص کسی اندھا دھند جھنڈے کے نیچے کسی جتھہ بندی کے جوش حمایت میں یا کسی جتھہ بندی کی دعوت میں یا کسی جتھہ بندی کی امداد میں جنگ کرے گا اور مارا جائے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

ومن قتل تحت رأیة عمیة یغضب للعصبیة ویقاتل للعصبیة فلیس من امتی۔[2]

جو کسی اندھا دھند جھنڈے کے نیچے کسی پاسداری کے جوش میں یا پاسداری کی جنگ میں مارا جائے گا تو وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

اسلام نے عالم انسانی کو دو ہی حصوں میں تقسیم کیا ہے خدا کے پیرو اور حق کے حامی، شیطان کے پیرو اور باطل کے حامی۔ اس نے صرف شیطان کے پیروؤں، باطل کے حامیوں، زمین میں فساد کرنے والوں اور ظلم و سرکشی اور فسق و فجور پھیلانے والوں سے نفرت رکھنے اور ان کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا ہے خواہ وہ کسی نسل اور وطن سے تعلق رکھتے ہوں، نفرت اور جنگ کے لئے اس کے یہاں تقسیم قومی و نسلی بنیادوں اور ملکوں اور شہروں کے حدود پر نہیں ہے بلکہ اصول عقائد و اعمال اور خدا سے وفاداری اور بغاوت اور انسانیت کے لئے نفع و مضرت کی بنیاد پر ہے۔

---

[1] مسلم و نسائی [2] مسلم

قومی عظمت و تکبر

قوم پرستوں کا قاعدہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی کمزور قوموں میں بھی قوم پرستی کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اس کے ادب، زبان اور تہذیب کے حق میں قصیدہ خوانی اور اس کے عہد ماضی کی عظمت و شوکت میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ قومیں قوم پرستی کے جذبات سے مغلوب اور نشۂ قومیت سے سرشار ہو جاتی ہیں ان میں اپنے اوپر غلط اعتماد اور فخر و تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کر کے قومیت کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں محدود و محصور ہو جاتی ہیں ان کو کسی بین الاقوامی طاقت کسی عالمگیر رشتہ کی پروا نہیں ہوتی اور وہ اپنے وسائل اور طاقت پر بڑا اعتماد کرتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چند گھنٹوں میں کسی بڑی طاقت کا لقمہ بن جاتی ہیں اور دنیا دور سے اس کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے اور سوائے زبانی ہمدردی کے ان کو وقت پر کوئی مدد نہیں ملتی قومیت کے حصار کو قائم کر کے اور اپنے کو دنیا سے منقطع اور ممتاز قرار دے کر وہ گویا بڑی طاقتوں کو شکار کی دعوت دیتی ہیں۔

وسط یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا اس جنگ میں جو کچھ انجام ہوا وہ دنیا کو معلوم ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اسلامی ممالک جو عالمگیر دعوت و تحریک رکھتے ہیں اور جن کے پاس ایسی طاقت ہے جو اگر ان میں اس سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو، یورپ کی قومی و وطنی اور سیاسی فلسفوں اور دعووں سے زیادہ طاقتور وسیع اور عمومی دعوت و تحریک ہے، ان کا رجحان بھی محدود قومیتوں کی طرف ہے حالانکہ وہ اپنے وسائل، سامان جنگ اور تعداد کے لحاظ سے یورپ کی ریاستوں سے کچھ زیادہ بہتر حالت میں نہیں ہیں اس لئے یہ توقع کرنا خوش فہمی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ اپنے ان محدود وسائل اور قومیت و وطنیت کے حدود کے اندر کسی خطرہ کا زیادہ دیر تک مقابلہ

کر سکیں گے ۔

قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت و عظمت

قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت و عظمت یہ ہے کہ زمین کے بڑے بڑے رقبہ پر ان کا تسلط و اقتدار ہو، ملک کے حدود وسیع اور ذرائع آمدنی وافر ہوں، اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے اور ہمسایہ قوموں یا حریف سلطنتوں کو خوف زدہ کرنے کا ان کے پاس پورا سامان ہو، ملک کے افراد میں قومی برتری، نسلی تفوق، اپنی قدیم تہذیب اور ادب و زبان اور تاریخ ماضی پر فخر و مباہات کا جذبہ پایا جاتا ہو اور دوسری معاصر قوموں کی کمزوری اور تہذیبی و ادبی بے مائیگی پر ایمان راسخ ہو، وہ ملک سلطنت کی عزت و عظمت کی خاطر بڑے بڑے مجرمانہ و وحشیانہ اعمال کا بے تکلف ارتکاب کر سکتے ہوں، اور اپنی قوم اور اس کے افراد کو حقیر سے حقیر فائدہ پہونچانے کے لئے بڑی سے بڑی حق تلفی اور ناانصافی میں ان کو باک نہ ہو، ایسی حکومت کا اخلاقی معیار خواہ کتنا پست ہو، اس کے شہری اخلاقی شعور و انسانیت کے احترام اصول کی پابندی سے خواہ کتنے ہی بیگانہ ہوں، اور وہ حکومت اور اس کے ذمہ دار اخلاقی حدود و قیود سے کتنے ہی آزاد ہوں، وہ حکومت عزت و عظمت کے بلند معیار پر قائم اور دنیا کی ایک خاص قابل احترام اور لائق تقدیس حکومت ہے، پروفیسر جوڈ نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"قومی عظمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی خواہش و ارادہ کو دوسروں پر مسلط کر سکے، یہ قومی عظمت ان قوموں کے نزدیک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے، اس کی نامعقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ اخلاقی صفات کے بالکل متضاد ہے، اگر کوئی ملک ایسا ہے جو صرف پیچ ہی برتا ہے

وعدے وفا کرتا ہے اور کمزوروں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اس کی عزت کی سطح پست ہے۔ مسٹر ملیڈون کے بقول عزت نام ہے اس قوت کا جس سے قوم خاص شرف و اعتبار کی مالک ہو اور نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ظاہر ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز و امتیاز حاصل ہو سو قوت ہے آتش فشاں گولوں اور بموں پر ان نوجوانوں کی وفاداری اور وطن دوستی چمن کا شہروں پر ان گولوں اور بموں کو پھینکنا محبوب مشغلہ ہے پس جس عزت کے لئے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے، وہ ان صفات و اخلاق کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے جن کی بنیاد پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے میرے نزدیک تو قوم کو اسی قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھنا چاہئے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو، فریب، دغا بازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لئے قطعاً باعث عزت نہیں ہے۔[1]

ہدایت یا تجارت

لادینی حکومتیں دراصل ایک ترقی یافتہ منظم اور محفوظ تجارتی ادارے ہیں، یہ حکومتیں بنیادی و اصولی طور پر نفع پہونچانے کے لئے نہیں بلکہ نفع اٹھانے کے لئے قائم ہوتی ہیں، وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اصلاحی مقصد نہیں رکھتیں نہ ان کے پیش نظر ملک یا قوم کی اخلاقی و روحانی ترقی انسانوں کی ہدایت اور انسانیت کی حقیقی خدمت و بہبود ہوتی ہے، قدرتی طور پر ان کی اصل توجہ آمدنی کے ابواب، نفع اٹھانے کی تدابیر اور سرکاری محاصل و مطالبات کی طرف ہوتی ہے، اس غرض کے لئے وہ بے تکلف اخلاق و شرافت کے اصول کو نظر انداز کر دیتی اور

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS PP. 152-53

اخلاقی تعلیمات و مصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہیں' جہاں کہیں' اخلاقیات و مالیات کا تصادم ہوتا ہے وہاں وہ ہمیشہ مالیات کو ترجیح دیتی ہیں' ہر مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر معاشی و اقتصادی ہوتا ہے اس طرز کی حکومتیں بداخلاقی و بے حیائی کی بہت سی قسموں کو کچھ قانونی قیود کے ساتھ (جو جرائم کا سدباب نہیں کرتیں بلکہ ان کو صرف نظم و ضابطہ میں لے آتے ہیں) جائز قرار دیتی ہیں' عصمت فروشی کا پیشہ ان کی حکومت میں قانوناً جائز ہوتا ہے' وہ خود وسیع پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر سودی کاروبار کرتی ہیں' مہذب ناموں سے جوے کی اجازت ہوتی ہے' ناموں کی تبدیلی اور بعض ایسے قیود کے ساتھ جو حکومت کے مفاد کو محفوظ رکھتے ہیں' بہت سے اخلاقی جرائم جائز ہوتے ہیں' شراب کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ حکومت بعض اوقات اس کی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور اس کے خلاف جد و جہد کرنے والے کو سزا دیتی ہے' سینما اور فلم سازی کی صنعت جو اپنی موجودہ روح اور شکل میں اُمّ الجرائم اور قوم میں بداخلاقی کا رجحان اور شہوانی میلان پیدا کرنے کی سب سے بڑھ کر ذمہ دار ہے' حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے اور اس کے اخلاقی نقصانات کو جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی حکومت اس کو روک نہیں سکتی' ریڈیو کا سرکاری محکمہ قوم کی اخلاقی رہنمائی اور تربیت کے بجائے داروغۂ ارباب نشاط کی خدمت انجام دیتا ہے اور قوم میں سنجیدگی اور صحیح ذوق پیدا کرنے کے بجائے اس کے فاسد ذوق اور سطحی رجحانات کا ساتھ دیتا ہے بلکہ اپنے پروگرام سے تفریحی رجحان پیدا کرتا ہے' اور تعلیم و تربیت کا ذریعہ بننے کے بجائے آلۂ تفریح بن کر رہ جاتا ہے' قانون مطابع اور حکومت کا محکمۂ احتساب جہاں سیاسیات و انتظامیات میں نہایت ذکی الحس خورد بین اور سخت گیر ہوتا ہے اور کسی ادنیٰ تنقید کو بھی بعض اوقات گوارا نہیں کرتا' وہاں اخلاقیات کے بارہ میں نہایت فراخ دل' فیاض اور بے نیاز واقع ہوتا ہے' غیر ذمہ دار اخبار نویس اور فحش نگار ادیب اور افسانہ نگار اپنے حقیر مادی فوائد کے لئے قوم میں اخلاقی طاعون

پھیلاتے ہیں لیکن جب تک پانی سر سے نہ گزر جائے حکومت کی مشینری حرکت نہیں ہوتی، اس طرزِ حکومت میں اخلاق کے ساتھ قوم کی صحت بھی محفوظ نہیں رہتی بعض تجارتی ادارے اپنے مضرِ صحت مصنوعات سے اہلِ ملک کی صحت کو مسلسل نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور لوگوں کو کمزور و بیمار بناتے رہتے ہیں لیکن حکام کو رشوت دے کر یا حکومتی و قومی اداروں کو گرانقدر مالی امداد پہنچا کر حکومت کے عتاب و احتساب سے بچے رہتے ہیں یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ حکومت کا نقطۂ نظر اور اس کا فکری محور اصول و اخلاق، ہدایت و اصلاح نہیں بلکہ مالی منفعت اور ظاہری خوشحالی ہے۔

اس طرزِ سیاست کا لازمی نتیجہ ہے کہ اہلِ ملک کے اخلاق روز بروز پست ہوتے چلے جائیں اور ایک خطرناک اخلاقی انحطاط اور اخلاقی امراض رونما ہوں، اور پوری قوم میں اور اس کے ہر طبقہ میں ناجائز دولت اور نفع اندوزی اور موقع پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جائے اور ایک عام لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو، ہر شخص دوسرے کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی کوشش کرے اور اصول و اخلاق کا مسئلہ بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اس کے برخلاف جو حکومتیں منہاجِ نبوت پر قائم ہوتی ہیں ان کی بنیاد تجارت کے بجائے ہدایت پر ہوتی ہے، خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک عامل سے (جس نے ان کے طرزِ حکومت کی وجہ سے آمدنی کی تخفیف اور حکومت کے مالی نقصان کی شکایت کی تھی) فرمایا کہ "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے محصل وصول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے" اس ایک مختصر سے جملہ میں دینی حکومت کا پورا اصول سیاست اور طرزِ حکمرانی آ گیا۔

دینی حکومت کی بڑی توجہ جمہور کے مذہب و اخلاق اور ان کے اخروی نفع و ضرر کی طرف ہوتی ہے، اس کا اصل کام خراج اور محاصل کی تحصیل و وصول اور آمدنی کا اضافہ

نہیں ہے' یہ سب چیزیں بالکل ضمنی اور ثانوی ہیں اور محض اصلاحی و دینی مقاصد کی تکمیل اور انتظام حکومت کے آلۂ کار کے طور پر ہیں' وہ تمام سیاسی و مالی امور میں دینی نقطۂ نظر سے غور کرتی ہے' دینی اور اخلاقی اصول و مبادی کو مادی فوائد و مصالح پر مقدم رکھتی ہے اس کے حدود حکومت میں سود' جوا' شراب' زنا' فسق و فجور' بے حیائی کی قسمیں اور اس کے تمام محرکات و ترغیبات اور ایسے مالی معاملات جن سے انفرادی نفع اور اجتماعی مضرت ہو' ممنوع اور خلاف قانون ہوتے ہیں' اگرچہ اس کی وجہ سے عظیم الشان مالی خسارہ برداشت کرنا پڑے اور حکومت کو وسیع آمدنی سے محروم ہونا پڑے' وہ مختلف قسم کی اصلاحات نافذ کرتی ہے' اس کو صرف قوم کے افعال و اعمال ہی سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کے رجحانات اور ذہنیت پر بھی اس کی نگاہ ہوتی ہے' اس لئے کہ اخلاقی رجحانات ہی افعال و اعمال کو وجود میں لاتے ہیں' اگر اخلاقی رجحان درست نہ ہو تو اعمال و افعال کی اصلاح اور جرائم اور بد اخلاقیوں کا سدباب کسی طرح ممکن نہیں اس لئے وہ ان تمام چیزوں پر پابندی عائد کرتی ہے جو قوم میں بد اخلاقی قانون شکنی اور نفس پرستی اور عشرت پسندی کا رجحان پیدا کرتی ہیں اور ان تمام اشخاص کو مجرم اور ملک کا دشمن گردانتی ہے' جو لوگوں میں بے حیائی اور معصیت پسندی پیدا کرتے ہیں' خواہ وہ اہل فن ہوں یا تاجر یا اہل حرفہ اس کو قیام امن و انتظام سلطنت کے ساتھ ساتھ اخلاقی نگرانی اور تہذیب نفس کا بھی پورا پورا اہتمام ہوتا ہے' اس لئے کہ اس کی حیثیت صرف پولیس اور چوکیدار کی نہیں ہوتی بلکہ ایک شفیق مربی اور اتالیق کی بھی ہوتی ہے۔

اس نوع کی حکومت کا طبعی نتیجہ وہی ہے جو قرآن مجید میں مہاجرین اولین کے تذکرہ میں ایک پیشین گوئی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ۔۔۔ یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے

أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ
وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ
(الحج: ۴۱)

زمین میں نصیب صاحب اقتدار کر دیا یعنی
ان کو حکومت ملی تو وہ نماز کا نظم قائم کریں گے
زکوٰۃ کی ادائیگی کریں گے، نیکیوں کا
حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور تمام
باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

تجارت و صنعت کا اخلاق کے ساتھ عدم تعاون

افزائش دولت کے بحرانی عہد میں یا لارڈ میکالے کے پُرمعنی الفاظ میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولتمند بن جانے کا شوق رکھنے والے لوگوں کے اقتدار میں ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع کی خاطر مصنوعی آرائش کے سامان اور لباس و زینت کے انواع و اقسام کا ایک سیلاب ہر روز کارخانوں اور صنعت گاہوں سے شہروں پر امنڈا آتا ہے بازار ہر نئی خواہش کے لباس، نئی نئی قطع کے جوتوں اور جوتیوں سے اور دوسرے سامانِ آرائش سے جگمگاتے رہتے ہیں، کچھ دنوں بعد یہ چیزیں پرانی اور فرسودہ قرار پا جاتی ہیں اور نئے نام اور ترمیم کے ساتھ نیا سامان ان کی جگہ لیتا ہے، زیب و زینت کا سیلاب روز افزوں ہے اور بڑھتا جا رہا ہے اس میں بڑا دخل کارخانوں کی اس بے ضرورت تفریح کی پیداوار اور اس سابقت و رقابت کا ہے جو تجارتی مرکزوں اور صنعت گاہوں میں کام کر رہی ہے اور جو لوگوں کے اخلاق و معاشرت نیز قوت خرید سے بالکل بے نیاز ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ زندگی روز بروز گراں اور معیار زندگی ہر گزرتے ہوئے دن سے بلند تر، زندگی کے مطالبات اور فرضی لوازم زندگی روز افزوں اور ان کی تکمیل کے لئے بڑی سے بڑی آمدنی ناکافی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قناعت ایک لفظ

بے معنی بنتا جا رہا ہے سکون و اطمینان قلب خواب و خیال ہو گیا ہے ہر شخص اپنے سامنے اپنے سے بلند معیار زندگی رکھتا ہے اور وہاں تک پہونچنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے ماحول بھی اس سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسی کی توقع کرتا ہے اور اس کے بغیر اس کو ذلیل سمجھتا ہے ایک مدت اسی جدوجہد میں گزرتی ہے جب وہ بام مقصود تک پہونچنے لگتا ہے تو وہ اور بلند ہو جاتا ہے اور ایک دوسرا بلند معیار زندگی سامنے آجاتا ہے اس طرح زندگی ایک غیر مختتم جدوجہد اور ایک ایسا ریس کا میدان ہے جس کا سرا اور کوئی انتہا نہیں اس کا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ زندگی میں تلخی اور کلفت بہت بڑھ گئی ہے اور جو گھر آسانی کے ساتھ جنت کا نمونہ ہو سکتے تھے اور جن میں زندگی کے فطری و حقیقی لوازم سب پائے جاتے ہیں کسی کی موہوم اور خیالی چیز کی کمی کی وجہ سے دوزخ کا نمونہ ہیں جہاں حقیقی عیش اور قلبی سکون مفقود ہے۔

ایک مسلمان عالم نے رومی و ایرانی تمدن کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جو کتاب کے ابتدائی صفحات میں گزر چکا ہے اس کو سامنے رکھ کر دیکھئے موجودہ تمدن کا نقشہ اس سے ذرا بھی مختلف ہے؟ اس کا اخلاقی اثر یہ ہے کہ اخلاقی حدود و ضوابط برقرار نہیں رہے محدود آمدنی میں غیر محدود مطالبات و تقاضوں اور فرمائشوں کی تکمیل رشوت اور غیر قانونی وسائل آمدنی کے بغیر ممکن نہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رشوت مختلف ناموں کے ساتھ بے محابا اور وسعت اور مخفی ذرائع آمدنی کا بازار گرم ہے اور اس سے زندگی میں جو مشکلات اور نظام میں جو ابتری پیدا ہو سکتی ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

یہ نتیجہ ہے عموماً زندگی کے فطری اور حقیقی ضروریات کے تقاضے کا نہیں بلکہ فرضی اور غیر حقیقی ضروریات کے مطالبہ کا ہے اس کی بندش محض قانونی گرفت اور انسداد رشوت کی کوشش سے ممکن نہیں اس کا ذمہ دار وہ نظام زندگی ہے جو ایک مدت سے اخلاقی ہدایات سے محروم

خودی، ایثار اور صبر کے تصور سے عاری اور وہ نظام تعلیم ہے جو اپنی لکیر یا دوہری ساخت کی
وجہ سے اخلاقی حس اور ضمیر پیدا کرنے میں اتنا ہی ناکام ہے جتنا تجارتی یا اقتصادی کاروبار یا صنعت کی
اور صنعتی کا فن ہو سکتا ہے اس کا ذمہ دار وہ نظام حکومت ہے جو آمدنی اور پیداوار کے وسائل پر قابو رکھنا
تو اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن تجارت، صنعت اور اخلاق کے باہمی تعاون و توازن کو ضروری نہیں سمجھتا۔

سائنٹفک ترقی اور عہد جدید کے اکتشافات

عہد حاضر اپنے طبیعی تحقیقات اور علمی و صنعتی اکتشافات و اختراعات کے لحاظ سے
انسانی تاریخ کا ممتاز ترین عہد ہے اور اپنے اس امتیاز کی وجہ سے بجا طور پر اس کا مستحق
ہے کہ اس کو اکتشافات و ایجادات اور برق و فولاد کے عہد کا لقب دیا جائے یورپ کی اس
اس باب میں مسلم ہے اور اس کے محققین و موجدین کی ذہانت اور مشاقی قطعاً محل بحث نہیں۔
لیکن ہم کو اس موقع پر ایک مخصوص تنقیدی نقطۂ نظر سے ان صنعتی کامیابیوں اور
اکتشافات و ایجادات کا جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان ایجادات کا مقصد کیا ہے
انھوں نے کس حد تک اپنے مقصد کو پورا کیا اور دنیا کے لئے یہ ایجادات خیر و برکت اور راحت
راحت ثابت ہوئیں یا انھوں نے دنیا کی مشکلات و مصائب میں کچھ اضافہ ہی کیا۔

صنعتی اکتشافات کا مقصد اور اسلامی تعلیمات

ہمارے نزدیک ان علمی تحقیقات اور صنعتی اکتشافات کا صحیح مقصد یہ ہے کہ انسان کو
زندگی کے فطری سفر میں اپنی لاعلمی اور کمزوری کی بنا پر رکاوٹیں اور موانع پیش آتے ہیں
ان پر قابو حاصل کیا جائے اور صحیح مقاصد کے ماتحت اس جن میں زمین میں سربلندی اور

فتنہ وفساد شامل نہیں۔ قدرت کی ان قوتوں اور دولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو اس عالم میں بکھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر انسان زمانہ قدیم میں پیدل چلتا تھا، پھر جب بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ وہ جانوروں سے فائدہ اٹھائے تو اس نے بیل گاڑیوں سے کام لیا، پھر اس نے اور سرعت پیدا کرنی چاہی تو اس نے صبا رفتار گھوڑوں کے ذریعہ دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کی، انسان کی فطرت میں قناعت اور سکون نہیں اور جذبہ مسابقت بھی اس کو کسی ایک منزل پر ٹھہرنے نہیں دیتا، اس کی ضروریات بھی بڑھتی گئیں اور راحت وسرعت کا معیار بھی بلند ہوتا گیا اور بتدریج وہ سواریاں وجود میں آگئیں جن میں سے ہر ایک پچھلے کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہے بحری سفر میں اس نے بادبانی کشتیوں سے دخانی جہازوں تک ترقی کی، حمل ونقل کے بری وفضائی آلات ووسائل بھی اس نقطہ تک پہونچ گئے جو زمانہ سابق کے لوگوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھے۔ اگر صحیح مقاصد کے ماتحت ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے، غیر ضروری مشقت اور وقت اور قوت کے غیر ضروری استعمال سے بچ کر ان کو اور کسی بہتر مصرف میں صرف کیا جائے تو یہ خدا کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سفر کی اس راحت وسہولت اور سرعت کو بطور انعام کے ذکر کیا ہے اور انسانوں پر اپنا ایک بڑا احسان بتلایا ہے کہ وہ خدا کی دوسری مخلوقات کے ذریعہ سفر اور باربرداری کی بڑی بڑی مشقتوں سے بچ جاتے ہیں اور اس کو اپنی راحت ورحمت کی ایک نشانی اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے فرمایا۔

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ — اس نے چارپائے پیدا کئے، ان میں تمہارے

وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ○ وَلَكُمْ — لئے گرم کرنے والی پوشش ہے اور طرح طرح

فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ — کے فائدے اور بھی ہیں ایسے جانور بھی ہیں

تَسْرَحُونَ ۝ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

(النحل ۵-۸)

جن کا تم گوشت کھاتے ہو اور ان میں تمہارے
لئے خوشنمائی ہے جب تم شام
کے وقت انہیں واپس لاتے ہو اور جب صبح کو
چھوڑ دیتے ہو اور یہی جانور ہیں جو تمہارا
بوجھ اٹھا کر ایسے شہروں تک لے جاتے ہیں کہ
تم وہاں تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے مگر اپنی
جان کو تکلیف کے ساتھ بلا شبہ تمہارا پروردگار
بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور بڑی مہربانی
رکھنے والا ہے اور گھوڑے خچر اور گدھے
پیدا کر دیئے ہیں کہ تم ان سے سواری کا کام
لو اور ویسے ان میں خوشنمائی اور رونق بھی ہو
وہ اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا
تمہیں خبر نہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

(بنی اسرائیل ۷۰)

اور بالتحقیق ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی
اور تری و خشکی کی قوتیں اس کے لئے کر دیں
اسے اٹھائے پھرتی ہیں اور اچھی چیزیں
روزی کے لئے مہیا کر دیں اور اپنی مخلوقات
ہم نے پیدا کی ہیں ان میں سے اکثر پر اسے
برتری اور بڑائی عطا کی۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا	اور جس نے سب چیزوں کے جوڑے بنائے
وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ	تمہارے واسطے کشتیاں اور چوپائے بنائے
مَا تَرْكَبُونَ ۝ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ	جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ چڑھ کر بیٹھو
ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ	ان کی پیٹھ پر پھر اپنے رب کا احسان
عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي	یاد کرو جب اس پر بیٹھ چکو اور کہو پاک
سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ	ذات ہے وہ جس نے اس کو ہمارے لئے بس میں
وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ ۝	کر دیا اور ہم اس کو قابو میں نہ لا سکتے تھے
(الزخرف ۱۲-۱۴)	اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے۔

حضرت سلیمانؑ پر اپنے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ	اور سلیمان کے لئے ہوا کو مسخر کیا صبح کی
وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ	منزل اس کی ایک مہینہ کی راہ اور شام کی
(سورۃ سبا ۱۲)	منزل ایک مہینہ کی۔
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ	پھر ہم نے ہوا ان کے تابع کر دی ان کے حکم
رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ (سورۃ ص ۳۶)	سے چلتی نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتے۔

لیکن ان نعمتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک خداشناس اور ناخداشناس کی نفسیات میں بڑا فرق ہے، مومن کو اس کی ہدایت ہے اور اس سے اس کی توقع کی گئی ہے کہ وہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے وقت اس بات کو ملحوظ و مستحضر رکھے کہ یہ محض اللہ کا انعام اور اس کی بخشش ہے اس نے اس آزاد اور بے مہار جانور یا بے حس و حرکت لوہے و لکڑی کو اس طرح اس کا تابع فرمان اور آلۂ کار بنا دیا کہ وہ اس کے حکم و ارادہ سے تیزی

بالخصوص جبکہ اس کے مقابلے میں ضعف و ناتوانی دونوں ہیں اگر اس کی بخشی ہوئی عقل و تمیز اور قوت و اختیار نہ ہوتی تو یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ[1]

اور عین اس حالت استفادہ میں یہ پیش نظر ہے کہ وہ قوت و قدرت کے اعجوبہ اثر سے اصل خالق اور مالک فرمانروا کے حضور میں حاضر ہونے پر مجبور ہے اور اس کو ایک دن اس کا حساب دینا ہے کہ اس نے ان نعمتوں سے کیا فائدہ اٹھایا ان کو کیسے استعمال کیا اور ان کا کیا حق ادا کیا چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا " وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ[2] " مومن ان نعمتوں کو محض اللہ کا فضل و انعام اور شکر و ناشکری کا امتحان سمجھتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے الفاظ میں هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ[3] (یہ میرے رب کا احسان ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں جو کوئی شکر کرے گا تو اپنے واسطے اور اگر کسی نے ناشکری کی تو میرا رب تو بے نیاز و کریم ہے) مومن اور غیر مومن کا ایک فرق یہ ہے کہ مومن ان آلات اور قوتوں کو ان کے محل پر استعمال کرتا ہے اور ان سے اللہ کے دین اور نظام حق کی اعانت و نصرت کا کام لیتا ہے جو ان اشیاء کی پیدائش کا اصل مقصد ہے فرمایا وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ[4] (اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی قوت اور لوگوں کے لئے فوائد ہیں اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو اس کے ذریعہ اللہ کی اور اس کے پیغمبروں کی بن دیکھے مدد کرتے ہیں اور بے شک اللہ خود قوی اور زبردست ہے) جہاں تک عام انسان خدا کی بخشی ہوئی طاقت اور نعمتوں کو مجرموں کی مدد کا ذریعہ نہیں بناتا حضرت موسیٰ نے فرمایا

[1] الزخرف ۱۳ ۔ [2] ایضاً ۱۴ ۔ [3] النمل ۴۰ ۔ [4] الحدید ۲۵

رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۔ اے رب جیسا تو نے مجھ پر فضل کیا پھر میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔ ایسی تعلیم دین ہی ہے جو خدا کی شناخت اور خدا کا خوف پیدا کرتا ہے جو تمام مخلوقات کے اصلی خالق اور عالم کے اصلی فرمانروا کی معرفت پیدا کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ انسان محض ان قوتوں اور دولتوں کا امین ہے اس کو اس کے حضور میں پیش ہونا ہے اور ان قوتوں اور دولتوں کے مصرف و استعمال کا جواب دینا ہے۔ دین ہی ہے جو انسان کو طاقت کے نشے میں متوالا اپنے اختیارات اور تصرف کی قوت دیکھ کر بے خود اور مدہوش ہونے نہیں دیتا۔ دین ہی ہے جو ان چیزوں کا جائز و صحیح محل استعمال اور مفید مصرف بتلاتا ہے وہ ان چیزوں کو کار آمد بنی نوع کے لیے مفید اور دنیا کے حق میں باعث خیر و برکت بناتا ہے۔ دین ہی ہے جو انسان کی عقل اس کی قوت اور اس کے اخلاق کے درمیان توازن و تناسب قائم رکھتا ہے۔ دین ہی ہے جو انسان کے ذاتی فوائد و مصالح کو اجتماعی فوائد و مصالح کے ساتھ مربوط و متناسب رکھتا ہے۔ دین ہی ہے جو انسان میں اپنی قوت و اختیارات کے مشاہدہ و احساس کے وقت ضبط و اعتدال اور تواضع و انکسار کے ساتھ عجز و نیاز اور بندگی کی شان پیدا کرتا ہے۔ قرآن مجید نے دونوں طرح کے نمونے پیش کیے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے عین جاہ و جلال میں فرمایا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ	پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور
مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ	باتوں کا مطلب اور تعبیر کا علم سکھایا ہے
وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا	آسمان و زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز
وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ	ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، ایسا کیجیو کہ
بِالصّٰلِحِیْنَ ○	دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت
(یوسف ـ ۱۰۱)	میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ نے جب اپنی قوت و حشمت اور رعب و دبدبہ ملاحظہ فرمایا تو بے ساختہ ان کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آئے :۔

رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ	اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیرے
الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ	احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے
وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَدْخِلْنِيْ	ماں باپ پر کیا اور یہ کہ ایسے نیک کام کروں
بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ	جو تجھے پسند ہوں اور مجھ کو اپنی مہربانی سے
(النمل - ۱۹)	اپنے نیک بندوں میں ملا لے۔

اس کے برخلاف جو لوگ دین کی دولت سے محروم اور خدا کو بھولے ہوئے تھے ان کو اپنی طاقت اور دولت پر ناز تھا اور وہ اپنے سے بلند و بالا کسی ہستی کو نہیں سمجھتے تھے :۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْأَرْضِ	اور قوم عاد کا قصہ یہ ہے کہ انھوں نے
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ أَشَدُّ	ملک میں ناحق تکبر کیا اور کہنے لگے کون ہے
مِنَّا قُوَّةً أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ	ہم سے زیادہ طاقت میں کیا دیکھتے نہیں کہ
الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ	اللہ جس نے ان کو بنایا وہ ان سے زیادہ
قُوَّةً وَكَانُوْا بِآيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ٥	بے طاقت میں اور وہ ہماری نشانیوں
(حٰم السجدہ ۱۵)	کے منکر تھے۔

زمانۂ ماضی کے ایک بڑے دولتمند کا واقعہ سنایا ہے کہ اس سے کچھ معقول لوگوں نے کہا کہ اپنی دولت پر زیادہ ناز نہ کرو اپنے مال و دولت سے آخرت کا سامان کرو اور اللہ کے احسان کا بدلہ احسان سے دو اور زمین میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔

إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ	جب اس سے اس کی قوم نے کہا اترا مت اللہ کو

لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ	اترانے والے نہیں بھاتے اور جو تجھ کو اللہ
اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ	نے دیا ہے اس سے پچھلا گھر کما لے اور اپنا
نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن	حصہ دنیا سے نہ بھول (یعنی حصہ موافق
كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ	کھا پہن اور برت) اور بھلائی کر جیسے
الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ	اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور ملک میں خرابی
الْمُفْسِدِينَ (القصص ۷۶-۷۷)	ڈالنا نہ چاہ اللہ کو فساد کرنے والے پسند نہیں۔

قارون نے اس کا جواب دیا کہ اس مال و دولت کے سلسلہ میں میں کسی کا شرمندۂ احسان و ممنون منت نہیں یہ محض میری عقل و دانائی اور علم و ہنرمندی کا ثمرہ ہے "قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي"[1] (کہا یہ تو مجھے اپنے ایک خاص علم کی بنا پر ملا ہے۔)

اپنی طاقت کے زعم و احساس اور بے خوفی و بے حسی اور سرمستی...... اور بالآخر طاقت کے انکار کا نتیجہ وہ نشۂ قوت ہے جو انسان کو مجنون بنا دیتا ہے اور جس کو کوئی اخلاقی ہدایت و تعلیم، کوئی جذبۂ انسانیت اور کوئی مصلحت قابو میں نہیں رکھ سکتی، افراد اس کے آہنی پنجہ میں مجبور و بلا اختیار رہتے ہیں اور کمزور قومیں اس کے پاؤں کے نیچے سبزہ کی طرح پامال ہوتی رہتی ہیں، قوم عاد سے اس کے پیغمبر نے کہا "وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ"[2] (اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو اس کو بڑی سختی سے پکڑتے ہو) سرکشی اور تکبر، فتنہ و فساد، مردم آزاری اور قوم کشی اس کا لازمی نتیجہ ہے "إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ"[3] (بے شک فرعون نے ملک میں سر اٹھایا اور وہاں کے رہنے والوں کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا، ایک گروہ کو بالکل کمزور کرتا چلا جا رہا تھا، ان کے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا"

۱؎ القصص ۷۸ ۲؎ الشعراء ۱۳۰ ۳؎ القصص ۴

بے شک وہ مفسدوں میں تھا۔

صحیح دین کے گہرے اثرات اور اخلاقی تربیت کے بغیر جب قوت، علم اور صنعت ترقی کرتی ہے تو اس کے طبعی نتائج وہی ہوتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے۔

یورپ میں قوت و اخلاق اور علم و دین کا عدم توازن

بدقسمتی سے یورپ میں قوت و اخلاق اور علم و دین کا توازن صدیوں سے بگڑا ہوا ہے۔ نشاۃ جدیدہ کے بعد سے مادی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کرتے رہے اور دین و اخلاق میں تنزل و انحطاط واقع ہوتا گیا۔ کچھ مدت کے بعد ان دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا اور ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جس کے ترازو کا ایک پلڑا آسمان سے باتیں کرتا ہے اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے۔ یہ نسل ایک طرف اپنے صنعتی کمالات و عجائبات اور اپنے خوارق عادات کے لحاظ سے نیز مادہ اور طبعی قوتوں کی تسخیر میں مافوق البشر معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنے اخلاق و اعمال، اپنے حرص و طمع، تنگدلی اور بے دردی میں اس کی سطح چوپایوں اور درندوں کی سطح سے بلند نہیں۔ اس کے پاس زندگی کے تو تمام وسائل ہیں لیکن اس کو جینا نہیں آتا۔ اس کو زندگی کے انتہائی و تکمیلی علوم و مسائل معلوم ہیں لیکن وہ انسانی زندگی اور تمدن و اخلاق کے بالکل ابتدائی اصول و مبادی سے ناواقف ہے۔ اس کی علمی و صنعتی بلند پروازیوں اور اخلاقی پستیوں میں قطعاً کوئی تناسب نہیں ہے۔ طبعی علوم نے جو زبردست طاقت اس کو بخشی ہے اس کے استعمال کا وہ سلیقہ نہیں رکھتی۔ پروفیسر جوڈ نے خوب کہا ہے کہ علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی لیکن ہم اس کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:-

ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی پچھڑے پن کے درمیان جو تفاوت ہے اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں ریڈیو کے ذریعہ میلوں میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (BIG BEN) کی آواز سنا کرتے ہیں بجلی فون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں برقی تصویریں آنے لگیں ہیں بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے ہیں بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں ربر کی سڑکیں بچھ گئی ہیں ایکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندرونی حصے کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں تصویریں بولتی اور گاتی ہیں لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے برقی موجوں سے بادلوں میں تخم پیدا کیا جاتا ہے آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک اڑ کر جاتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی دوست سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے (PENDIN SANDS) میں تین یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا ایسی جوابا

نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت مجھے یاد نہیں ہیں گھنٹے میں یا پچاس گھنٹے میں طے کی تھی۔ جب میں سب کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔[1]

علم و صنعت اور اخلاق و انسانیت کے درمیان جو عظیم فاصلہ مغربی تہذیب نے پیدا کر دیا ہے اور موجودہ تہذیب اپنا مقصد پورا کرنے اور انسانیت کی صحیح خدمت انجام دینے میں جس طرح ناکام رہی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسرا مغربی فاضل ڈاکٹر الکسس کیرل ALEXIS CARREL اپنی کتاب MAN THE UNKNOWN میں لکھتا ہے:۔

• موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے لیکن یہ ذرائع انسان کو دولت کے مقصد تک نہیں پہونچا سکتے یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں ان کے اثر سے انسان صبر و ضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب جدید ایسے انسان پیدا ہی نہیں کر سکتی جن میں فنی تخلیق، ذکاوت اور جرأت ہو، ہر ملک میں حکمراں اقتدار طبقہ میں جس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں انحطاط نظر آتا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کی تھیں اور وہ ان لوگوں کو پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت اور جرأت کے مالک ہوں اور

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS PP. 262-61

تہذیب کو اس دشوار گزار راستہ پر سلامتی کے ساتھ لے جا سکیں جس پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ افراد انسانی نے اس تیزی کے ساتھ ترقی نہیں کی جس تیزی کے ساتھ ان اداروں (INSTITUTIONS) نے ترقی کی ہے جو ان کی دماغ کا نتیجہ ہیں۔ یہ دراصل سیاسی رہنماؤں کے ذہنی اور اخلاقی نقائص کا نتیجہ ہے اور ان کی اس جہالت کا جس نے موجودہ اقوام کو خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ طبعی علوم اور صنعتی فنون نے انسان کے جو ماحول تیار کیا ہے وہ انسان کے مناسب حال نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ بے جستہ ہے کسی سابق نقشہ یا غور و فکر پر مبنی نہیں اور اس میں انسان کی شخصیت کے ساتھ مطابقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ ماحول جو محض ہماری ذہانت اور ایجادات کی تخلیق ہے ہمارے قد و قامت اور ہماری صورت کے مطابق نہیں ہم مسرور نہیں ہیں۔ ہم ایک روز افزوں اخلاقی اور عقلی انحطاط میں مبتلا ہیں۔ جن قوموں میں صنعتی تمدن پھلا پھولا اور اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے وہ پہلے سے بہت کمزور ہیں اور وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ وحشت و بربریت کی طرف بڑھ رہی ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں۔ ان کو اس وقت اس باگی ذہنی فضانیت ماحول سے کوئی قوت بچا نہیں سکتی جو طبعی علوم نے ان کے گرد حصار کی طرح کھینچ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری تہذیب نے پچھلی تہذیبوں کی طرح زندگی کے لیے ایسی شرطیں عائد کر دی ہیں جو (بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر) زندگی کو ناممکن العمل بنا رہی ہیں۔ ہم مادیت کا جتنا علم رکھتے ہیں اس کے مقابلہ میں زندگی کا علم اور یہ کہ انسان کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے بہت کم رکھتے ہیں اور ہمارا علم اس بارہ میں

ابھی تک بہت پیچھے ہے اور اس کم علمی کا نقصان ہم بھگت رہے ہیں۔

یہ ایجادات و اکتشافات میں جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ طبیعی علوم، ترکیبات اور علم الکیمیا کے اکتشافات کو زیادہ اہمیت دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ راحت، تفریح، جمال، عجائبات اور تکلفاتِ زندگی میں اضافہ و ترقی سے کیا فائدہ، جب ہمارا ضعف اس سے فائدہ نہ اٹھانے دے اور ہم اس کو صحیح راستہ پر نہ لگا سکیں۔ ایسے نظامِ زندگی کو مستحکم سے مستحکم تر بنانے سے کیا فائدہ جس سے اخلاقی پہلو بالکل خارج کر دیا جائے اور عظیم توپوں کی بہترین قسمیں نکالی جائیں، ہمارے لیے مناسب بات یہی ہے کہ تیز رفتار جہازوں، زیادہ آرام دہ موٹروں، زیادہ ارزاں ریڈیو اور زیادہ محدود رسد گاہوں کے بجائے اپنے آپ کی طرف زیادہ توجہ کریں۔ میکانیکی، طبیعی اور کیمیاوی علوم کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ ہم کو زبان بخش دیں اور اخلاقی نظام، اعصابی توازن اور امن و سکون عطا کریں۔

آلات و وسائل کا غلط استعمال

حقیقت یہ ہے کہ یہ مصنوعات اپنی ذات اپنی جگہ پر بالکل معصوم اور غیر جانبدار ہیں وہ انسان کے ارادہ اور اس کے عقل و اخلاق کے تابع ہیں، وہ اپنی ذات سے نہ خیر ہیں نہ شر، انسان ہی ان کو خیر اور شر بناتا ہے بلکہ بعض اوقات خود خیر ہوتی ہیں، لیکن انسان غلط استعمال اور اپنی طبیعت و تربیت کی خرابی سے ان کو شر بنا لیتا ہے، اس لیے سب سے زیادہ اس کے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان آلات و مصنوعات کے استعمال کرنے والے کس قسم کے اخلاق و سیرت اور کس قسم کے مقاصد رکھتے ہیں۔

مغربی قومیں مدت دراز سے یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ لذت و راحت، مادی استمتاع، سرمایہ کا

اور غلبہ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور قابل حصول مقصد نہیں ہے۔ طبعی طور پر انھوں نے اپنی ساری قوت علم اور ذہانت کو ان مقاصد کے حصول میں صرف کیا اور ایسے آلات و وسائل ایجاد کئے جن سے یہ مقاصد زیادہ آسانی اور سرعت کے ساتھ حاصل ہو سکیں۔ رفتہ رفتہ وسائل خود مقاصد بن گئے اور اختراع و ایجاد اپنی جگہ پر خود ایک بڑا مقصد قرار پا گیا، اور جس طرح بچوں کو کھلونوں سے دلچسپی ہوتی ہے اس طرح ان کو ایجادات و اختراعات سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ یورپ میں معیار بدلتے رہے ہیں۔ کچھ مدت پہلے یہ خیال غالب تھا کہ تمدن نام ہے راحت کا اور راحت زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل تھا، پھر مختلف محرکات و اسباب کی بنا پر اور کچھ حصول راحت کے لئے سرعت و تیز رفتاری کی کوشش کی گئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں سرعت پیدا کرنے کا مقابلہ شروع ہوا، لوگ اس میں ایسے محو ہوئے کہ رفتہ رفتہ سمجھنے لگے کہ تمدن نام ہی ہے سرعت کا، اب سرعت زندگی کا آئیڈیل بن گیا۔ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:۔

> "ڈزرائیلی (DISRAELI) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کا عقیدہ تھا کہ تمدن نام ہے راحت کا، لیکن جہاں تک ہمارے زمانہ کی سوسائٹی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے سرعت کا، سرعت زمانہ موجودہ کے نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانہ پر وہ سکون، راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔"[1]

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا مقاصد ہیں جن کے لئے یہ آلات و وسائل استعمال ہو رہے ہیں، ان سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور اس کو اپنے نوع انسانی کے لئے کس حد تک مفید و کارآمد بنایا جا رہا ہے اور انسان کی حالت ان قوتوں اور وسائل کی موجودگی میں چند

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 341

پہلے کے لوگوں سے کہاں تک بہتر ہے اس کا جواب ایک مغربی عالم اور مصنف جوڈ کی زبان سے مناسب ہوگا، پروفیسر جوڈ لکھتا ہے :-

"بلاشبہ ہم بڑی سرعت و تیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کر سکتے ہیں لیکن یہی دیکھنے کی بات ہے کہ جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا ہمارے لئے زمین سمٹ گئی ہے اور اس کی طنابیں کھینچ گئی ہیں یا قومیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئی ہیں اور ان کے باشندے ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے آپس کے تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار و ناشگفتہ ہیں وہ وسائل جن سے ہم اپنے ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہو جاتے ہیں انہوں نے اقوام دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہم نے آواز پہنچانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنے ہمسایہ قوموں سے باتیں کیں لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوا کی پوری طاقت کے ساتھ اپنی ہمسایہ قوم کو چھیڑنے اور دق کرنے کا کام لے رہی ہے وہ اس کوشش میں ہے کہ وہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل و معتقد بنا دے۔[1]

ہوائی جہاز کو دیکھو جو فضائے آسمانی میں منڈلا رہا ہے تمہیں خیال ہوگا کہ اس کے موجد اپنے علم و مہارت و صنعت کے لحاظ سے فوق البشر ہستیاں تھیں اور جنہوں نے اس پر پہلے پہل پرواز کی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بلند ہمتی عزم اور جرأت بڑی قابل داد اور لائق تحسین ہے لیکن اب ذرا ان مقاصد کا جائزہ لو جن کے ماتحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہوئے اور مستقبل میں بھی استعمال ہوں گے۔

لہ GUIDE TO MODERN WICKEDNESS, P. 242

وہ مقاصد کیا ہیں؟ فضائے آسمانی سے بمباری، انسانوں کے جسموں کی ٹکڑے
ٹکڑے کرنا، شہروں کا گلا گھونٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا، زہریلی گیسوں کا پھینکنا
اور ان کو ریزوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا جن کے پاس اس مصیبت سے حفاظت
کا کوئی سامان نہیں۔ یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہو سکتے ہیں یا شیاطین کے۔

دیکھنا ہے کہ مؤرخ اس کے متعلق کیا رائے قائم کرتا ہے کہ ہم دھاتوں اور
سونے کو کس طرح استعمال کرتے تھے۔ وہ لکھے گا کہ ہم نے ایسی ترقی کر لی تھی کہ لاسلکی
کے ذریعہ سونے کی اطلاعات دے سکیں، وہ ویسی تصویریں پیش کرے گا جو دکھائی
دیں گی کہ بینک کے لوگ کس صفائی اور شائستگی کے ساتھ سونے کا وزن اور شمار کرتے تھے،
وہ اس خارق عادت طریقے کا ذکر کرے گا جس سے ہم روزانہ سونے کو ایک دارالسلطنت
سے دوسرے دارالسلطنت کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے اور کشش اجسام کے
قانون کو توڑتے تھے، وہ تسلیم کرے گا کہ ہم جوڑنے کی صنعتوں میں بے انتہا ماہر تھے لیکن
ان بین الاقوامی تعاون میں ناکام تھے جو سونے پر کنٹرول رکھے اور اس کو صحیح طور پر تقسیم
کرے۔ ان کو صرف اتنی فکر تھی کہ وہ قیمتی دھاتوں کو امکانی سرعت کے ساتھ دفن
کر دیں، وہ سونے اور دھاتوں کو افریقہ کی زمین کے شکم سے بڑی مہارت کے ساتھ نکالتے
تھے اور لندن، نیویارک اور پیرس کے محفوظ خانوں میں دفن کرتے تھے۔"

ایجادات واکتشافات کی ہلاکت آفرینی

مختلف اسباب و حالات کی بنا پر جن کی کسی قدر تشریح گزشتہ صفحات میں ہو چکی ہے،
مغربی قوموں میں خیر کی طرف میلان اور بھلائی کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے اور اخلاق و تہذیب

کے تحت جو اصول و مبادی کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے مدت ہوئی چھوٹ گیا بغیر ذمہ دارانہ دلوں میں بھی اب تہذیب و فلسفہ نے طبیعتوں میں انحراف پیدا کر دیا اور ذوق فاسد ہو گئے اس بنا پر جس طرح سے ترقی اور روحانی امراض میں صحیح سے صحیح غذا مریض کے معدے میں پہونچ کر سموم اور فاسد ہو جاتی ہے اسی طرح علوم و فنون میں ایجادات و اکتشافات اور علمی ترقیاں یورپ میں خود اہل یورپ کے لئے اور تمام انسانیت و تہذیب کے لئے وبال جان بن گئی ہیں مسٹر ایڈن نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا۔

"جب تک کچھ کیا جائے اور عبرت حاصل کی جائے اس دنیا کے ہاتھ سے اس صدی کے پچھلے حصے میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرز زندگی اختیار کرنا پڑے گا اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا کیسی عجیب بات ہے کہ تمام ممالک ایسے ہتھیاروں کے بنانے کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں جن سے عقل و ہوش سب کی مخالفت کر رہی ہو تاہم ہم یہ کہنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں۔ میں بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارے سے کوئی سیاح اور تماشائی اس زمین پر آ جائے تو وہ ہماری اس دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی و ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقہ کی اطلاع بھی دے رہے ہیں۔"

جس وقت مسٹر ایڈن نے یہ الفاظ کہے تھے اس وقت ان کے تصور میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ اس جنگ کے دوران ہی میں خود انسانی ہلاکت و تباہی کی صنعت کی ہلاکت خیزی اور آدم کشی اس درجہ تک پہنچ جائے گی کہ خود سائنس دان بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

کئی سال کی منظم جد و جہد اور کروڑوں روپیہ کے صرف کے بعد امریکہ ذراتی بم (ATOMIC BOMB) کے ایجاد میں کامیاب ہو گیا جس پر اس جنگ کی شکست و فتح کا

انحصار تھا اور ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو ۵ بجے اس قوت و وسعت کا پہلا امتحان کیا گیا۔

بے جان آدمی ریت اور بے حس فضائے آسمانی کے بعد اس کا دوسرا تجربہ فریق کی فتح و شکست پر کیا گیا جس کی ہیبت زدہ کر کے شکست دینے کے لئے مغرب کی حکمت و صنعت نے اپنی بہترین قابلیت صرف کی تھی ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کا بدقسمت شہر ہیروشیما اس کا پہلا نشانہ بنا اور گرتے ہی یہ عظیم الشان شہر تودۂ خاک بن گیا نہ کوئی جاندار زندہ رہا نہ بے جان آن کی آن میں جہاں عمارتیں تھیں سب معدوم تھیں دھماکے کی شدت ہوا کا دباؤ اور دھواں قیامت خیز تھا گرد و پیش کا جھلسنا آپ تھا اور کھولتا ہوا میلوں اونچا ایک پہاڑ تھا اور اس پہاڑ کے نیچے جہنم کی سی آگ تھی جس نے ہر چیز کو خاکستر کر دیا۔ اس طیارہ کو جس نے بم گرایا تھا اسے گراتے ہی جلد سے جلد اپنی سلامتی کے لئے وہاں سے بھاگنا پڑا ورنہ تباہ ہو جاتا، دھماکا اتنا سخت تھا کہ بم گرانے والوں کا پتہ پانی تھا حیرت ہیبت اور خوف کے عالم میں ہر ایک کی زبان سے یا خدا کی آواز نکل رہی تھیں لیکن جب یہ لوگ واپس آئے تو اتحادی حلقوں میں نعرہ ہائے مسرت بلند ہو رہے تھے اور ہر شخص شاد و مسرور تھا۔

اسٹورٹ گلڈر (STUART GILDER) اپنے ایک مضمون میں ایٹم بم کی خطرناک اور ہلاکت آفرینی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اگرچہ پوری جزوی تفصیلات کا علم نہ تھا لیکن بہرحال ایٹم بم بنانے والے یا تو اتنا اتنا معذور جانتے تھے کہ جس آلہ حرب کو استعمال کرنے جا رہے ہیں اس کے ثانوی نتائج یہ ہوں گے کہ انسانیت فنا ہونے سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے گی اس کے ثانوی نتائج کی اگر تفصیل معلوم کرنی ہے تو شہر ہیروشیما کی رپورٹ پڑھ جائیے ایک مثال کے

لے ہیروشیما کی میونسپلٹی کے مطابق ۶ اگست ۱۹۴۵ء کی اطلاع ہے کہ ۱۰ اگست ۱۹۴۵ء کو ہلاک ہونے والوں کی تعداد دو لاکھ دس ہزار اور دو لاکھ ۴۰ ہزار کے درمیان تھی۔ (پی ٹی آئی)

لی جی ناسفو جیوں روزنامہ نگار اس زہراتی بم کے پلیگ [ATOMIC PLAGUE] کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

بہت سے لوگ جو بظاہر تو بم کے پھٹنے سے متاثر ہوئے تھے اور نہ اس کی آگ وجہ سے مر گئے اور برابر مر رہے ہیں اور ان کی اس موت کا سبب یہ ہے کہ ان کا خون تحلیل ہو جاتا ہے اول اول خون کے سفید ذرات تباہ ہوتے ہیں پھر سرخ ذرات کی باری آتی ہے ان کے بال گر جاتے ہیں اور وہ جتنے دن بھی زندہ رہتے ہیں ان کے اعضا سوکھتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ مر جاتے ہیں اس کی وجہ معلوم ہوئی ہے کہ فضا میں کچھ ریڈیائی مواد ایٹم بم کے پھٹنے کے ذریعہ رہ جاتے ہیں اور انسانی کھال میں جذب ہو کر یا بذریعہ تنفس پھیپھڑوں تک پہونچ جاتے ہیں!

اس کتاب کو نقل کرنے کے بعد ہی مضمون نگار اسٹورٹ گلڈر STUART GELDER لکھتا ہے:

یہ خبر ساری دنیا کو لرزا دینے اور ڈرا دینے والی ہے دنیا اب تک نہ تو جوہری ذرات سے واقف تھی اور نہ ریڈیائی تاثیر رکھنے والی دھاتوں سے لیکن ہمارے لوگ تو تیس سال قبل سے جانتے تھے کہ ایک ایسا ہتھیار ہوگا جس کا توڑ اور تریاق ابھی نہیں اور یہ ساری دنیا انسان کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جاپانیوں نے ان اثرات سے بچنے کے لئے نجات ساز نقابیں استعمال کیں غالباً یہ وہ نقابیں تھیں جن کو اہل جاپان شدید سردی سے بچنے کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن یہ اتنی ہی بے اثر نکلیں جتنے حبش کے فوجیوں کے وہ کپڑے جو انھوں نے اس وقت اپنی ناک کے گرد لپیٹ لئے تھے جب کہ مسولینی کے ہوائی جہازوں نے ان پر زہریلی گیسیں برسائی تھیں۔

ذراتی بم پھینکنے میں ہوا باز شریک تھے ان کا بیان ہے کہ اس بم کے گرنے کے بعد غبار اور دھواں ۱۰ میل تک ہوا میں پھیل گیا پروفیسر (FLESCH) کی رائے ہے کہ جس جگہ بم پھٹے اس کے قریب چار مربع میل کے علاقہ کے رہنے والوں کی سائنٹیفک طریقہ پر جانچ پڑتال کرنی چاہئے اور ان کی جسمانی حالت کو بغور دیکھنا چاہئے کہ کہیں ان پر اس کا اثر تو نہیں ہو گیا۔

یہ امر ذرا بھی مستبعد نہیں کہ دنیا ایک دن صبح اٹھ کر اخباروں میں یہ خبر پڑھے گی کہ وہ لوگ جو جاپان سے ہزارہا میل کا فاصلہ پر رہتے ہیں ان میں وہ علامات پیدا ہو گئی ہیں جو ذراتی بم کے پھٹنے پر پیدا ہوتی ہیں اگر ایک چھوٹا سا ذراتی بم دو میل تک کی ہوا کو گرد و غبار سے مسموم کر سکتا ہے تو یہ سمجھنا بالکل مطابق عقل ہے کہ اس سے بڑا بم اس سے کہیں زیادہ وسیع رقبہ کو متاثر کرے گا۔[1]

---

[1] THE STATESMAN, SEPTEMBER 16, 1945

باب ششم

مغربی عہدِ اقتدار میں دنیا کے معنوی خسارے

یہاں مشرقی اسلامی اقوام کے مادی خساروں سے بحث نہیں، مغرب کے دورِ فتوحات میں مشرقی اقوام کو اپنے کن طویل و عریض ممالک سے دستبردار ہونا اور مغربی طاقت یا دانائی کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا، یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے اور اس کی تفصیل ان مختصر اوراق میں سمیٹی نہیں جا سکتی ہے، اس وقت نہایت اختصار کے ساتھ بلکہ اشارات میں یہ دکھانا ہے کہ مغرب کے اقتدار کے اس زمانے میں جو تمام روئے زمین پر پھیل گیا ہے اور جس کے اثرات سے پہاڑوں کی چوٹیاں اور وادیوں کی گہرائیاں، آزاد قوموں کے جزیرے اور بیابان بھی محفوظ نہیں، دنیا کو کیا معنوی، روحانی اور اخلاقی خسارے برداشت کرنے پڑے؟ اس عالمگیر انقلاب میں سب سے بڑا خسارہ مسلمان ہی کو برداشت کرنا پڑا ہے کہ جاہلیت کا تضاد و اختلاف اسی کے نظامِ زندگی سے ہے، اس لئے قدرتی طور پر جاہلیت کے غلبہ و اقتدار میں اسی کو سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔

حاسۂ مذہبی کا فقدان

اس دنیا کا انجام کیا ہے، کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟ جس کی

کیا نوعیت ہے اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں اور وہ کہاں سے معلوم ہو سکتی ہیں؟ اس کے بعد کی زندگی کو پر راحت بنانے کے لئے کیا اصول و تعلیمات ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہے؟ روحِ انسانی کو ابدی راحت اور قلب کو دائمی سکون پہونچانے کا راستہ کیا ہے اور وہ کہاں سے دریافت ہو سکتا ہے۔؟

یہ وہ سوالات ہیں جنھوں نے مشرقی انسان کو سیکڑوں ہزاروں برس بے چین اور صورتِ سوال بنائے رکھا اور جو اس کے انتہائی مادی استغراق اور خود فراموشی میں بھی اس کے قلب کی گہرائیوں سے بار بار اٹھتے رہے اور جواب مانگتے رہے۔ مشرق نے اپنے کسی دور میں بھی ان فطری سوالات کو ٹالا نہیں اور اپنے دل کی یہ آواز سُنی اَن سُنی نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کی تمام مشغولیتوں اور دماغ کی ساری کاوشوں میں ان کو پہلی جگہ دی، وہ اپنی تہذیب اور علوم کی ہزاروں سال کی تاریخ میں برابر ان سوالات کے حل کرنے اور ان کا تشفی بخش جواب تلاش کرنے کے ادھیڑ بن میں رہا، ما بعد الطبیعی فلسفہ، علم کلام، تصوف، اشراق و روحانیت، مجاہدہ و ریاضت، علم و حکمت اور دوسرے مشرقی علوم و تجربات اسی کے حل ہی کی مختلف کوششیں تھیں، اس نے اس کے لئے غلط راستے بھی اختیار کئے اور غلط وسائل بھی استعمال کئے اور اس کو اس میں کامیابی سے زیادہ ناکامیابی ہوئی لیکن اس سے اس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ اہلِ مشرق کی زندگی میں یہ سوالات ہمیشہ موجود رہے اور ان کو اولین اہمیت حاصل رہی۔

اس موقع کے لئے اگر ہم فلسفہ ہی کی زبان استعمال کریں تو ہم یہ کہیں گے کہ اہلِ مشرق میں حواسِ ظاہری کے علاوہ ایک اور حاسہ بھی رہا ہے جس کو ہم حاسۂ مذہبی کہہ سکتے ہیں، جس طرح دوسرے حواس اپنا عمل کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ان کے محسوسات حاصل ہوتے ہیں اسی طرح اس حاسہ کے بھی کچھ محسوسات ہیں جو مشرقی زندگی کا لازمہ رہے ہیں۔

ہی میں شبہ نہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی عہد میں یہ سوالات بدستور موجود
تھے اور اہل علم و اہل فکر ان پر غور و فکر کی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں لیکن مغربی تمدن اور فلسفۂ زندگی
کے باطنی خواص زمانہ کے ساتھ ساتھ جس قدر ابھرتے گئے اور زندگی میں مغرب کا جس قدر توغل اور
انہماک بڑھتا اسی قدر ان سوالات کی اہمیت کم ہوتی گئی اور وہ عملی زندگی میں پیچھے پڑتے رہے۔
فلسفہ یا مابعد الطبیعیات سے علمی و تعلیمی حلقوں میں اب بھی ان پر اظہار خیال ہوتا ہوگا لیکن زندگی
سے یہ سوالات یکسر خارج ہو چکے ہیں اور ان کے سامنے سے علامت استفہام مٹ چکی ہے ان کے بارہ
میں وہ خلش، کھٹک اور وہ ذہنی جستجو جس نے ہزاروں سال اہل مشرق کو مشغول رکھا جاتا رہا اور
یہ کسی ایمان، شرح صدر اور اطمینان قلب کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اہل مغرب کی زندگی میں
عرصۂ دراز سے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اور دوسرے مشاغل و مسائل کے لئے جگہ چھوڑ چکے ہیں اس زمانہ
کے مشغول انسان نے ان مسائل میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی اختیار کر لی ہے اس کو ان سوالات پر
غور کرنے کی بالکل مہلت نہیں اس کی طرف سے ان سوالات کے جواب کا کوئی پہلو اختیار کیا جائے اس کو
اس سے کوئی دلچسپی نہیں اس کے لئے صرف یہ زندگی اہم ہے اور اسی کے متعلق بحث و تفصیلات اس کو مطلوب ہیں۔

قدیم مشرق اور جدید مغرب میں یہ ایک عظیم الشان نفسیاتی فرق ہے کہ مشرق مذہبی حاسہ
رکھتا تھا اور مغرب اپنی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ حاسہ مذہبی کھو چکا ہے اور جب کسی شخص کا کوئی حاسہ
باطل ہو جائے تو اس کے سامنے محسوسات جو صرف اس حاسہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لئے معدوم
ہو جاتے ہیں جو شخص قوت سامعہ سے محروم ہے اس کے لئے عالم اصوات معدوم ہے اور یہ پوری بولتی ہوئی
دنیا ایک شہر خموشاں ہے جو شخص قوت باصرہ سے محروم ہے اس کے لئے عالم الوان معدوم اور رنگوں کا
فرق بے معنی ہے اسی طرح جو شخص حاسہ مذہبی سے محروم ہے اس کے لئے وہ محسوسات و معلومات اور حقائق
معدوم ہیں جو صرف حاسہ مذہبی کا نتیجہ ہوتے ہیں اس کے لئے آخرت، عذاب و ثواب، جنت و دوزخ

خدا کی رضامندی و نارضامندی، تقویٰ و طہارت، نجات و ہلاکت ابدی وغیرہ وغیرہ سب بے معنی الفاظ ہیں، اس کے لئے کسی ایسی دعوت میں قطعاً کوئی کشش اور دلچسپی نہیں جس کا تعلق ان کے محسوسات اور نقد لذتوں اور منفعتوں کے سوا کسی اور چیز سے ہو۔

دین کی دعوت دینے والوں کو ہر دور میں اور انبیاء علیہم السلام کو اپنے زمانہ دعوت میں جن لوگوں میں سب سے زیادہ دقت پیش آئی ہے اور جن لوگوں پر ان کی انقلاب انگیز دعوت ان کے خاص شگفتگی اور آہن گداز اخلاص اور ان کا سوز و دردمندی بالکل بے اثر ثابت ہوئی ہے یہ وہی لوگ ہیں جو حاسۂ مذہبی سے محروم ہو چکے تھے اور جن کی دل کی انگیٹھیاں اس طرح سرد ہو چکی تھیں کہ ان میں کسی طرح گرمی نہیں پیدا کی جا سکتی تھی، جو مذہب اور اس کے متعلقات کے متعلق طے کر چکے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ سننا بے ضرورت ہے، جنھوں نے اپنے زمانے کے داعیوں کی پرجوش گرم کر دینے والی تقریریں کر بڑی سرد مہری سے کہا: إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ [۱] (ہم تو محض دنیاوی زندگی کے قائل ہیں جینے اور مرنے کے سوا اور ہے کیا، مرنے کے بعد کون زندہ ہوگا؟) یا جن کی نظر مادی سطح سے حقیقت تک نفوذ کرنے کے قابل نہیں رہی اور جنھوں نے پیغمبر کی عام فہم تقریر سننے کے بعد جو انھیں کی زبان میں کی گئی تھی، بڑی سادگی سے کہا: مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا [۲] (تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم کو ہم میں کوئی قوت حاصل نہیں۔)

موجودہ تہذیب کے اس عروج کے زمانہ میں ہر قوم میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی دنیاوی مشغولیت و انہماک اور دنیا کی محبت و حرص نے ان کی زندگی میں مذہب کے لئے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا، بڑی تلاش و جستجو کے بعد بھی مذہب کی دعوت دینے والے کو ان کے دل و دماغ میں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا منفذ نہیں ملتا جس سے دینی اور اخلاقی دعوت ان میں

۱؎ المؤمنون - ۳۷ ۲؎ ہود - ۹۱

نغمہ نہ رکھے جس طرح کسی شخص کو موسیقی کے لئے کان اور شاعری کے لئے ذوق لطیف نہ ملا ہو اس کے لئے موسیقی کے سارے کمالات اور دنیا کی پوری وجد آفریں شاعری بے اثر و بے سود ہے اسی طرح جو ذہن حاسۂ دینی سے محروم ہو چکا ہو اس کے لئے پیغمبروں کی پوری دعوت ناصحوں کی وعظ و تلقین، علم و حکمت، قصص و امثال سب ضائع ہیں، یہ دلوں کی زمین کا سب سے بنجر حصہ ہے جس کو کوئی بارش سیراب نہیں کر سکتی۔ ؎

یہاں آ کے رو دیتا ہے ابر نیساں

جن لوگوں کو اس طبقہ سے خطاب کرنے اور اس کو دین و اخلاق کی دعوت دینے کا کبھی موقع ملا ہے ان کو قرآن مجید کی بہت سی آیات کے معنی سمجھ میں آ گئے ہوں گے اور وہ تمام کلامی اشکالات جو عملی زندگی اور میدان دعوت سے علیحدہ بیٹھ کر ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾[1] اور اس کے ہم معنی آیات کے متعلق پیش آتے ہیں خود بخود حل ہو گئے ہوں گے اور یہ حقیقت قرآنی مجسم نظر آئی ہو گی ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرہ - ۱۷۱)

اس زمانہ کا اصلی مرض دراصل دین کے بارہ میں بے حسی و بے طلبی اور مذہبی سوالات کے بارہ میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی ہے جس کا علاج سب سے زیادہ مشکل ہے اور جس کی موجودگی میں کوئی مذہبی دعوت و تلقین کارگر نہیں ہو سکتی، مذہب و اخلاق کی دعوت کو فسق و فجور اور معصیت و غفلت کے تاریک دور اور انکار و مخالفت کے پرشور سے پرشور عہد میں وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو مذہب کی بے تعلقی و بے نیازی کے اس خاموش و پرسکون دور میں پیش آ رہی ہیں، جہاں سرے سے پیاس نہ ہو یا پانی کی طلب ہی نہ ہو وہاں پانی کا اہتمام اور خضر کی رہنمائی سب بے ضرورت ہے ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ﴾[2]

[1] البقرہ : ۷ [2] النمل : ۸۰

ایک مغربی یونیورسٹی کے معلّم فلسفہ و علم النفس نے اس حقیقت کا خوب ادراک کیا ہے اور اس ذوق کی صحیح تحلیل کی ہے جو قدیم و جدید نفسیات میں پایا جاتا ہے اس نے اس ایک جملہ میں ایک کتاب کا مضمون سمیٹ لیا ہے:۔

"مذہبی سوالات پہلے پیدا ہوتے تھے ممکن ہے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملتا ہو لیکن اس زمانہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سوالات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔"

ذوقِ خدا طلبی کا عالمگیر فقدان

اسلامی تمدن و حکومت کے عالمگیر اثرات کے زمانہ میں گزر چکا ہے کہ اس کے زیر اثر پوری دنیا میں (جو اسلام اور مسلمانوں کے زیر اثر تھی) خدا طلبی کا عام ذوق پایا جاتا تھا ہر جگہ ایسے اشخاص اس دین کی طلب اور عرفان خدا کی تلاش میں دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں پہنچتے تھے، دنیا داری اور مادیت کے پھیل جانے کے بعد دینی رجحان اور خدا طلبی کا مرکز انہی حضرات کی ذات اور ان کے مقامات تھے جنہوں نے غفلت اور مادیت کے سمندر میں جا بجا زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم کر رکھے تھے جہاں وہ لوگوں کو مادیت کے اس بحرِ ظلمات سے نکال کر ان کی دینی تربیت کرتے تھے اور ان میں طوفان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت و قوت پیدا کرتے تھے، بعد کی صدیوں میں ان کو صوفیہ و مشائخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ان حضرات کی طرف رجوع ان آخری صدیوں میں دینی رجحان اور عام مسلمانوں کے ذوقِ خدا طلبی کا ایک صحت مند پیمانہ ہے جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ لوگوں میں اس زمانہ میں مادیت و دنیا داری سے کس حد تک گریز اور دین کی کہاں تک طلب پائی جاتی تھی۔

عالمِ اسلامی کے مرکزی شہروں میں تقریباً ہر جگہ ایسے شخص موجود تھے جن کی ذات مرجعِ خلائق

میں روشنی کا مینار تھی، لوگ پروانوں کی طرح اس روشنی پر گرتے تھے، دنیا کے دور دراز گوشوں سے طالبین خدا وہاں جمع رہتے تھے، وہ مسلمانوں کی ایک بڑی بین الاقوامی آبادی ہوتی تھی، جہاں ایک وقت میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے مسلمان پائے جاتے تھے اور اسلام کی وسیع دنیا وہاں سمٹی ہوئی نظر آتی تھی۔

ہمارا ملک ہندوستان جو اسلامی دنیا کے ایک سرے پر واقع ہے، دینی ذوق و شوق اور خدا طلبی کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، یہاں ہر دور میں مسلمان سلاطین کی سلطنت کے پہلو بہ پہلو دینی و روحانی حکومت کے آزاد مرکز قائم رہے، جہاں سیکڑوں ہزاروں اشخاص اپنے زمانہ کی تمام مادی ترغیبات سے آزاد اور حکومت و سیاست کے انقلابات سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۲۵ھ) کی روحانی نوآبادی غیاث پور[1] اس کی ایک اچھی مثال ہے جس نے عین مرکز حکومت (دہلی) میں آٹھ جابر سلاطین (غیاث الدین بلبن ۶۶۴ - ۶۸۶ھ سے لے کر غیاث الدین تغلق ۷۲۰ - ۷۲۵ھ تک) کے عہد حکومت میں تقریباً پچاس برس تک اپنی خود اختیاری اور بے نیازی کو قائم رکھا اور جہاں سجز[2] سے لے کر اودھ[3] تک کے طالبین خدا پہنچتے رہتے تھے۔

اگر تمام سلاسل طریقت کے بزرگوں کے مرکزوں کی آبادی اور ان کی طرف لوگوں کے رجوع کی تفصیل لکھی جائے (جس سے اس زمانہ کے دینی طلب، رجحان اور دینی عزت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے) تو اس کے یہ اوراق متحمل نہیں، اس لئے نمونہ کے طور پر صرف ایک سلسلہ

---

[1] حضرت نظام الدین غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ۶۶۵ھ میں دہلی تشریف لائے، کچھ عرصہ تک مختلف محلوں میں قیام رہا، پھر بستی غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں مستقل قیام اختیار کیا، ۷۲۵ھ تک مختلف سلاطین آپ کو جھکانے کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی، تقریباً ۶۰ برس کی مدت تک آپ اپنے زاویہ میں بالکل یکسو رہے۔ [2] شیخ حسن علا سجزی۔ [3] شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی۔

(سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ) کے چند بزرگوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق اور ان کی طرف اہل زمانہ کے رجوع کا مجمل ذکر کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے زمانہ میں جو مادیت اور دنیاداری کے عروج کا زمانہ تھا ذوق خدا طلبی کا کیا حال تھا اور دین کی کشش کہاں کہاں سے لوگوں کو کھینچ کر لاتی تھی۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے منتسبین کی فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان و افغانستان کے کتنے شہروں اور قصبات کے کتنے کثیر التعداد اشخاص اور عہد جہانگیری کے کتنے بڑے بڑے امیر اور ارکان دولت ان کے حلقۂ ارادت و بیعت میں داخل تھے اور کتنی دور سے انھوں نے سرہند آکر استفادہ کیا تھا۔

ان کے جلیل القدر خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) کی خانقاہ میں ایک ایک ہزار آدمی روزانہ ہوتے تھے جو دونوں وقت خانقاہ میں کھانا کھاتے تھے ان کی سواری کے ساتھ ہزاروں ہزار آدمی اور سیکڑوں علماء ہوتے تھے "تذکرہ آدمیہ" میں ہے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب آپ لاہور تشریف لے گئے تو سادات و مشائخ اور دوسرے طبقوں کے دس ہزار آدمی آپ کے ہم رکاب تھے۔ طالبین کا اتنا مجمع ہر وقت رہتا تھا کہ شاہجہاں کو ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا، اس نے کچھ رقم بھیج کر کہلوایا کہ آپ پر حج فرض ہوگیا ہے آپ حرمین تشریف لے جائیں چنانچہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

مجدد صاحبؒ کے نامور خلیفہ اور صاحبزادہ حضرت خواجہ معصومؒ (م ۱۰۷۹ھ) کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے[1]۔

ان کے صاحبزادہ شیخ سیف الدین سرہندیؒ (م ۱۰۹۶ھ) کی خانقاہ (دہلی) میں طالبین کے ہجوم کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صاحب ذیل الرشحات کے بیان کے ۔ ۔ ۔ مطابق ایک ہزار چار سو آدمی دونوں وقت ان کے دسترخوان پر اپنی فرمائش اور خواہش کے موافق کھانا کھاتے تھے[2]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد پنجم [2] ایضاً

امراء و اہلِ ثروت کا بزرگانِ دین سے جو تعلق اور جیسی محبت و احترام کی بنا پر تھا اس کا ایک نمونہ یہ تھا کہ حضرت خواجہ محمد ... سرہندیؒ (م ۱۱۵۱ھ) جب مکان سے مسجد تشریف لے جاتے تو امراء راستہ میں دوشالے اور رومال بچھا دیتے کہ آپ کا پاؤں زمین پر نہ پڑے۔ کسی مریض کی عیادت یا کسی اور کام کے لئے کہیں تشریف لے جانا ہوتا تو آپ کی سواری بادشاہوں کی طرح نکلتی اور آپ کے جلو میں امراء و اہلِ دولت کی پالکیاں اور سواریاں ہوتی تھیں۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدِ تجارت میں انقلابِ حکومت سے کچھ پہلے تک یہ ذوق پوری طرح موجود تھا۔ حضرت شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) (خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ) کے عہد میں دہلی کی خانقاہ مجددیہ طالبین کا بہت بڑا مرکز تھی۔ سرسید احمد خاں مرحوم آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:—

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمتِ خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے۔ حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔"[2]

شاہ رؤف احمد مجددیؒ "در المعارف" میں حضرت کے ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست لکھتے ہیں جو ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی اس خانقاہ میں استفادہ کے لئے حاضر تھے:

"سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، رامپور، بریلی، لکھنؤ، جائس، بہرائچ، گورکھپور،

---

[1] درالمعارف ... نزہۃ الخواطر [2] آثار الصنادید باب چہارم۔

اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ ریلیں تھیں، نہ آمد و رفت کی وہ سہولتیں جو آج حاصل ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اسی دور میں انگریزی عملداری سے کچھ پہلے حضرت سید احمد شہید (شہید ۱۲۴۶ھ) اور ان کے جلیل القدر رفیقوں مولانا عبدالحی بڑھانوی (م ۱۲۴۳ھ) اور مولانا اسمٰعیل شہید (شہید ۱۲۴۶ھ) اور ان کے مخلص متبعوں نے مسلمانوں کو خدا اور رسول کی طرف رجوع کی دعوت دی اور تجدید ایمان و توبہ اور خدا کی طرف رجوع کی صدا بلند کی اور غفلت و معصیت اور خلاف شرع زندگی کے خلاف جد و جہد شروع کی مسلمانوں نے جس ذوق و شوق کے ساتھ اس دعوت پر لبیک کہی اور جس طرح پروانہ وار اس جماعت کے امیر کے گرد جمع ہوئے جس عالی حوصلگی اور فراخ دلی کے ساتھ اس کے وفود کا خیر مقدم کیا، یہ دینی محبت و ذوق کا ثبوت ہے۔ پھر جس طرح ہندوستان میں اسلام کے سرمایۂ اخلاص کے بہترین پھولوں کا عطر کھینچ کر اس پیمانہ میں آگیا جو ۱۲۴۶ھ میں آخر میں بالاکوٹ کی خاک میں مل گیا اس سے دین کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے زوال میں بھی مسلمانوں میں دینیت کی کتنی طلب اور فطرت سلیمہ کا کیسا ذوق اور بشر اور کیسی عالی ہمتی و روشنی اور صلاحیت واستعداد تھی۔

مسلمانوں کے اس دینی ذوق کا اندازہ ان تبلیغی سفروں کی روداد سے ہوگا جو حضرت نے بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ دوآبہ کے قصبات اور شہروں میں اور پھر اودھ میں کیے۔[2]

مسلمانوں کے ذوق و اشتیاق کا مزید اندازہ سید صاحب کے سفر حج سے ہوگا جو آپ نے ۱۲۳۶ھ میں کیا، اس پورے سفر میں ہندوستان کا وہ مشرقی خطہ جو اب تین صوبوں (صوبہ متحدہ، بہار اور بنگال) پر مشتمل ہے اور اس وقت آپ کی گزرگاہ تھا، مسلسل جنبش اور حرکت میں تھا، ہر جگہ

۱؎ روداد افاد رحمن ص ۱۔ ۲؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید، باب ۸۔

دنیا کے طالب سلطان پر پروانوں کی طرح گرتے تھے، معصیت اور غفلت کی زندگی سے توبہ کرتے تھے، اور فقراء سے نیا عہد و پیماں باندھتے تھے، دیہاتوں اور گاؤں کے لوگ سیکڑوں کی تعداد میں فوج فوج آتے تھے اور بیعت و توبہ کرتے تھے، اہل شوق اپنے مواضعات اور مقامات پر لے جاتے تھے۔

منشی امین الدین نے جب تک سامان ہوئے قافلہ کی (جس میں کلکتہ پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات سو آدمی ہو گئے تھے) اور ان صدہا مسلمانوں کی جو قرب و جوار سے جمع ہو جاتے تھے، دل کھول کر کئی دن ضیافت کرتے تھے، مسلمان رؤساء انشاء اللہ اولوالعزمی سے دین کے کام میں اپنی دولت صرف کرتے تھے، شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد نے بارہ تیرہ دن میں مجموعی طور پر بیس ہزار روپے صرف کئے، ان کے دسترخوان پر دونوں وقت سیکڑوں آدمی کھانا کھاتے تھے، بعض لوگوں کا تخمینہ تھا کہ ایک ہزار روپیہ روزانہ کھانے پر صرف ہوتا تھا۔[1]

لوگوں کے رجوع اور اہل طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں تھوڑے آدمی ایسے ہوں گے جو توبہ و بیعت سے اور اس قافلہ کے دینی برکات سے محروم رہ گئے ہوں گے، الہ آباد، مرزا پور، بنارس، غازی پور، عظیم آباد، پٹنہ اور کلکتہ میں مجموعی طور پر ایک لاکھ مسلمانوں نے بیعت و توبہ کی، دین کی عمومی اہمیت اور طلب کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بنارس میں اسپتال کے مریضوں نے یہ پیغام بھیجا کہ ہم معذور ہیں، وہاں تک ہمارا آنا دشوار ہے، اگر آپ بشرف قدوم یہاں تشریف ارزانی فرمائیں تو ہم بیعت کر لیں، آپ ایک روز چند آدمیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے اور ان مریضوں نے بھی توبہ و بیعت کی۔[2]

کلکتہ میں دو مہینے قیام رہا، روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے، روز بروز ہجوم بڑھتا جاتا تھا، کثرت بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے رات گئے تک مردوں اور

---

[1] مخزن احمدی (فارسی) از مولوی محمد علی صاحب مرحوم ص ۱۲۶؛ [2] ایضاً

عورتوں کا ہجوم رہتا۔ سید صاحب کو سوائے نماز پڑھنے کھانا کھانے اور ضروریات بشری کے کچھ فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک ایک شخص سے بیعت لینا محال تھا، ایک وسیع مکان میں سب جمع ہو جاتے تو آپ تشریف لاتے، سات آٹھ دستاریں کھول کر آپ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے، لوگ ان کو جا بجا سے تھام لیتے اور آپ بیعت کے الفاظ کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین فرماتے۔ دن میں سترہ اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا اور ہزاروں آدمی روزانہ اس طرح بیعت سے مشرف ہوتے۔[1]

نماز ظہر کے بعد سید صاحب نے ۱۵-۲۰ روز تک وعظ فرمایا، وعظ میں دو دو ہزار امرا و رؤسا اور امیر ہر روز آتے تھے اور غربا کا تو کچھ شمار نہ تھا۔ مولانا عبدالحی صاحب ہر شنبہ کو نماز ظہر کے بعد سے شام تک وعظ فرماتے تھے اور لوگ پروانہ وار جمع ہو جاتے تھے، روزانہ ۱۵-۲۰ ہندو مسلمان ہوتے۔[2]

اصلاح و دین داری اور رجوع الی اللہ و انابت کی اس عمومی فضا کا اثر یہ ہوا کہ کلکتہ میں یکایک شراب کی بکری موقوف ہو گئی، دوکانداروں نے جا کر سرکار انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں اور دوکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلے کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوگئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں اور انھوں نے مسکرات (نشہ آور چیزوں) سے توبہ کی ہے اب کوئی ہماری دوکانوں کی طرف پھر کر بھی نہیں نکلتا۔[3]

دین اور اہل دین کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب حج کا یہ قافلہ جو سات سو آدمیوں پر مشتمل تھا مکہ معظمہ سے واپسی میں مرشد آباد کے قریب پہونچا اور غلام مرتضیٰ کے دولت خانہ پر مقیم ہوا تو انھوں نے بھرے بازار میں اعلان کر دیا کہ سید صاحب کے قافلہ کا جو آدمی اس بازار سے کچھ خریدے یا کسی دستکار سے کام لے تو اس کی قیمت و اجرت میرے ذمہ ہے۔ سید صاحب نے ان کو سمجھایا کہ آپ اس قدر زیر بار کیوں ہوتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ کسی مسلمان کے گھر کوئی حاجی آجاتا ہے تو اس کی بڑی سرفرازی

---

[1] وقائع احمدی (قلمی) [2] ایضاً [3] ایضاً

بھوتی ہے میں اپنی قسمت پر جو کچھ ناز کروں کم ہے کہ اپنے حج یا جہاد نے مجھے سرفراز فرمایا۔

پھر جب سید صاحبؒ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی تو مسلمانوں نے گرم جوشی کے ساتھ قبول کی کاشتکار ہل چھوڑ کر تاجر دکانیں بند کر کے ملازم اپنے آقا کو سلام کر کے امراء اپنے محلوں سے نکل کر علماء اور مشائخ مسند درس و ارشاد چھوڑ کر ساتھ ہو گئے اور کسی نے پلٹ کر اپنے گھر کو نہ دیکھا یہاں تک کہ ان سرفروشوں کی آخری جماعت بالاکوٹ کی تنگ اور سنگلاخ گھاٹی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان (جن میں مسافر کا چلنا بھی آسان نہیں) اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلہ میں جان دی اور مرتے مرتے بھی گھر کو یاد نہ کیا۔

یہ ساری تفصیل اس لئے لکھی گئی ہے کہ اس کا اندازہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے برائے نام اقتدار کے بالکل آخری دور میں اور ان کے تنزل و انحطاط کے شباب کے زمانہ میں بھی مغربی استیلاء و تغلب کے عہد سے پہلے مسلمانوں میں کتنی دینی طلب اور قدر اور کس قدر دین کا ذوق و احساس اور کس قدر عالی ہمتی اور بلند حوصلگی تھی۔

انگریزی عملداری کے ابتدائی دور میں بھی جب کہ مغربی تہذیب و تعلیم اور اخلاق و سیاست کا اثر ہندوستان کی عام زندگی پر نہیں پڑا تھا پچھلے دور کے اثرات موجود تھے اگرچہ ان کا دم واپسیں تھا اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۱۳ھ) جیسے بزرگ جنھوں نے دونوں دور اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اپنے زمانہ کی دینی ویرانی پر حسرت کرتے تھے اور بڑے درد سے فرماتے تھے۔ ع

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

لیکن اگرچہ باد خزاں چلنے لگی تھی مگر خزاں کا دور دورہ نہیں ہوا تھا خدا طلبی کا ذوق موجود تھا

ا۔ تذکرۃ الصدر از مولوی سید جعفر علی نقوی (م ۱۲۸۸ھ)

اہل اللہ سے تعلق اور اصلاح و تربیت زندگی کا ایک ضروری شعبہ سمجھا جاتا تھا، اہل علم و اہل دین کو چھوڑ کر عام کاروباری مسلمان اور دنیادار امراء بھی اس خیال سے خالی اور اس شوق سے محروم نہ تھے، بڑے بڑے مرکزی شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قصبات اور گاؤں بھی مردان خدا سے معمور تھے، خدا کی طرف بلانے والے اور اللہ کا نام سکھانے والے مسلمانوں کی آبادیوں، شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں اس طرح تسلسل کے ساتھ پائے جاتے تھے کہ مشکل سے کوئی گوشہ ان کے وجود سے خالی ہوگا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کے ہندوستان پر نظر ڈالئے! اس سرزمین کے [illegible] ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک چراغوں کی ایک قطار نظر آئے گی۔

رفتہ رفتہ چراغ ایک ایک کر کے بجھنے شروع ہوئے، دیئے سے دیا جلنا تو عرصے سے موقوف ہو گیا تھا، یہ سب دیئے بھی گل ہو گئے، موسم نے رفتہ رفتہ پورا اثر کیا، فصل خزاں میں درختوں کو جلاتے اور سوکھے پتے گراتے کس نے دیکھا ہے، لیکن موسم اور ہوا کی تاثیر ہے کہ پتے زرد اور پھول سوکھ کر خود جھڑ جاتے ہیں، انگریزی عملداری کی طرف سے کبھی یہ اعلان نہیں ہوا کہ خانقاہیں بند کر دی جائیں اور اصلاح و ارشاد کی بساط تہ کر دی جائے، اس کے بجائے اس زمانہ میں سفر کی بڑی سہولتیں پیدا ہو گئیں، اور دور دراز کے مقامات پر پہونچنا پہلے سے بہت آسان ہو گیا، مگر دلوں سے وہ طلب اور شوق ہی نکل گیا جو سمرقند و بخارا سے طالبین کو پیادہ پا کھینچ لاتا تھا، اس نے اس درخت پر تیشہ کبھی نہیں چلایا اور اس کو کبھی آگ نہیں دی، مگر جڑ کو پانی نہ پہونچنے اور موافق ہوا اور فضا نہ پانے کی وجہ سے اس کی شاخیں خود سوکھتی چلی جا رہی ہیں اور پھلنا پھولنا اس نے عرصہ سے چھوڑ دیا ہے۔

زندگی میں خدا طلبی کا کوئی تقاضا اور چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی نہیں رہا۔ قلب و روح کی جگہ بھی معدہ اور شکم نے پر کر دی، زندگی کی تمام بلند اور لطیف حقیقتیں اوجھل ہو گئیں، اب مرنے کے

زلفِ شکیب کی زبان پر ہے سے

نہ ڈھونڈ اہلِ دل کو اب کہ جوشِ قلزمِ فنا
ساحلِ وجود پہ تھیں وہ کشتیاں ڈبو چکا

دنیا طلبی کا بحران

خدا طلبی کے بجائے اب یہ دنیا طلبی کا دور ہے اور اس سے کہیں زیادہ زور و شور کے ساتھ آیا ہے۔ اس مغربی تہذیب و اقتدار کے دور میں دنیا طلبی اور شکم پرستی کا جو طوفان آیا ہے اس کے لئے بحران و ہیجان سے کم الفاظ کفایت نہیں کرتے۔ مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے جس کو جوع البقر کہیے یا استسقا کا مرض، ہر طرف "ھل من مزید" کی صدا بلند ہے۔ زندگی کی ہوس اتنی بڑھ گئی ہے اور معیار اتنا بلند ہو گیا ہے کہ رسا فرد کو کسی منزل پر قرار اور طائرِ حرص کا کسی بامِ بلند پر بھی آشیانہ نہیں، دولت اور عزت و جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار اور اونچی سے اونچی سطح تشفی کے لئے کافی نہیں۔

مغربی تہذیب و اقتدار کے اس دور میں درحقیقت علم کا حقیقی ذوق، ادب و شعر کا کوئی اور ذوقِ لطیف کام کر رہا ہے، بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہے، عالمِ خیال میں کتابیں تصنیف کرنے والے خوش فکر مصنفین جو چاہیں لکھیں، عملی زندگی میں اس وقت صرف ایک قوتِ محرکہ اور ایک زندہ حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ پیٹ ہے یا جیب ہے۔

مسٹر جوڈ کا قول صرف یورپ ہی کے متعلق صحیح نہیں ہے بلکہ ساری مغرب زدہ دنیا کے متعلق صحیح ہے:-

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ

اور معاشرہ کو بحیثیت مجموعی تنقیدی نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے؟

کسی زمانہ کے ذوق اور رجحانِ عام اور حقیقی معیارِ زندگی کا صحیح اندازہ ان کتابوں سے نہیں ہوتا جو اس زمانہ میں تصنیف کی جاتی ہیں (اگرچہ عام ذوق و رجحان کے اثرات سے کتابیں بھی محفوظ نہیں ہوتیں اور وہ کسی نہ کسی پردہ سے بھی جھلکتا ہے) لیکن بعض اوقات مصنفین اپنے انفرادی ذوق یا قوم کی کسی مختصر جماعت کے رجحان کے نمائندے ہوتے ہیں اور بعض اوقات واقعات کے بجائے اپنی خواہشات کو واقعات کے طور پر پیش کرتے ہیں، زمانہ کے ذوق اور رجحان کا حقیقی اندازہ روزمرہ کی زندگی، بے تکلف گفتگو، مجالس کے موضوعِ سخن اور لوگوں سے ملنے کے بعد ہوتا ہے، بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

اس اصول پر ریل کے طویل سفروں میں، صبح و شام کی سیر میں، چائے اور کھانے کی میز پر، پارک اور سیرگاہوں کے سبزہ زار نشستوں پر، احباب و رفقاء کی بے تکلف گفتگو کے موقع پر کان لگا کر سنئے کیا موضوع ہے؟

تنخواہوں کی کمی بیشی، افسروں کی رضامندی و نارضامندی، حکام کا تبادلہ اور ان کے مزاج و معاملہ پر تنقید، تنخواہوں کا منافع، ٹھیکیداری کے امکانات، بینکوں کے حسابات، شرح سود، کمپنیوں کے حصص، انشورنس کمپنی یا پالیسی، پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ، سبکدوشی کے بعد ملازمت کے امکانات، فتوحات کے واقعات، خوش قسمتوں پر رشک، بدقسمتوں پر تاسف اور اسی قبیل کی باتوں کے سوا آپ کوشش کے باوجود بھی کوئی موضوعِ گفتگو نہیں پائیں گے۔

یا پھر سیاسی حالات اور ان پر تبصرہ لیکن کسی اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں کسی نظام یا سیاسی

اخلاقی عقیدہ اور کسی نظامِ صالح کی تمنا کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

مغرب اس بارے میں امام ہے اور ہندوستان کے ہندو اس معاشی ہمہ اوست میں اس کے قدم بقدم، اور افسوس ہے کہ مسلمان بھی اب اس کے نقشِ قدم پر ہے۔

اخلاقی تغیر و زوال

مشرق میں جب اوّل اوّل مغربی تاجر پھر فاتح آئے ہیں تو یہاں عرصے سے اخلاقی انحطاط شروع ہو چکا تھا، مشرقی اور اسلامی تہذیب کی خصوصیات یا تو روبہ تنزل تھیں یا ان میں افراط و تفریط اور تحریف شروع ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی بعض ایسے اخلاقی خصائص پائے جاتے تھے، اور اس میں ایسی ترقی ہو چکی تھی جس کا تصور بھی اس زمانہ میں مشکل ہے، مشرقیوں نے بعض اخلاق و خصائل کو ترقی دیتے دیتے ایک مستقل فن بنا دیا تھا، اور اس میں ایسی نزاکت و نفاست پیدا کی تھی جو مغرب میں صرف ادب و شاعری اور فنونِ لطیفہ کا حصہ ہے۔

اسلامی مشرق میں افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلقات لئے اتنے مستحکم، پیارے اور حسین تھے، جو اس زمانہ کے تصور سے بالاتر ہیں، اولاد کی محبت والدین کے ساتھ، والدین کی شفقت اولاد کے ساتھ، خوردوں کی تعظیم بزرگ کے لئے، بزرگ کی تواضع و شفقت، عورت کی عفت، آپس کی ازدواجی وفاداری، ملازم کی نمک حلالی اور امانت داری، نوجوانوں کی اخلاقی استقامت، شرفاء کا معاملہ، رشتوں کے تعلقات و ملاقات، اوقات و معمولات، لباس و معاشرت میں کامل یکسانی اور وضعداری، دوستوں کے لئے ایثار و قربانی اور ہمدردی اس میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل عنوان ہے جس کے ماتحت ایسے واقعات ہیں جن کو زیادہ زمانہ گزر جانے کے باعث آسانی سے یاد نہیں کیا جائے گا لیکن ابھی ان کے یاد کرنے کے اسباب و قرائن موجود ہیں۔

اولاد کی اطاعت و سعادت مندی اسلامی معاشرے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک (اور شاید کہیں کہیں اب بھی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی پوری تعمیل تھی جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ "انت و مالك لأبيك" (تم اور تمہاری ملکیت و دولت سب تمہارے باپ کی ہے)

والدین کی محبت اور ان کے حقوق کا جذبہ ان کی ذات اور ان کی زندگی تک محدود نہ تھا ان کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ان کے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ سلوک اور اعانت تحائف و ہدایا کے ذریعہ اظہار محبت بالکل سعادت مند اولاد کے گویا اخلاقی فرائض اور سعادت مندی کے لوازم میں سے تھا، اور یہ بھی دراصل نبوت کی اس اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا نتیجہ اور ثمرہ تھا کہ "من ابر البر صلة الرجل اهل ود ابيه بعد ان يولى"[1] (سب سے بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ انسان کا اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ اس کے انتقال کے بعد حسن سلوک ہے۔)

والدین کا تعلق اولاد کے ساتھ صحیح خیر خواہی اور مشفقانہ ایثار و قربانی کا نمونہ ہوتا تھا، وہ اس کے لئے اپنے لذائذ، خواہشات اور راحت قربان کرتے تھے اور اس کی صحیح تعلیم و تربیت اپنا اصلی فرض سمجھتے تھے اور اس کی تعلیم، اخلاقی تنبیہ اور استادوں کی سرزنش و تادیب کے موقع پر اپنا دل پتھر کا بنا لیتے تھے، ایسے موقع پر بچہ کی جانب داری اور حمایت اور استاد کے فعل سے ناراضگی معیار شرافت سے بہت گری ہوئی بات سمجھی جاتی تھی جس کے لئے کوئی شریف باپ تیار نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ غیر تعلیم یافتہ والدین بھی بعض اوقات استاد کی زیادتی پر استادوں ہی کی تائید اور بچہ ہی کو زجر و تنبیہ کرتے تھے، یہ فقرہ عام طور پر والدین کی زبان زد تھا کہ "استاد کا حق باپ سے زیادہ ہے"۔

اسلامی معاشرے میں بڑے اور چھوٹے کا تعلق "من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا فليس منا" (جو اپنے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور جماعت کے بزرگ کی توقیر نہ کرے وہ ہماری جماعت میں سے

---

[1] صحیح مسلم

نہیں ہے اس کی تصویر تھی۔

مشرقی ثقافت و تہذیب کا جوہر وضعداری و استقامت اور زندگی کی یکسانی ہے اس پچھلے دور میں اس پر شرفا سوسائٹی میں بھی اس بارہ میں عجیب و غریب مثالیں ملتی ہیں جو شخص جو کام شروع کر دیتا تھا برسوں کرتا رہتا تھا۔ جو معمول مقرر کر لیتا تھا اس میں موسم کے تغیرات، صحت کے اتار چڑھاؤ اور معمولی حوادث اور تنگدستی سے فرق نہیں آنے دیتا تھا جس سے جس طرح معاملہ شروع کر دیتا تھا آخر دم تک نبھاتا تھا خواہ اس میں کچھ بیت جائے اور حالات میں کچھ بھی تغیر ہو جائے۔

اس دور میں خاندانی اور قبائلی زندگی میں فرد کی عزت و توقیر کا معیار و تعلقات کی وابستگی کا شجرہ تھا دولت و ثروت نہ تھی۔ ایک خاندان میں مختلف افراد خاندان مختلف معاشی سطح کے ہوتے کوئی دولت مند ہوتا کوئی تنگدست و پریشان حال لیکن خاندانی اجتماعات و مجالس میں یہ مجال نہ تھی کہ مالی حیثیتوں کے فرق کی بنا پر ایک خاندان کے لوگوں کے درمیان تفریق یا مختلف معاملہ کیا جاتا اگر کبھی ایسی غلطی ہو جاتی تو اس پر سارا خاندان احتجاج اور بعض اوقات مقاطعہ کرتا۔ ایک تنگدست شریف زادہ دوسرے مرفہ الحال بھائی سے آنکھیں چار کر کے باتیں کرتا اور وہ اس کے علاوہ خاندانی جوہر شرافت یا لیاقت یا قرابت کی بنا پر مساویانہ سلوک کرتا اس میں بھی بڑا اہتمام تھا کہ غربت و عسرت کا اظہار قریب ترین متعلقین کے سوا کسی پر نہ ہونے پائے۔

اسلامی احوال کے دور آخر تک شریف و با اصول انسان کا ضمیر اس کی عزت آبرو اور مذہبی عقیدہ کی طرح ایک ایسی ناقابل فروخت چیز سمجھی جاتی تھی جس کا دنیا میں بدلہ نہیں ہو سکتا تھا اور جو بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت نہیں کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے آگے پیچھے مسلمان شرفا کی متعدد نظیریں ملیں گی کہ انہوں نے اپنی موت گوارا کیا لیکن ضمیر کا خون کرنا پسند نہیں کیا اور اس سے گولی کھائی یا پھانسی پر چڑھے کہ جھوٹ بولنا منظور نہ تھا اور جان بخشی کے لئے ضروری تھا کہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچا

چیتیں کریں یا اور ہنگامہ میں شرکت سے انکار کریں جو ان کے نزدیک خلاف واقعہ اور خلاف تعبیرات تھا۔

قومی و ملی باتوں میں بھی وہ اسی طرح سچے ثابت ہوتے تھے جس طرح شخصی خانگی معاملات میں قومی عصبیت وجانبداری کی وہ ہوا جو مغربی قوم پرستی کے دور میں چلی ہے اس وقت تک نہیں چلی تھی وہ قوم کے معاملات میں بھی جھوٹ بولنا، جھوٹی شہادت دینا اسی طرح گناہ سمجھتے تھے جس طرح اپنے ذاتی معاملات میں احکام شریعت کو وہ شخصی اور قومی تمام امور و مسائل کے لئے عام سمجھتے تھے، اور قرآن مجید کی حسب ذیل ہدایات ان کے پیش نظر تھیں:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء - ۱۳۵)

اے ایمان والو انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو خواہ تمہیں گواہی خود اپنے خلاف یا اپنے والدین اور اعزہ کے خلاف دینی پڑے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ (المائدہ - ۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے معاملہ میں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو، انصاف کرو یہی خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کا لحاظ کرو۔

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (سورۃ النساء - ۵۸)

جب لوگوں کے درمیان حکم اور ثالث بنو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (الانعام - ۱۵۲)

جب بات کہو تو انصاف سے کہو چاہے کسی قرابت والے کے خلاف پڑے۔

انگریزی عملداری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبہ کاندھلہ میں ایک جگہ پر

ہندو مسلمانوں کا تنازعہ ہوا کہ یہ ہندوؤں کا معبد ہے یا مسلمانوں کی مسجد۔ انگریز مجسٹریٹ نے
فریقین کے بیانات سننے کے بعد مسلمانوں سے تخلیہ میں پوچھا کہ کیا ہندوؤں میں کوئی ایسا شخص ہے
جس کی صداقت پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں اور جس کی شہادت پر فیصلہ کر دیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ
ہمارے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں۔ ہندوؤں سے پوچھا تو انہوں نے کہا یہ بڑی آزمائش کا موقع ہے
معاملہ قومی ہے لیکن پھر بھی ایک مسلمان بزرگ ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے، شاید وہ اس موقع پر بھی
سچی ہی بات کہیں۔ یہ بزرگ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ (تلمیذ حضرت شاہ عبد العزیزؒ خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ)
کے خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ مجسٹریٹ نے ان کے پاس چپراسی بھیج کر عدالت میں طلب کیا۔ انہوں نے
فرمایا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا کبھی منہ نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے کہلوایا کہ آپ میرا منہ
نہ دیکھیں لیکن تشریف لے آئیں، معاملہ اہم ہے اور آپ کے یہاں تشریف لائے بغیر فیصلہ نہیں ہو سکتا
وہ بزرگ تشریف لائے اور پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ معاملہ ان کی خدمت میں عرض کیا گیا اور
دریافت کیا گیا کہ آپ کو اس بارہ میں کیا علم ہے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر تھیں
اور کان ان کے جواب پر لگے ہوئے تھے جن پر ایک اہم قومی معاملہ کا فیصلہ ہونا تھا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ
صحیح بات تو یہ ہے کہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ عدالت کا فیصلہ
ہو گیا، جگہ ہندوؤں کو مل گئی، مسلمان مقدمہ ہار گئے لیکن اسلام کی اخلاقی فتح ہوئی۔ صداقت
اور اسلامی اخلاق کے ایک مظاہرہ نے چند گز زمین کھو کر بہت سے غیر مسلم انسانوں کے ضمیر اور
دل و دماغ جیت لئے۔ بہت سے ہندو اسی روز ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔

ضمیر کے علاوہ علم و دانش اور دماغی قوت و ذہانت بھی ایک ایسی مقدس اور قیمتی چیز
سمجھی جاتی تھی جس کو ہر کس و ناکس کے ہاتھ اونے پونے فروخت نہیں کیا جاتا تھا۔ جو لوگ اس بارہ
میں بلند مقام پر تھے وہ تو کسی قیمت پر بھی ان کو فروخت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس کو اشرا کا

بیش قیمت عطیہ اور امانت سمجھتے تھے خصوصاً انگریزوں کی بلا واسطہ یا بالواسطہ اعانت و تقویت یا اس کو صرف کرنا یا کسی غلط نظام کا آلۂ کار بننا تو بہت بڑی خیانت اور دینی خودکشی سمجھتے تھے۔

اسی ذہنیت اور سیرت کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحیم صاحب رامپوری (م ۱۲۴۳ھ) تھے بریلی کے انگریز حاکم مسٹر ہاکنس نے ان کو بریلی کالج کی مدرسی کے لئے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ کی (جو سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے حیثیت وہ رکھتا تھا جو اس وقت ہزار بارہ سو کی بھی نہیں ہے) پیشکش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ میں اضافہ و ترقی ہو جائے گی انہوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے کئی گنا زیادہ پیش کرتا ہوں اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے انہوں نے اس کے بعد یہ عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے اس کی بیریاں میٹھی اور مجھے مرغوب ہیں بریلی میں وہ بیریاں کھانے کو نہیں ملیں گی۔ بظاہر یہ انگریز اب بھی ان کے دل کی بات نہیں پاسکا، اس نے کہا کہ رامپور سے آنے کا انتظام ہو سکتا ہے آپ بریلی میں بیٹھے بیٹھے بھی اپنے گھر کی بیریاں کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رامپور میں درس لیتے ہیں ان کا درس بند ہو جائے گا اور میں ان کی خدمت سے محروم رہ جاؤں گا، انگریز کلکٹر نے اب بھی ہار نہیں مانی، اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں وہ بریلی میں آ کے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں، آخر اس مسلمان عالم نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے تعلیم پر اُجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا، ہندوستان کے فاتح نے اب اپنی شکست تسلیم کر لی اور مولانا عبدالرحیم صاحب نے نواب احمد علی خاں والیٔ رامپور کے دس روپیہ ماہوار پر اپنی زندگی گزار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ[1]

---

[1] [illegible]

اس، حقائق بلندی اور کردار کا مقابلہ اس زمانہ کی دانش فروشی سے کیجئے اس زمانہ کے اہل دانش نے اپنے علم لیاقت اور ذہانت کو نیلام پر چڑھا رکھا ہے کہ جو زیادہ بولی بولے گا اس کے ہاتھ فروخت کردیں گے اگر کوئی اسلامی ادارہ تنخواہ دے رہا ہے اور کسی نصرانی ادارے نے ایک سو پانچ لگا دئے تو اس کی طرف منتقل ہوگئے اور اگر کوئی یہودی اسٹیٹ قائم ہوجائے اور وہ پانچ بڑھا کر بولی دے تو اس کے ہاتھ بک جائیں گے مناسبت موضوع اور ذوق کی بھی کوئی شرط نہیں اگر حالات اجازت دیں تو محکمہ تعلیم کا آدمی برائے نام ترقی پر پولیس کے محکمہ یا جہازرانی کے صیغہ کی طرف بخوشی منتقل ہوسکتا ہے ایک فاضل جس نے کسی علمی مقالہ پر ڈاکٹریٹ حاصل کیا اور جو تحقیقی مقالے لکھا کرتا تھا آپ اس کے متعلق سن سکتے ہیں کہ نہایت معمولی اضافہ کی بنا پر وہ کسی ایسے فوجی یا سیاسی محکمہ کی طرف منتقل ہوگیا ہے جس سے اس کو کوئی ذہنی اور علمی مناسبت نہیں۔

آج کسی انشا پرداز کو اس میں ذرا تکلف نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی قلم سے ایک مجاہد عالم کی سیرت لکھے پھر اسی قلم سے کسی قوم فروش کی منقبت لکھے۔

بعض شائقین کتب جب کوئی نادر بیش قیمت کتاب خریدتے تھے تو وجد و سرور میں اکثر یہ شعر پڑھتے تھے برائے نام ترمیم کے ساتھ یہ شعر اب بھی پڑھا جا سکتا ہے ؎

جمادے چند دادم جاں خریدم
بے تازاں کو بس ارزاں خریدم

اور "جان" کے بجائے اگر "ایمان" پڑھا جائے تو بھی واقعہ کے لحاظ سے کیا غلط ہے!

روابط و تعلقات اور حقوق باہمی کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ ان کی بنیاد عام حالات میں اکثر غیر مادی اور خالص عقلی و روحانی یا اخلاقی ہوتی تھی اور ان میں خود غرضی اور نفسانیت کا شائبہ کم سے کم ہوتا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض ایسے تعلقات اور روابط پائے جاتے تھے اور ان کی

جڑیں قلب و دماغ میں اتنی گہری ہوتی تھیں جن کی کوئی مادی یا منطقی توجیہ ممکن نہیں، استاد و شاگرد کا ایسا تعلق تھا جس کے سامنے اس زمانہ میں باپ بیٹے اور محب و محبوب کا تعلق گرد ہے۔ عصر جدید کا ذہن شاید اس پر ہمیشہ حیرت کرے کہ ہندوستان کے مشہور عالم اور جہاں استاد ملا نظام الدین لکھنوی (م ۱۱۶۱ھ) صاحب درس نظامی کی خبر وفات سن کر ان کے ایک شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی کا صدمہ سے انتقال ہو گیا اور دوسرے شاگرد سید ظریف عظیم آبادی کے روتے روتے آنکھیں خراب ہو گئیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔[1]

یورپ میں لذتیت اور افادیت کے دو اخلاقی فلسفے اور مکتب خیال پھلتے پھولتے رہے ہیں مشرقی اور اسلامی اخلاقیت پر دونوں اثر انداز ہیں مشرق کا اسلامی فلسفۂ اخلاق دونوں سے بہت بلند ہے، غرض اور نفسانیت، حظ نفس اور انتفاع کے خیال سے بالکل پاک ہے۔

سترہویں صدی عیسوی سے افادیت کا غلبہ ہو گیا، مغرب کے علمائے اخلاق نے ڈنکے کی چوٹ پر کہنا شروع کیا کہ اخلاق میں سے جس چیز کا فائدہ ظاہر ہو وہ قابل اعتنا نہیں ہے، لیکن اس فائدہ کی تشخیص و تعیین کے لئے جو ذہن میزان کا کام دیتا افسوس ہے کہ وہ بدلتا رہا اور پست ہوتا چلا جا رہا تھا اس کی ساخت اور افتاد روز بروز ایسی ہوتی جا رہی تھی کہ کسی غیر مادی نفع کے تصور سے وہ قاصر تھا اور اس بارے میں اس کی حس اور ذکاوت مفقود ہوتی جا رہی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق کی تحدید و تعریف نفع و انتفاع سے کی گئی یہاں تک کہ جس حکم و ثالث کے سپرد ہوا وہ اپنی جبلی افتاد و مزاج کی وجہ سے کسی غیر مادی نفع کے تسلیم کرنے کے قابل ہی نہ تھا، اسی طرح انتفاع کی تحدید تدریجی اور غیر شعوری طور پر مادی ہو گئی اور فلسفۂ اخلاق کا کسی ایسی چیز سے سروکار نہ رہا جس کا کوئی مادی و محسوس نفع نہ ہو، رفتہ رفتہ مادی ذہنیت اور افادیت ساری زندگی پر چھا گئی۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

یورپ کے ادبیات میں پچھلی صدیوں میں جن الفاظ کا استعمال سب سے زیادہ ہوا ہے اور جو الفاظ یورپ کے لئے آج بھی سب سے زیادہ کشش رکھتے ہیں ان میں ایک لفظ "فطرت" بھی ہے لیکن جن چیزوں کے بیان میں جن مواقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ان سے صاف متعین ہوتا ہے کہ "فطرت" سے مراد فطرت حیوانی ہے جو ہر قسم کے لطیف احساسات اخلاق، ضمیر اور قلب سلیم اور عقل سلیم دونوں سے آزاد ہوتی ہے ہر قسم کی پابندیوں اور حدود سے گھبراتی ہے جس کا تقاضا صرف یہ ہے کہ کھائیے پیجئے اور آزاد رہیے، اس کے لئے حقوق و مطالبات اور انسانی ذمہ داریاں نہیں ہیں انیسویں صدی میں انسان کی اصل و قدیم کے متعلق جو تحقیق کی گئی اور جس کو عام طور پر تسلیم کیا گیا وہ ہر شعبہ زندگی میں اثر انداز ہوئی اخلاق پر بھی اس کا محسوس و غیر محسوس اثر پڑا۔[1]

اس کے بعد اب اس دور میں یورپ میں میکانکی عہد شروع ہوا، انسان کا تصور خالص جمادانی ہو گیا اور وہ خود مشین کی سی ہو گیا اور زندگی کی بھی جاتی رہی جو حیوانی تصور میں پائی جاتی ہے۔

مسلمانان یورپ میں محمد اسد صاحب نے یورپ کے اس اخلاقی تغیر پر گہرا اور سنجیدہ تبصرہ کیا ہے اگر مغرب کا ذہنی دنیا میں اقتدار مشرق پر اسی طرح قائم رہا اور خود یورپ میں کوئی بڑا انقلاب نہ آیا تو آج مغرب کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے کل مشرق کے متعلق بھی وہی صحیح ہوگا اور اس کے آثار ابھی سے نظر آنے لگے ہیں ہر شعبہ زندگی کی طرح مشرقی اخلاق جدید مغربی سانچے میں ڈھلتے جا رہے ہیں جو حلقے مغربی تعلیم و تہذیب سے پورے طور پر متاثر ہیں ان کے اخلاق مغربی فلسفہ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں محمد اسد صاحب لکھتے ہیں:۔

> (یورپ میں) انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہو گئی ہے جس کی اخلاقیت عملی افادیت کے سوال کے اندر محصور ہے اور جس کے نزدیک خیر و شر کا بلند ترین معیار مادی کامیابی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو عنوان "ڈارون کے نظریہ ارتقا کا اثر"

مغرب کی معاشرتی زندگی موجودہ زمانہ میں جن گہری تبدیلی سے گزر رہی ہے اس میں
تمام اخلاقی اقدار میں روز بروز زیادہ سے زیادہ نمایاں کمی ہوتی جا رہی ہے وہ تمام
محاسن جو سوسائٹی کے مادی مفاد پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً صنعتی
قابلیت وطن پرستی قوم پرستانہ احساس جماعت ان کی عظمت بڑھتی جا رہی ہے
اور ان کی قیمت میں بعض اوقات غیر معقول طریقہ پر مبالغہ کیا جاتا ہے اور کچھ تو
ہیں وہ محاسن جن کی ابھی تک محض اخلاقی حیثیت سے قیمت تھی مثلاً محبت پدری یا
ازدواجی وفاداری وہ بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں کیونکہ
وہ سوسائٹی کو کوئی نمایاں مادی فائدہ نہیں پہنچاتے اس زمانہ کی جگہ جس میں خون
و رابطہ کا استحکام ہی خاندان اور قبیلہ کی خیر و فلاح کے لئے ضروری تصور کیا جاتا
تھا مغرب جدید میں اس زمانہ نے لے لی ہے جو وسیع تر مفادات کے تحت اجتماعی
تنظیم کرتا ہے ایک ایسی سوسائٹی میں جو بنیادی طور پر صنعتی ہو اور جس کی تنظیم بڑی
تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے ایک فرد کا اپنے والد
کے ساتھ طرز عمل معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا جب تک یہ افراد ان عام معینہ
حدود کے اندر ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہیں جو سوسائٹی نے افراد کے باہمی برتاؤ کے لئے
مقرر کر دی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں باپ کا اقتدار اپنے بیٹے پر کم ہوتا جا رہا ہے
اور بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ روبہ زوال ہے
ان دونوں کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور عملاً
ایک ایسی مشینی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے
باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ …

رشتہ داری کے پیدا کئے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جاتے ہیں؟

پست ہمتی و تن آسانی

اسلامی مشرق میں انسانی ترقی اور کمال کا معیار بہت بلند تھا۔ اس کے لئے دین و دنیا اور علم و عمل کی جامعیت بہت سے متفرق انسانی صفات سے اتصاف اور انسانی کمالات بہت سے ایسے منتشر شعبوں کا اجتماع ضروری تھا جن میں اس زمانہ کی پست ہمتی اور کوتاہ نظری تضاد بھی سمجھتی ہے اور کسی فرد انسان میں ان کے بیک وقت اجتماع کے تصور سے اکثر قاصر ہے۔ پوری دنیائے اسلام میں سے صرف ہندوستان کے سلاطین اور ان کے امراء و وزراء کی سیرت پر ایک نظر ڈال لیجئے آپ کو عالی ہمتی و بلند حوصلگی، کمالات و خصوصیات کے تنوع، قبائے شاہی کے اندر درویشی، مہمات سیاسی کے انہماک و تن دہی کے ساتھ عبادت کی مشغولیت و سرگرمی، علمی ذوق و مطالعہ کے ایسے نادر نمونے ملیں گے جن کی نظیر عام انسانی تاریخ میں ملنی آسان نہیں اور جن کی تصدیق میں اس زمانہ کا تنگ ظرف ذہن اور انسانی ترقی و کمال کا محدود تصور بار بار دقتیں محسوس کرے گا۔

سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت کی وسعت اور اس کی ملکی و سیاسی مصروفیت کا حال تاریخ ہندوستان کا ہر طالب علم جانتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کی انتظامی مشغولیت، شاہانہ ضروریات و مطالبات، جنگوں اور سفروں کی کثرت اس کی مذہبی پابندی اور معمولات میں مطلق حارج نہ تھی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی کبھی عصر کی سنتیں اور تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوئی ہو، جب اس وصیت کا اعلان کیا گیا تو سلطان آگے بڑھا اور اس نے نماز پڑھائی۔

سلطان غیاث الدین بلبن، ناصر الدین محمود، فیروز تغلق کی مذہبی زندگی اور شریعت کی پابندی کا حال کوئی چھپا ہوا واقعہ نہیں۔

سلاطین گجرات بالخصوص دین و دنیا کی جامعیت اور جنیدی و ادہمی فقیری کا بہترین نمونہ تھے، محمود شاہ اول (م ۹۱۷ھ) اور اس کے بیٹے مظفر شاہ حلیم (م ۹۳۲ھ) کے حالات اس کی بہترین شہادت ہیں۔

مؤرخ ہندوستان مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مظفر شاہ حلیم کے حالات "یاد ایام" میں لکھتے ہیں:—

"محمود شاہ کے بعد اس کا فرزند رشید نعم الخلف تشمّم السلطنت کا صحیح مصداق مظفر شاہ حلیم تخت و سریر کا مالک ہوا، علوم و فنون میں یہ علامہ محمد ابن محمد الایجی کا شاگرد تھا اور حدیث علامہ جلال الدین محمد بن عمر بحرق سے پڑھی تھی، قرآن مجید حفظ کر لینے کا شرف اسی طرح اس کو نصیب ہوا تھا جس کی نسبت شیخ سعدی فرماتے ہیں ______

—— در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی، اس فضل و کمال کے ساتھ تقویٰ اور شریعت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی، تمام عمر نصوص احادیث پر عمل کیا، ہمیشہ باوضو رہتا، نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا، روزے عمر بھر نہیں چھوٹے، شراب ناب کو کبھی منہ سے نہیں لگایا، کبھی کسی پر بے جا سختی نہیں کی، بدزبانی سے اپنے منہ کو گندہ نہیں کیا، عجیب تر بات یہ ہے کہ اس پیکر تقدس میں سپہ گری اور ملک داری کی صفتیں بھی علی وجہ الکمال مجتمع تھیں، مالوہ کی فتوحات عظیمہ تاریخوں میں پڑھئے لیکن اس سے اس کے اخلاق فاضلہ کا اندازہ کیجئے، جس وقت محمود شاہ دوم مالوہ کی غفلت و بدتدبیری سے اس کے وزیر میدنی رائے نے زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے کر محمود شاہ کو

بے دخل کر دیا اور شعائر اسلام کو شاکر رسوم کفر کی ترویج شروع کر دی مظفر شاہ حلیم
علیہ الرحمہ کی رگ حمیت کو جنبش ہوئی اس نے افواج قاہرہ کے ساتھ مالوہ کی جانب
نہضت فرمائی اور کوچ در کوچ کرتا ہوا مانڈو پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا میدنی رائے
نے یہ سمجھ کر کہ وہ خود تاب مقاومت نہیں لا سکتا رانا سانگا کو جس نے بھیجا تھا الف کا پیغام دے کر
اپنی مدد کے واسطے بلایا وہ خود سارنگ پور تک ہی پہنچا تھا کہ مظفر شاہ حلیم نے اس کی
مدارات کے لئے اپنی فوج ظفر موج کا ایک معقول حصہ آگے کو روانہ کر دیا جس سے رانا کو
آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکی اور قبل اس کے کہ مدنی رائے کو اطراف و جوانب سے
کمک پہنچے قلعہ کو مسخر کر لیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر شاہ حلیم اندر داخل ہوا اور امراء
ہمرکاب نے شاہان مالوہ کے سامان محل اور خزائن و دفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی
سرسبزی و شادابی کی اطلاع پائی تو انھوں نے جسارت کر کے مظفر شاہ کی خدمت میں
عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار گجراتی درجہ شہادت کو پہنچ چکے ہیں۔
یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک کو اسی بادشاہ کے حوالے
کر دیا جائے جس کی سوء تدبیر سے مدنی رائے نے اس پر قابو پا لیا تھا بادشاہ نے یہ سنتے ہی
سپہ کو رخصت کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت فرمائی کہ اس کے ہمرکاب
لوگوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ جانے دے محمود نے باصرار تمام اس بات کی التجا کی
کہ بادشاہ چند روز قلعہ کے اندر آرام فرمائیں مگر مظفر شاہ نے اس التجا کو قبول نہ فرمایا
اور محمود کو خود ظاہر کیا کہ میں نے یہ جہاد محض خداوند حق کی رضامندی حاصل
کرنے کو کیا تھا تجھ کو امراء کی تقریر سے یہ اندیشہ پیدا ہوا ہوگا کہ کوئی خطرہ تو قصد

میرے دل میں پیدا ہو اور میرا خلوص نیت برباد ہو جائے میں نے تم کو کوئی احسان نہیں کیا
بلکہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔

انتقال کے قریب علما اور ارکان دولت کی ایک مجلس میں بادشاہ نے تحدیث بالنعمت کے طور پر بیان کیا کہ میں خدا کے فضل و کرم سے قرآن کے حفظ کے ساتھ ہر آیت سے متعلق ضروری مسائل واحکام اسباب نزول اور اصول تجوید کا علم رکھتا ہوں اپنے استاد علامہ جمال الدین محمد بن محمد جزری سے میں احادیث کی سند لی ہے اور صحیح متن و سند راویوں کے حال کے مجھے حفظ ہیں فقہ میں مجھے بفضل تعالیٰ وہ درک حاصل ہے کہ حدیث "من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین" (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کا فقیہ بنا دیتا ہے) کا مصداق بننے کی امید رکھتا ہوں اور اب چند برسوں سے حضرات صوفیہ و مشائخ کے طریق پر تزکیہ نفس میں مشغول ہوں اور من تشبہ بقوم فهو منهم کی بنا پر ان کے برکات کی امید رکھتا ہوں تفسیر معالم التنزیل[1] ایک بار ختم کر چکا ہوں دوبارہ پھر شروع کی ہے نصف تک پہنچ گیا ہوں باقی امید ہے کہ انشاء اللہ جنت میں ختم کروں گا۔

جمعہ کی نماز کے قریب احتضار کی کیفیت شروع ہوئی لوگوں کو حکم دیا کہ نماز پڑھنے جائیں خود ظہر کی نماز پڑھی اور کہا کہ ظہر کی نماز میں نے تمہارے یہاں پڑھی ہے عصر کی نماز انشاء اللہ جنت میں پڑھوں گا انتقال کے وقت حضرت یوسفؑ کی یہ دعا زبان پر تھی جو اس درویش بادشاہ کے بالکل حسب حال تھی۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ	پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور
وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ	باتوں کا مطلب نکالنا تعلیم فرمایا

[1] علامہ بغوی کی ضخیم تفسیر جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ	زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز
وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ	ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایسا کیجیو
مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ٥	کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی
(یوسف ـ ۱۰۱)	حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل
	ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

شیر شاہ سوری (۱۵۴۵ء/۹۵۲ھ) کے اوقات و معمولات کی فہرست جو مورخین نے لکھی ہیں
محفوظ کر دی ہے تا معلوم ہو اس زمانے میں متوسط درجے کے مشغول انسان کے لئے بھی پابندی کا التزام
مشکل ہے چہ جائیکہ اس مصروف ترین بادشاہ کے لئے جس کو پانچ برس کی مدت میں ایک صدی کا کام
کرنا تھا جو بظاہر ان انتظامی و دنیاوی مشغولیت سے ایک لمحہ کی فرصت نہیں ہونی چاہئے تھی۔

شیر شاہ تہائی رات رہتی کہ بیدار ہو جاتا، غسل کرتا اور نوافل پڑھتا، نماز فجر سے پہلے تک
ختم کر لیتا، پھر شاہی ملازمین کے حسابات دیکھتا اور دن کے اہم کاموں کے متعلق احکام و
ہدایات ارکان سلطنت کو ہدایت دیتا اور روزانہ کا معاملہ حل ہوتا تا کہ دن کو سوالات سے
اس کو پریشان نہ کریں۔ اس کے بعد فارغ ہو کر نماز فجر کے لئے وضو کرتا اور جماعت کے ساتھ
نماز فجر پڑھتا، پھر وظائف و اوراد میں مشغول ہو جاتا۔ اتنے میں حکام سلام کے لئے حاضر
ہوتے۔ بادشاہ اوراد سے فارغ ہو کر لوگوں کی ضروریات معلوم کرتا اور گھوڑے،
مکان، جاگیریں اور دل جس کو جیسی ضرورت ہوتی دیتا۔ پھر اہل مقدمہ اور داد خواہوں
کی طرف متوجہ ہوتا اور ان کی داد رسی اور حاجت براری کرتا۔ پھر افواج شاہی اور لشکر
کا معائنہ کرتا، اور فوج کے لئے امیدواروں کی قابلیت کا اندازہ کر کے ان کے تقرر
کا حکم دیتا۔ پھر ملک کی روزانہ آمدنی اور مالیہ کا معائنہ کرتا۔ پھر ارکان سلطنت، امراء و

سلطنتوں کے سفرا اور وکلا حاضر ہوتے ان سے گفتگو کرتے۔ پھر حکام اور والیوں کا لیا
کی عرضیاں گزرتیں ان کی سماعت کرتا اور حکم لکھواتا۔ پھر دوپہر کا کھانا تناول کرتا
علمائے و مشائخ بھی دستر خوان پر ہوتے۔ پھر ظہر کی نماز تک دو گھنٹے اپنے ذاتی کام انجام
دیتا اور قیلولہ کرتا۔ پھر ظہر کی نماز جماعت سے پڑھتا۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا
اس سے فارغ ہو کر پھر امور سلطنت میں مشغول ہو جاتا۔ سفر و حضر میں اس نظام الاوقات
میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ کہا کرتا تھا کہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنا پورا وقت ضروری
کاموں میں صرف کرے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے تفصیلی حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ دنیا دار تاجدار جو
کابل و قندھار سے لے کر دکن تک حکومت کرتا تھا اور اس پوری وسیع سلطنت کی بذات خود
نگرانی کرتا تھا۔ اپنی عالی ہمتی اور عزم کی قوت سے اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ تمام مہمات ملکی کے
ساتھ اول وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا تھا۔ سنن و نوافل
کی پابندی کرتا تھا۔ سخت گرمی میں بھی رمضان کے پورے روزے رکھتا تھا اور رات کو تراویح پڑھتا
تھا۔ رمضان کے عشرۂ اخیر میں مسجد میں اعتکاف کرتا تھا۔ دو شنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو ہر ہفتہ روزہ
رکھتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ اذکار و ادعیۂ ماثورہ کا پابند تھا۔ روزمرہ قرآن مجید کی تلاوت
کرتا تھا اور تمام ملکی و سیاسی مشاغل اور انتہائی رغبت کے ساتھ پوری دلچسپی سے حضرت خواجہ
سیف الدین نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ایسا استفادۂ باطنی کرتا تھا کہ وہ اپنے والد ماجد
(حضرت خواجہ محمد معصومؒ) کو اس میں آثار ذکر کے ظاہر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں۔ روزانہ کی مصروفیتوں
کے ساتھ اور اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ فتاویٰ عالمگیری کو جو اس کے حکم سے علماء ترتیب دے
رہے تھے روز کا روز سنتا تھا اور مشورہ دیتا تھا۔

عالمگیر کی تخت نشینی کا زمانہ کتنا پر آشوب اور تلاطم خیز تھا۔ اسی زمانہ میں اس کو سلطنت کی از سر نو تنظیم کرنی پڑی تھی، اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبانا پڑا، لیکن یہ عالمگیر ہی کی خصوصیت تھی کہ اس زمانہ میں جب اس کو سر کھجانے کی مہلت نہ تھی اس نے قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے وقت نکال لیا اور اپنی کتاب "اربعین" کی ترتیب دی، اس نے چالیس حدیثیں جمع کیں، تفصیلی تشریح لکھی۔ عالمگیر کا شعر ہے ؎

غم عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

لیکن اس نے اس "شیشۂ ساعت" میں جس طرح اس "ریگ بیاباں" کو بند کیا وہ اس کی منفرد جامع الخصوصیات سے ظاہر ہے۔

امراء اور وزراء میں دیکھئے تو آپ کو عبدالرحیم بیرم خان خاناں، جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی، حمید الدین محمد بن محمد امین، افتخار خاں، افضل خاں اور سعد اللہ عبد العزیز آصف خاں جیسے جامع کمالات بزرگ نظر آتے ہیں ان میں سے صرف دو (عبدالرحیم خان خاناں اور آصف خاں) کا مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عبدالرحیم خان نے درسی کتابیں مولانا محمد امین اندجانی اور قاضی نظام الدین بدخشانی سے پڑھیں اور حکیم علی گیلانی اور علامہ فتح اللہ شیرازی سے علمی استفادہ کیا، پھر جب گجرات میں قیام کا موقع ملا تو علامہ وجیہ الدین بن نصر اللہ گجراتی سے مزید تحصیل علم کی۔ ان اساتذۂ وقت کے علاوہ اس کا دربار اہل کمال اور ماہرین فن کا مرکز تھا، ان سے برابر علمی مذاکرہ و استفادہ جاری رہتا تھا۔ یہاں تک کہ تمام علوم و فنون میں تبحر پیدا کر لیا، اکثر اصناف علم و ادب میں ذوق سلیم، ناقدانہ نظر اور صحیح رائے رکھتا تھا۔ زبان دانی میں دیکھئے تو اس کو ہفت زبان کہنا صحیح ہوگا۔ عبدالرزاق خوافی مآثر الامراء میں لکھتا ہے کہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں اس کو کامل

رکھتا تھا۔ ان سب زبانوں میں فصاحت و طلاقت سے گفتگو کرتا اور بے تکلف اشعار کہتا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ فنون جنگ اور سپہ گری میں یکتائے روزگار اور شجاعت و بہادری میں نامدار تھا۔ گجرات و سندھ اور دکن کی فتوحات اس کی شجاعت و خوش تدبیری کی یادگار ہیں۔ اخلاق و کرم کے لحاظ سے دیکھئے تو تمام مورخ اس کے حسن خلق، نرم خوئی، مروت، بردباری، خاکساری اور تواضع کے ثنا خواں ہیں۔

داد و دہش اور سخاوت کی حیثیت سے دیکھئے تو سید غلام علی بلگرامی شہادت دیتے ہیں کہ اگر عبدالرحیم خانخاناں کے انعامات اور صلے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور تمام شاہان صفویہ کے انعامات اور زر پاشی ایک پلڑے پر تو عبدالرحیم کا پلڑا بھاری رہے گا۔[1]

علمی ذوق و مطالعہ کے انہماک کا عالم یہ تھا کہ عین میدان جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ پر کتاب کے اجزا ہاتھ میں کھلے ہوئے ہوتے۔ نہانے کا وقت بھی کتاب سے خالی نہ ہوتا۔ خدام کتاب کھولے ہوئے سامنے کھڑے ہوتے، نہانے کے ساتھ ساتھ کتاب کا مطالعہ جاری رہتا۔

دینی رجحان اور طبیعت کی صلاحیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانی کی نگاہ التفات اور نظر عنایت سے محظوظ تھا اور ان خوش قسمت افراد میں شامل تھا جن کو حضرت مجدد صاحب کے مکتوب الیہ اور مخاطب ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مجدد صاحب کے مکتوبات سے ان کے قلبی تعلق اور گہری ارادت کا پتہ چلتا ہے۔

آصف خان وزیر گجرات کا حال پڑھئے تو جامعیت و یکتائی کی ایک دوسری تصویر نظر آئے گی۔ عبدالعزیز نام تھا، عبدالملک کے بڑے بیٹے تھے، چھوٹی کتابیں والد سے پڑھیں، حدیث شیخ قاضی برہان الدین نہروالہ سے حاصل کی، علوم حکمیہ میں ابوالفضل گازرونی اور ابوالفتوح گجراتی

---

[1] خزانۂ عامرہ۔

کے شاگرد تھے علوم و فنون کی تحصیل سے فراغت ہوئی تو دربار خدابندہ میں پہنچے یہاں خدا کے زمانہ میں وزارت علی محمود شاہ کے زمانہ میں وکالت مطلقہ کے عہدہ پر سرفراز ہوئے باوجود ان مناصب جلیلہ کے درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی کا مشغلہ آخر وقت تک قائم رہا۔

بعض سیاسی انقلابات کی وجہ سے ایک مدت تک آپ نے مکہ معظمہ میں قیام کیا، یہاں علماء و محدثین اور بلاد و امصار کے باکمال ان کے علمی و عملی کمالات، دینی استقامت و عزیمت اور عبادات کی مشغولیت دیکھ کر انگشت بدنداں ہو گئے علامہ عمر ابن فہد مکی نے ان کے فضائل و مناقب میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور غالباً کسی ہندی کے مناقب میں یہ پہلی مستقل تصنیف ہے جو عربی میں ان کے فضل و کمال تقویٰ و تقدس کی بڑی مدح سرائی کی ہے۔

علماء و مورخین کی شہادت ہے کہ جاڑے کی شدت اور گرمی و تپش کے باوجود ان کی زندگی مکہ معظمہ میں بالکل زاہدانہ تھی قرآن کے دس پارے تہجد میں پڑھتے ابن فہد مکی کی شہادت ہے کہ مکہ معظمہ کے دس سالہ قیام میں مسجد حرام میں ایک نماز بھی جماعت سے فوت نہیں ہوئی ان کی قیام گاہ مطاف کے محاذی تھی کبھی نوافل، ذکر و تسبیح، مراقبہ و مطالعہ کے علاوہ ان کو کسی حال میں نہیں دیکھا گیا، ہمیشہ کتابوں کا درس اور علماء سے علمی مذاکرہ، بحث و تحقیق کا سلسلہ برابر جاری رہتا، علماء و مکرم بڑے شوق سے ان کی علمی مجالس میں شریک ہوتے اعلیٰ درسی اور دینی فنون کی منتہیانہ کتابوں کے اشکالات پر فاضلانہ و محققانہ گفتگو و تحقیق ہوتی۔

علم پرستی اور قدردانی کا یہ عالم تھا کہ ابن فہد مکی لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں آپ مکہ معظمہ میں اقامت گزیں تھے تو عجیب طرح کی رونق مکہ معظمہ میں پیدا ہو گئی تھی علماء و فقہاء ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے علم کا چرچا ہو گیا تھا طلباء کو دیکھ کر دوسروں نے تحصیل علم میں بڑی کوشش کی تھی طلبہ ہر طرف سے سمٹ آئے تھے اور انھوں نے حصول علم پر مستقل توجہ کی اور ساتھ ہی علمی کی

اس غرض سے جستجو وتلاش کی کہ آصف خاں کے سامنے ان کو پیش کریں اور رسوخ پیدا کریں، اور مشکلات فن کو محفوظ کیا تاکہ ان کے ذریعہ سے ان کا تقرب حاصل کریں، یہ سب اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اہل علم پر احسان وکرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بلکہ ایک مدت سے موقوف تھی، یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں ہر گلی کوچہ میں ان کو اس طرح دعائیں دی جاتی تھیں جس طرح لبیک کی صدائیں ایام حج میں بلند ہوتی ہیں۔

آصف خاں کے فضائل وکمالات کی دور دور ایسی شہرت ہوئی کہ سلطان ترکی نے ان کی ملاقات کی آرزو ظاہر کی اور شریف مکہ کے توسط سے شاہانہ اعزاز واکرام کے ساتھ قسطنطنیہ بلایا، اور بڑی توجہ واعزاز کے ساتھ اس جامع کمالات ہستی سے گفتگو کی۔

ایک رفیق سفر نے جس نے مکہ معظمہ سے قسطنطنیہ تک آصف خاں کے ساتھ سفر کیا تھا بیان کیا کہ اس پورے سفر میں آصف خاں نے کبھی کسی رخصت پر عمل نہیں کیا، ہمیشہ اسی طرح عزیمت پر عمل کرتے رہے جیسے اقامت میں کرتے تھے، خسرو پاشا عالم مصر نے آصف خاں کے لئے ایک خلعت بھیجی اور سفیر نے باصرار عرض کیا کہ بادشاہ کی خوشی کے لئے آپ اس کو ایک مرتبہ بدن پر ڈال لیں تاکہ پہننے کو ہو جائے، آصف خاں نے معذرت کی کہ یہ قبا ریشمی ہے، میں اس کو کسی طرح بدن پر نہیں رکھ سکتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر بادشاہ مظفر شاہ حلیم واورنگ زیب اور ہر امیر ووزیر عبدالرحیم خان خاناں اور آصف خاں نہیں تھا، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسان کی عظمت وکمال کا معیار اس زمانہ میں عام طور پر بہت بلند تھا، اس کی بڑائی اور کامیابی کے لئے بہت سی ایسی صفات اور کمالات ضروری سمجھے جاتے تھے، جو بعد کے زمانہ میں خصوصاً مغرب کے مادی اقتدار کے دور میں عظمت کی شرائط سے خارج ہو گئے ہیں وہ معیار لوگوں کی نظر کے سامنے ہر وقت رہا کرتا تھا، عوام بھی اس کی توقع کرتے تھے اور اہل ہمت بھی اپنے تئیں ان کا ایسا پابند سمجھتے تھے کہ

آہستہ ان کی جد و جہد میں رواں کرتے تھے، اور کبھی اس بارہ میں اپنے کو معاف نہیں کرتے تھے۔ دنیا کی عظمت و ترقی کا بلند سے بلند معیار ان میں دین کی طرف سے روگردانی نہیں پیدا کرتا تھا، دنیاوی مشاغل کا ہجوم اور شدت انہماک، حکومت و ریاست و وزارت کی ذمہ داریاں، مذہبی فرائض بلکہ سنن و نوافل کی طرف سے کبھی ذرا بھی غفلت پیدا نہیں ہونے دیتی تھیں، عیش و عشرت کے وسائل اور دولت و تن آسانی اور راحت طلبی پیدا نہیں ہونے دیتی تھی، دوسری چیزوں اور قوموں کے اختلاط کے ساتھ اس حال میں بھی اور رہا سہا معیشت میں بھی تنزل ظاہر ہوا، اور یہ نمونے جو ہر زمانہ میں بکثرت نظر آتے تھے اب خال خال نظر آنے لگے، لیکن پھر بھی وہ معیار باقی تھا، اور یہی نمونے لوگوں کے دلوں پر اس کی حکومت تھی، لیکن اپنے اپنے دور کے عالی ہمت اور صاحب عزم افراد اس معیار پر پورا اترنے کے لئے کوشاں رہتے تھے، اور اس کے لئے اپنی راحت و لذت اور خواہشات قربان کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے کچھ پہلے اور اس کے بعد ہندوستان کے اہل وجاہت و اہل علم پر نظر ڈالئے، آپ مفتی صدر الدین خاں، نواب قطب الدین خاں، نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک، نواب کلب علی خاں والی رامپور، مدار المہام منشی جمال الدین خاں وزیر ریاست بھوپال، نواب سید صدیق حسن خاں جیسے ایسے جامع اوصاف بزرگ ملیں گے جن میں ریاست و امارت اور علم و فضل کے ساتھ زہد و درویشی کا نمونہ عابدانہ کی سرگرمی، طالب علموں کا انہماک، شوق مطالعہ اور سپاہیوں کی جستجو جمع تھی، اور یہ اس کا نتیجہ تھا کہ زندگی کا نمونہ اور معیار (آئیڈیل) بلند تھا، اور ہر زمانہ میں دل و دماغ پر آئیڈیل ہی کی حکومت ہوتی ہے۔

مغرب کے مادی و معاشی دور اقتدار و تہذیب میں انسانی زندگی کا قابل تقلید نمونہ اور مثالی تصور پست ہو گیا، صرف اچھا کھانا، اچھا پہننا، سوسائٹی میں معزز و ممتاز رہنا، اور ہر چیز میں جاہ و اعزاز حاصل کرنا آئیڈیل بن گیا، پیغمبروں کی سیرت نظروں سے اوجھل ہو گئی

دین و دنیا کی جامع اور ذہنی، علمی، روحانی و انتظامی کمالات اور کسب حلال کی صفت سے متصف ہستیوں کا ذہنی ارتقاء رک سا گیا اور شخصیتیں ذہنوں پر چھا گئیں اور خوبصورت و شاندار اور زندگی کی کامیابیوں کا نشان بن کر آنکھوں اور تصور کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئیں جو اخلاقی و ذہنی حیثیت سے سخت ناقص، اعمال و کردار کے لحاظ سے بے حد پست، علمی کمالات و حقیقی صفات سے محروم، اخلاقی سطح کے لحاظ سے مبتذل اور عامی گھٹیا درجہ کے انسان یا معاشی جانور اور روپیہ پیدا کرنے کی بے شعور دولت مشینیں تھیں۔ تن آسانی اور راحت طلبی کی اتنی غالب آگئی اور تفریحی مشاغل نے زندگی کی اتنی بڑی جگہ گھیر لی کہ عبادت، دینی فرائض کی ادائیگی اور روحانی ضروریات کی طرف توجہ کرنے کے لئے گنجائش نہیں رہی۔ اس وقت ترقی یافتہ اور مہذب طبقہ کے نظام اوقات پر نظر ڈالئے گا تو قدیم اسلامی تہذیب کے ان خاندانوں کے نظام اوقات اور بیسویں صدی عیسوی کے اس نظام اوقات میں اتنا بڑا فرق نظر آئے گا کہ ایک قوم اور ملک کے افراد نہیں معلوم ہوں گے اور درمیان میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کی مسافت اور سمندروں اور ملکوں کا فاصلہ معلوم ہوگا۔

باب ہفتم

عالم اسلام زندگی کے میدان میں

گذشتہ اسلامی قیادت کے اثرات

گذشتہ صفحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ چھٹی صدی مسیحی میں جب دنیا تیزی کے ساتھ ہلاکت کے غار کی طرف جارہی تھی اور روئے زمین پر کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے دنیا کو ایک ایسی جماعت کی قیادت عطا فرمائی جو آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت و قانون رکھتی تھی جس کا ہر قدم خدا کی بخشی ہوئی روشنی میں اٹھتا تھا، اور اجالے میں پڑتا تھا جو دنیا میں حق و انصاف کی علمبردار تھی، جو حکومت و قیادت کے منصب پر نبوت کی مستحکم اخلاقی تربیت اور دین کی مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئی تھی، جو کسی قوم کی خدمت گزار اور کسی نسل و وطن کی نمایندہ نہ تھی جس کو انسانیت کا معتدل ترین مزاج اور متوازن ترین طبیعت عطا ہوئی تھی۔

اس جماعت کے وجود نے نوع انسانی کی مجموعی ہلاکت کے راستہ میں فوری روک کا کام دیا اور بتدریج انسانیت کو صدیوں تک کے لئے ان تمام فتنوں اور خطرات سے محفوظ کر دیا جو عالم پر محیط تھے اس نے صحیح منزل کی طرف انسانوں کو ساتھ لے کر بڑھنا شروع کیا اس کے اقتدار میں انسانیت کو متوازن ترقی ہوئی اور انسان کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں نے

ہم آہنگی اور تناسب کے ساتھ نشو و نما اور ترقی حاصل کی اور ایک ایسا ماحول قائم ہوا، جس میں انسان کے لئے بسہولت اپنے کمال انسانی تک پہونچنا ممکن ہوا۔

اس جماعت کے اثر و نفوذ سے زندگی کا دھارا اور دنیا کی سمت بدل گئی، ایک وسیع پیمانہ کی خودکشی اور عالمگیر خدا فراموشی و خود فراموشی سے ہمہ گیر خدا پرستی اور خود شناسی کی طرف رُخ ہو گیا، انسانوں کا مزاج، ذہن اور قلب بدل گیا، غلط اخلاقی قدریں اور پیمانے تبدیل ہو گئے، اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دینے لگے، زندگی اور نظامِ حکومت کے لئے خالص دینی و اخلاقی تعلیمات نے میزان کا درجہ حاصل کر لیا، اس کے دورِ تمدن میں تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق و فضیلت کو بھی عروج ہوا، فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت نے بھی یکساں فروغ پایا، دینی رشتہ، اقوام کے اتحاد اور صلح و محبت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیا جس میں نہ باہم زور آزمائی تھی نہ رسہ کشی، خدا پرستی و پاکیزگی کی راہ جو جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں کانٹوں سے بھری اور سخت نقصان پہونچانے والی تھی، بے خطر شاہراہ بن گئی، جس پر پہلے روکا ٹوکا جاتا تھا، خدا کی اطاعت جو پہلے مشکل تھی اب آسان اور نافرمانی جو پہلے آسان تھی اب مشکل ہو گئی، دین کی دعوت میں، تعلیم و تلقین کی کوشش اور اخلاقی تربیت و اصلاح میں حیرت انگیز تاثیر اور طاقت پیدا ہو گئی جس نے لاکھوں نفوس کو بہیمیت کی زندگی اور اخلاق کی پستی سے اٹھا کر روحانی اور اخلاقی ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہونچا دیا، انسانی جوہر و کمالاتِ علم و ذہانت اور صلاحیت کی جولانی نے جو عرصے سے ضائع یا بے محل صرف ہو رہی تھی، صحیح رُخ اختیار کر کے دنیا کو حقیقی ترقی دی، غرض انسانیت کا قافلہ منزلِ مقصود سے قریب ہوا اور اس کا اگلا حصہ منزل پر پہونچ گیا۔

مغربی قیادت اور اس کے اثرات

لیکن قبل اس کے کہ پچھلے مسافر منزل پر پہونچیں، دفعۃً قافلہ ٹھہرا، معلوم ہوا کہ قیادت

تبدیلی ہوگئی کہ قافلہ سالار کو اس لئے قیادت سے سبکدوش ہونا پڑا کہ اس نے قافلہ کی حفاظت کا پورا سامان نہیں کیا تھا[1]، ایک اجنبی مسافر نے جس کو قافلہ میں کوئی نہیں پہچانتا تھا[2]، تلوار کے زور اور قوت کی دلیل سے زمام قیادت لے لی ہے۔

اس بے حس انسانی قافلہ کو نیا قافلہ سالار ایک ایسے راستہ کی طرف لے چلا جس میں سخت نشیب و فراز اور پیچ و خم ہیں، جس پر دن کی روشنی[3] میں رات کا اندھیرا ہے، قافلہ کے رہرو بار بار ٹھوکر کھاتے، منھ کے بل گرتے اور فریاد کرتے ہیں لیکن قافلہ سالار قوت کے نشہ اور جلد پہونچنے کی عجلت میں قافلہ کو سرپٹ لئے جارہا ہے۔

تمثیل نہیں واقعہ ہے، دنیا کی زمام قیادت مسلمانوں کے بعد مغرب کی ان قوموں نے اپنے ہاتھ میں لی جن کے پاس ابتدا سے حکمت الٰہی کا کوئی سرمایہ اور علم صحیح کا کوئی صاف سرچشمہ نہ تھا، نبوت کی روشنی وہاں درحقیقت پہونچنے ہی نہیں پائی، حضرت مسیح کی تعلیمات کی ایک شعاع جو وہاں پہونچی بھی وہ تحریف و تاویل کے اندھیروں میں گم ہوگئی، انھوں نے اس آسمانی روشنی کی خانہ پری یونان و روما کے دفتروں کی سیاہی سے کی، جاہلی یونان و روما کا پورا جاہلی ترکہ ان کی میراث میں آیا اور نسلی طور پر ان کے تمام فطری، ذہنی، اخلاقی اور مزاجی خصائص ان میں منتقل ہوئے، محسوسات پرستی، روحانیت سے بعد، تمتع و لطف اندوزی و عیش کا غلو، حریت و شخصی آزادی کا شوق یونان سے اور ضعف ایمان، جارحانہ قوم پرستی، طاقت کی تقدیس اور استعمار (شہنشاہیت) کی روح روم سے منتقل ہوئی، مسیحی تعلیمات کے بچے کھچے سرمایہ کو جو شاید اصل سے ایک دوری کی بھی نسبت نہیں رکھتا تھا، رومی بت پرستی اور سینٹ پال اور قسطنطین کی منافقت نے ڈبو دیا اور کچھ

---

[1] یعنی مسلمان قوموں کی مادی کمزوری اور اسباب قوت سے غفلت و کوتاہی کی طرف اشارہ ہے جس کی لازمی طور پر اس عالم اسباب میں سزا یہی تھی کہ ان کو دنیا کی قیادت سے دست کش ہونا پڑا۔

[2] مغربی اقوام [3] بجلی کی روشنی میں۔

باقی رہا تو علماء مذہب کی تحریف و تاویل نے کھویا، رہبانیت کے جنون نے اور چرچ کے رد عمل کو پیدا کیا، ارباب کلیسا کی عیش پرستی اور دنیاداری نے اہل مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور نفرت پیدا کی، حکومت و کلیسا کی کشاکش نے قومی مزاج میں بے چینی اور عدم توازن پیدا کیا اور دین و دنیا میں تفریق کی، مذہب و عقلیت کی خونی کشمکش اور اہل دین کے جمود و نافہمی اور ارباب کلیسا کے لرزہ خیز مظالم نے برائے نام مذہب کے خلاف نسل در نسل عداوت کا بیج بویا، نتائج کار روشن خیالوں کی جماعت بندی اور تعصب نے مذہب کا آخری تسمہ بھی کاٹ دیا اور مذہب کے سب سے فوائد سے بھی محروم کر دیا آخر کار ساری مغربی قوموں میں مادہ پرستی کا دور آیا اور سارے مغرب پر نفع اندوزی اور اس کے طبعی نتیجے کے طور پر خود فراموشی کا عالم چھا گیا، زر پرستی مذہب بن گیا، مادیت کے استغراق نے معاشی و اقتصادی وحدۃ الوجود کا فلسفہ پیدا کیا جس کا نعرہ ہے "لا الٰہ الا الخبز" اور "لا موجود الا البطن"۔

دوسری طرف زندگی کا یہ مقصد مشخص ہو گیا، تمام تر ہوس کی وجہ سے جاہلانہ قوم پرستی اور وطن پرستی زندگی کا مقصد اور قومی شعار بن گیا، قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے دوسری قوموں سے نفرت و حقارت کے جذبات ظہور پذیر ہوئے اور ایک طرف سارے مشرق کو مغرب کا تر نوالہ یا حریف کیمپ سمجھ لیا گیا، دوسری طرف اندرونی قومیت کی حد بندیوں نے سارے مغرب کو چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں تبدیل کر دیا اور ہمسایہ اور ہمسایہ کے درمیان ایک خط کھینچ دیئے جن کے باہر انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا، استعمار یا امپیریلزم نے ساری دنیا کو بردہ فروشی کی ایک منڈی (جہاں قوموں کا سودا ہوتا ہے) اور سلطنتوں کی رقابتوں نے دنیا کو بارود کی بھٹی بنا دیا جہاں ہر وقت آگ کا کھیل ہوتا اور لوہے کو تپا کر اور پیٹ کر اپنے کام کے ہتھیار بنائے جاتے ہیں۔

اخلاقی و دینی تعلیمات سے محرومی اور بے عملی کی بے ترتیبی کے ساتھ علم و صنعت تحقیق و اکتشافات کی ترقی سے قوت و اخلاق میں کوئی توازن باقی نہیں رہا، انسانوں نے

پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا اور مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا سیکھ لیا لیکن آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا بھول گئے، بے تمیز اور بے شعور عقل و علم نے بربریت اور قتل و غارتگری کا آلہ اور بہ دست کو مہیا کیا، سائنس نے بیسویں صدی کے شریر و نادان بچوں کو کھیلنے کے لئے دھار دار اور خطرناک اوزار تقسیم کیے جن سے وہ اپنے کو بھی زخمی کر رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کو بھی۔ آخر اندھے بہرے سائنس نے "ذرّاتی اور ہیدروجن بم" کی شکل میں انسان کے ہاتھ میں خودکشی کا ہتھیار دے دیا۔

ان لا دینی قوموں کے عہد اقتدار میں انسانیت اس مذہبی حاسہ سے محروم ہونے لگی جو دوسرے انسانی حواس کے ساتھ مشرق کی ہزاروں سال کی زندگی میں لازمۂ زندگی بنے ہوئے تھے۔ خدا طلبی کے عمومی ذوق کی جگہ دنیا طلبی کے بحران نے لے لی، اخلاق و روحانیت اور حقیقی انسانی صفات و کمالات میں سخت انحطاط اور تنزل ہوا، غرض لوہے اور دھات کو ہر طرح ترقی ہوئی اور آدمیت کو ہر طرح زوال ہوا۔

عالمگیر جاہلیت

اس وقت کوئی ایسی طاقت و قوم یا جماعت جو ان مغربی قوموں سے عقائد و نظریات کا اختلاف رکھتی ہو اور ان کے جاہلی فلسفہ اور مادی نظام زندگی کی مخالف ہو، عالم پر نہیں ہے ایسی قوم یا جماعت اس وقت نہ یورپ میں پائی جاتی ہے نہ افریقہ اور ایشیا میں، یورپ کے عیسائی ہوں یا ایشیا کے جاپانی یا ہندوستان کے باشندے سب اس جاہلی فلسفہ اور اس مادہ پرستانہ نظام حیات کے قائل و معتقد ہیں یا ہوتے جاتے ہیں، باقی وہ سیاسی اختلاف اور قوموں کی سیاسی کشمکش جو اس وقت مختلف فلسفوں یا جنگوں کی صورت میں نظر آرہی ہے وہ محض اس بات کی کشمکش ہے کہ اس مادہ پرستی کی منزل مقصود کی طرف لے جانے کا منصب قیادت کس کے ہاتھ میں رہے!
ایک قوم کی حیثیت تو یہی اس کی ارادہ نہیں کہ دوسری قوم ایک مدت دراز سے دنیا کی قیادت پر قابض، زندگی کے وسائل و فوائد سے متمتع اور دنیا کے بازاروں، منڈیوں اور نوآبادیوں پر قابض

ہے حالانکہ وہ قوت علم، نظام اور صلاحیت میں اس سے کسی طرح پیچھے اور کمتر نہیں رہا ہے کہ وہ خود کسی اونچی منزل کی طرف بڑھتا اور دوسری قوموں کو لے جانا چاہتی ہے، زمین میں امن و انصاف قائم کرنا چاہتی ہے اور دنیا کا رخ بے دینی اور مادیت سے دین و روحانیت کی طرف، بد اخلاقی سے اخلاق کی طرف اور نفس و شیطان پرستی سے خدا پرستی کی طرف پھیرنا چاہتی ہے تو اس غریب کو تو اس کا دعویٰ ہے نہ کبھی اس کا ارادہ تھا۔

اشتراکی روس اور سرمایہ دار مغربی ممالک کا فرق

رہا اشتراکی روس جس کا نظام بظاہر موجودہ مغربی قوموں سے جدا معلوم ہوتا ہے تو وہ بعض جاہلی مغربی تہذیب کا ایسا بچہ ہے جو بڑا ہو گیا ہے، اس میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس نے منافقت اور فریب کا نقاب اپنے چہرے سے ہٹا دیا ہے اور جس فلسفہ اور اخلاق و اجتماعی نظریات کو مغربی قوموں کے منکرین مصنفین، فلسفی اور ادیب اور پیاسی صدیوں سے لکھتے رہے ہیں اور وہ قومیں ان کو دل سے مان رہی ہیں، اس فلسفہ اور ان اصول و نظریات کو روس نے ایک مرتبہ جرأت کر کے اپنے ملک میں نافذ کر دیا ہے اور عملاً اس کو برت کر دکھا دیا ہے، اشتراکی رہنما اس رفتار پر قانع نہ تھے جس رفتار سے یورپ کی قومیں الحاد و لا مذہبیت، اباحت و بہیمیت کی آزادی اور بے حیائی، مادیت کی طرف بڑھ رہی تھیں، انھوں نے تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف قدم اٹھائے اور اس منزل پر پہنچ گئے کہ اب وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اقوام عالم کو اس منزل پر جس کے آخر میں یہ وہ پہنچ چکے ہیں۔[1]

---

[1] یہ خدا کی قدرت اور اس کی قدرت مطلقہ کا ایک تحفہ ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے چند سال بعد ہی توقعات اور اندازوں کے بالکل برخلاف روس میں انقلاب ہو گیا اور وہاں کی مسلمان آبادی کو بڑی حد تک مذہبی آزادی اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی رعایت اور اسلامی ممالک کے سفروں کی آزادی مل گئی جس کی
(ابوالحسن [illegible])

ایشیائی اور مشرقی قومیں

ایشیائی اور مشرقی قومیں اور سلطنتیں مختلف رفتار کے ساتھ تہذیب و سیاست کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں جس پر وہ مغربی قوموں کو دور سے دیکھ رہی ہیں، تہذیب، اخلاق و اجتماع کے وہی اصول و نظریات اور زندگی اور کائنات کے متعلق وہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا جا رہا ہے جو ان مغربی قوموں کا شعار بن چکا ہے، ان کے افراد کی سیرت مغربی اقوام کے افراد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے ان کو مغربی اقوام سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ وہ سیاسی و اقتصادی اور قوم پرستی کی بنا پر غیر ملکی حکومتوں کی سیادت اور ان کی بالاتری پر راضی نہیں اور اس کو گوارا نہیں کرتیں کہ مغربی قوموں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور شہنشاہیاں قائم رہیں، ان غالب قوموں کے افراد اپنی سلطنتوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کے فوائد اور ثمرات سے متمتع ہوں اور شوکت و عظمت اور عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں، ان مظلوم مشرقی قوموں کو خود اپنی سرزمین میں یہ فوائد حاصل نہ ہوں ان کو ان اصولوں ان مغربی قوموں کے فلسفۂ زندگی اور نظام سیاسی سے بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں ہے، پورے قوم پرست لٹریچر میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں ملے گا، ان مشرقی اور ایشیائی قوموں کو صرف اس سے اختلاف ہے کہ یہ نظام سیاسی ان کے ملک پر غیر ملکی چلائے وہ بے کم و کاست، بہ تفصیلات و اجزاء یا کچھ تغیر و ترمیم کے ساتھ یہی نظام اپنے ملک میں خود چلانا چاہتے ہیں گویا شطرنج کی بساط نہیں الٹنا چاہتے بلکہ صرف کھیلنے والے بدلنا چاہتے ہیں[1] پھر ان میں سے بہت سی قوموں کی خود اپنی قدیم جاہلیت ہے جس کے ساتھ ان میں سے بہت سی قوموں نے جاہلیت فرنگ بھی اختیار کر لی ہے اور اب جب بھی ان کو اقتدار حاصل ہو

---

[1] آج سے کئی سال پہلے جو پیشین گوئی کی گئی تھی وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی "يُقَلِّبُ اللّٰهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ" اللہ تعالیٰ اس صورت حال کو قائم رکھے اور بڑھائے۔

وہاں دونوں جاہلیتوں کے بہترین عناصر و اجزاء برسر کار لائیں گے۔

مسلمان جاہلیت کا حلیف

طرفہ تماشا یہ ہے کہ جاہلیت کا قدیم ترین حریف (مسلمان) بھی اس زمانہ میں دنیا کے بہت سے گوشوں میں جاہلیت کا حلیف بن گیا ہے اس کو اس نے اپنی دوستی اور وفاداری کا اطمینان دلایا ہے اور دنیا کے بعض حصوں میں اس نے ان مغربی جاہلی قوموں کے لئے رضا کارانہ خدمات انجام دی ہیں جاہلیت کی اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہو سکتی ہے کہ بعض مسلمان قومیں اور سلطنتیں اور بعض مسلمان جماعتیں ان قوموں اور سلطنتوں کو اپنا حامی و سرپرست اور حق و انصاف کا علمبردار سمجھنے لگی ہیں جو اس زمانہ میں جاہلی تحریک کی علمبردار ہیں اور جنہوں نے جاہلیت کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی ہے عام مسلمان دنیا کی قیادت کا خیال ہی چھوڑ چکے ہیں اور اسلامی تحریک کے قائم مقام ہونے کے بجائے صرف جاہلیت کے گروہ کا رکن بننے پر قانع ہیں اور اسی پر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔

افراد میں جاہلی مغربی اخلاق اس طرح سرایت کرتے جاتے ہیں جیسے درختوں کے رگ و ریشہ میں پانی اور تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے۔ اسلامی ممالک میں مغربی مادیت اپنی پوری شان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے خواہشاتِ نفس کی اتباع اور صرف دنیوی زندگی کی نہ بجھنے والی پیاس اور نہ مٹنے والی بھوک اس قوم میں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کے نزدیک آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے مغربی علوم اور تہذیب کے اثر سے آخرت کا خیال روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے اور حیاتِ دنیا کی اہمیت اور کشش بڑھتی جا رہی ہے اعزاز و فخر و جاہ کے حصول میں اور سربلندی اور سرفرازی کی کوشش میں بلند حوصلہ اور ترقی پسند مسلمان یورپ کے ترقی یافتہ لوگوں کے نقش قدم پر ہیں اصول و اخلاق پر منافع اور مصلحتوں کو ترجیح دینے کا مرض پھیل گیا ہے مادی قوموں کی تقلید میں قانون شکنی اور کھلے مظالم کا ارتکاب کیا جانے لگا ہے انسانوں کی زندگی قوت اور دولت کے سامنے سرنگوں ہو گئی

اور شاہ پرستی میں کہیں کہیں یہ موحد اور یکتا پرست امت مشرک اور غلام طینت قوموں سے زیادہ ممتاز نظر نہیں آتی۔

امید کی شعاع

یہ سب کچھ ہے مگر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی امید کی ایک شعاع نظر آتی ہے۔ دوسری قومیں آسمانی ہدایت اور پیغمبروں کی تعلیم و حکمت کے سرمایہ کو کبھی کا کھو چکی ہیں اور صدیوں پہلے ان کے صحیفوں اور ان کے سینوں میں یہ دولت ختم ہو چکی ہے۔ ماضی و حال کو مربوط رکھنے والے رشتے کے ایک تار کو زمانہ کا ہاتھ کاٹ چکا ہے۔ ان قوموں کی مذہبی اصلاح کی تاریخ بتلاتی ہے کہ ان میں دینی تجدید و احیاء کی دعوت کوئی صحیح انقلاب برپا نہیں کرسکتی اور کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتی۔ گویا ان کے اندر ذہن مردہ ہے، کوئی ایسا مرکز مذہبی اور اخلاقی زندگی کو نئی روح نہیں پھونک سکتا۔ ادھر چونکہ دولت و قوت پرستی پورے طور پر ان پر حاوی ہو چکی ہے، جاہلیت کے قلعے کے شہرے لباس پہنے پس یکے بعد دیگرے مختلف صورتوں کے مجسم پرست ہو سکتے ہیں لیکن دین کا بار ایمان کی قامت پر راست نہیں آتا۔ جو جاہلیت کے بالکل مخالف اور متوازی نظام دین و اخلاق و معاشرت و اجتماع و سیاست کو ان کا صدیوں کا بنا ہوا ذہنی سانچہ اب قبول نہیں کرتا۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کا دینی سرمایہ اور آسمانی ہدایت و حکمت کا سرچشمہ محفوظ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ کرام کی زندگی جس پر پوری امت کی تخلیق کی قوت ہے ان کے پاس موجود ہے، پھر اصحاب تجدید کا ایک غیر منقطع سلسلہ اور اصلاح و انقلاب کی دینی دعوت کا ایسا تسلسل ہے جس نے اس امت کو کسی دور میں بھی جاہلیت میں گم ہو جانے کا موقع نہیں دیا۔ جاہلیت کا خالص مادی نظام اس امت کا ذہن اب تک اس کا سانچہ توڑ کر

از سر نو بنایا جائے) پورے طور پر ہضم نہیں کر سکتا اور مسلمان جاہلیت کی مشینری میں اس طرح ضم نہیں ہو سکتا جس طرح ایک ڈھیلا ڈھالا پرزہ فٹ ہو جاتا ہے۔

دین الٰہی کا علمبردار اور دنیا کا محتسب

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں فرمایا تھا۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ لَا تُعْبَدْ۔ — اے اللہ اگر تو اس جماعت کو ہلاک کر دیگا تو پھر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔

مسلمانوں کے سارے نقائص کے باوجود یہ حقیقت اب بھی اسی طرح باقی ہے جاہلیت دنیا کے لئے جو نقشہ رکھتی ہے اور جس نقشہ پر وہ آج دنیا کو چلا رہی ہے اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے اگرچہ مسلمان خود اس کو بھولے ہوئے ہیں لیکن یہ نقشہ ابھی ضائع نہیں ہوا اور نہ کبھی ضائع ہو سکتا ہے مسلمان اپنے دین کے رہتے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دینگے وہ مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب ہوگا۔ انھیں کی خاکستر میں وہ چنگاری دبی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی دن بھڑک کر جاہلیت کے خرمن کو جلا کر خاک کر دے گی۔

علامہ اقبال مرحوم نے اس حقیقت کو نظام جاہلی کے علمبردار و صدر نشین ابلیس کی زبان سے ادا کرایا ہے سنہ ۱۹۳۶ء کی مجلس شوریٰ میں شیاطین عالم نے جمع ہو کر ان خطرات کو پیش کیا جو ابلیسی نظام کے لئے سخت تشویش اور پریشانی کا باعث ہیں اور جن کی طرف جلد متوجہ ہونے کی ضرورت ہے ایک مشیر نے جمہوریت کا نام لیا، اور اس کو "جہان نو کا تازہ فتنہ" بتلایا، دوسرے نے اشتراکیت سے سخت خطرہ ظاہر کیا اور ابلیس کو مخاطب کر کے کہا ؎

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج | کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے | جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

صدر مجلس (ابلیس) نے اپنے مشیروں کو ان فتنوں سے اطمینان دلوایا اور اپنی گہری بلکہ اندرونی واقفیت کی بنا پر ان کی اصل حقیقت بیان کی جو ان کی ظاہر بین نگاہ سے پوشیدہ رہ گئی تھی اور ان فتنوں کا توڑ بتایا جس کا اس نے پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔

آخر میں اس نے اپنے نقطۂ نظر سے اصل خطرہ کا ذکر کیا جس کے لئے اگرچہ اس نے انتظامات سوچ لئے ہیں مگر مستقبل کی خطرناکی سے اس کے جسم پر لرزہ طاری اور راتوں کی نیند حرام ہے وہ کہتا ہے ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے | جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ | کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے | مزدکیت[1] فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں | ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں | بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف | ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر | حافظ ناموس زن مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے | نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف | منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب | بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب | یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

۱؎ اشتراکیت

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

وہ اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

عالم اسلامی کا پیغام

عالم اسلام کے پاس اب بھی دنیا کے لئے نیا پیغام اور زندگی کی نئی دعوت ہے، یہ وہ پیغام ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس کے حوالہ کیا تھا۔ ایک بڑا واضح اور روشن پیغام ہے جس سے زیادہ منصفانہ، بلند و برتر اور مبارک پیغام اس پوری مدت میں دنیا نے کسی کی زبان سے نہیں سنا۔

یہ بعینہٖ وہی پیغام ہے جس کو لے کر مسلمان مدینہ طیبہ سے نکلے اور تمام دنیا میں پھیل گئے اور جس کو ایک مسلمان سفیر نے شاہ ایران کے اس سوال پر کہ تم ہمارے ملک کیسے آئے؟ مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کیا تھا: "اللہ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس کی مشیت سے لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ واحد لاشریک کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت میں اور مذاہب کے ظلم و ناانصافی سے اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کریں۔" یہ پیغام پر آج بھی ایک حرف کی ترمیم کی ضرورت نہیں، آج کی بیسویں صدی کی دنیا کے لئے بھی وہ ایسا ہی نیا اور تازہ اور شاداب جیسا

ہے جیسا چھٹی صدی عیسوی کی دنیا کے لئے تھا۔

آج بھی لوگ تراشیدہ اور ناتراشیدہ بتوں کے سامنے سربسجود ہیں آج بھی اللہ واحد کی بندگی نصیب نہ ہونا افسوسناک ہے آج بھی غیر اللہ کی عبادت و اطاعت کا بازار گرم ہے آج بھی خواہشاتِ نفس کا بت ہر سر پہ ناچ رہا ہے آج بھی احبار و رہبان (علماء و درویش) ہوں کہ سلاطین صاحب طاقت اہل دولت (زعماء و قائدین) سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر اربابِ من دون اللہ بنے ہوئے ہیں جن کے لئے ویسی ہی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں اور ان کے آستانوں پر اسی طرح سے ناصیہ فرسائی ہوتی ہے جیسے معبودانِ باطل کے سامنے ہوتی تھی۔

آج عالم انسانیت اپنی وسعت، وسائل سفر کی فراوانی، نقل و حرکت کی آسانی اور اقوام و ممالک کے قرب و اتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے اس وقت کا مادہ پرست انسان دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے فوائد و خواہشاتِ نفس اور خود پرستی کے سوا اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی، خود غرضی نے اس کو اتنی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں دو آدمی بھی زندہ رہ سکیں، تنگ نظر وطن پرستی ہر ایسے انسان کو جو اس کے وطن کے باہر پیدا ہو جانے کا قصور وار ہے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس کے ہر کمال کی تنکیر ہے اور اس کو ہر حق سے محروم کرتی ہے۔

پھر اس زندگی کی اسی وسعت کو ان اہل سیاست و حکومت نے اتنا تنگ کر دیا ہے جو زندگی، وسائل معیشت اور خوراک کے سرچشموں اور ذخیروں پر قابض ہیں وہ جس کے لئے چاہتے ہیں اس زندگی کو تنگ کر دیتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں وسیع کر دیتے ہیں بڑے بڑے وسیع شہر اور شاداب و زرخیز ملک لوگوں کے لئے بے فیض ہو گئے ہیں، قوموں کی قومیں اور پوری پوری آبادیاں طفیلی بچوں اور نابالغ یتیموں کی طرح دوسروں کی ماتحتی اور تولیت میں زندگی گزار رہی ہیں۔

انسان کا انسان پر اعتماد نہیں رہا، ہر ایک دوسرے کو بدگمانی اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنا حریف سمجھتا ہے قرآن مجید کے بلیغ اور معجزانہ الفاظ کے مطابق زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی ہے اور طبیعتیں اندر ہی اندر بھنچے لگی ہیں تمدن اور حکومت کی نئی نئی بیڑیاں اور غلامی کے طوق لوگوں پر پڑتے جاتے ہیں ہر وقت ٹیکسوں اور نئے نئے محاصل کی بھرمار ہے مصنوعی قحطوں کا خطرہ ہے بیرونی اور اندرونی جنگیں سروں پر منڈلا رہی ہیں فساد، اسٹرائکیں اور ہڑتال زندگی کا لازمہ بن گئے ہیں۔

بے شک آج بھی مذاہب کی ناانصافی سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لانے کی ضرورت ہے اس روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی ایسے مذاہب پائے جاتے ہیں جن کے عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں جو اپنے پیروؤں کو بے عقل اور بے شعور جانوروں کی طرح تابع رکھتے ہیں اور ان کو اپنے عقل و تفکر سے کام لینے کی اجازت نہیں دیتے پھر کچھ مذاہب و نظام ایسے ہیں جو مذہب کہلانے کے روادار تو نہیں لیکن اپنے تسلط و اقتدار میں اپنی غیر محدود طاقت و حکومت میں اور اپنے پیروؤں کی اندھی تقلید اور جوش عقیدت میں قدیم مذاہب سے کسی طرح کم نہیں ہیں یہ وہ سیاسی نظام اور اقتصادی نظریات ہیں جن پر آج لوگ اسی طرح سے ایمان لاتے ہیں، جیسے پہلے مذاہب و ادیان پر ایمان لاتے تھے، یہ اس عصر کی قوم پرستی، وطن پرستی، جمہوریت، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ ہے یہ نئے مذاہب اپنی نارواداری، تنگ نظری اور بے رحمی میں قدیم جاہلی ادیان و مذاہب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کسی سیاسی عقیدہ یا معاشی نظریہ سے اختلاف کی سزا آج اس سے کہیں زیادہ سخت ہے جتنی تاریخ سابق میں کسی مذہب یا عقیدہ سے اختلاف کی تھی آج جب کسی پارٹی یا اصول کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو مخالف جماعت کو زندگی کا حق بھی نہیں پا جاتا اور اس کو اپنے اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے اس زمانہ کی

دوا بڑی جنگیں کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر یا کسی مذہبی گروہ کی تحریک سے نہیں ہوئیں بلکہ محض سیاسی اغراض کے تصادم اور قومی خود غرضیوں کی بنا پر ہوئیں اسپین اسپین کی خانہ جنگیاں CIVIL WARS جن کے سامنے پچھلی صدی کی عیسوی دنیا کی مذہبی خانہ جنگی اور قرون وسطیٰ کی کلیسا اور علم وفن کی کشمکش بھی گرد ہے کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر نہ تھیں بلکہ محض ایک سیاسی اصول کے اختلاف اور اقتدار پسند گروہوں کی کشمکش تھی۔

آج بھی عالم اسلامی کا پیغام خدائے واحد کی عبادت اور اطاعت مطلق اللہ کے پیغمبروں کی رسالت بالخصوص آخری اور سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ (صلعم) کی رسالت اور آخرت کے عقیدہ پر ایمان لانے کی دعوت ہے اس دعوت کو قبول کرنے کا انعام اور صلہ یہ ہوگا کہ یہ عالم تو بہ تو تاریکیوں سے نکل کر جن میں وہ صدیوں سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے روشنی کی طرف آجائے گا۔ اپنے جیسے انسانوں کی بندگی سے وہ نجات پا کر خدائے واحد کی بندگی کی نعمت پائے گا، زندگی کے اس جیل خانہ سے نجات پا کر جس میں وہ صدیوں سے محبوس ہے زندگی کے کھلے میدان اور دنیا کی آزاد فضا میں قدم رکھے گا، اعتقادی اور سیاسی مذاہب کی جکڑ بندیوں سے رہائی پا کر وہ دین فطرت اور شریعت الٰہی کے سایۂ عدل میں جگہ پائے گا۔

اس پیغام کی ضرورت واہمیت کی اس بلندی و برتری جیسی اس زمانہ میں واضح ہوئی ہے اور جیسا آج اس کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے ویسا کبھی نہیں ہوا تھا، آج جاہلیت سربازار رسوا ہو چکی ہے اس کے چھپے ڈھکے عیب کھل گئے ہیں، لوگ زندگی سے عاجز ہیں اور اس وقت کے خداؤں سے مایوس ہیں، دنیا کی قیادت میں اصولی تبدیلی کا یہ خاص وقت ہے اس وقت تک دنیا کی قیادت میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئیں وہ اس سے زیادہ نہیں

کہ جب کشتی میں کا ملاح کشتی کھیتے کھیتے تھک جاتا ہے تو وہ کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے میں لے لیتا ہے، جب وہ ہاتھ بھی تھک جاتا ہے تو پھر پتوار بدل لیتا ہے۔ برطانیہ سے امریکہ یا امریکا سے روس کی طرف عالمگیر رہنمائی یا بین الاقوامی اثر و اقتدار کی تبدیلی کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہیں کہ ملاح نے کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیا، یہ ماخذ کی تبدیلی یا اصول جہاز رانی کی تبدیلی یا سمتِ سفر کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ صرف دائیں بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

انسانیت کی مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عالمگیر قیادت اور زندگی کی جہاز رانی ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر جنھوں نے انسانیت کے قافلہ کو غرق کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے ان امانت دار، فرض شناس، خدا ترس تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جو انسانیت کی جہاز رانی کے لئے روز ازل سے بنائے گئے ہیں، نتیجہ خیز اور کارآمد انقلاب صرف یہ ہے کہ دنیا کی رہنمائی اور انسانیت کی سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ، امریکہ، روس اور ان کی حاشیہ بردار مشرقی اور ایشائی قومیں ہیں اور جس کی زمام قیادت مُترفین اور اکابر مجرمین کے ہاتھوں میں ہے منتقل ہو کر اس امت کے ہاتھ میں آجائے جس کی قیادت انسانیت کے معمارِ اعظم رحمتِ عالم سید اولاد آدم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور جو اس دنیا کی تعمیر نو اور انسانیت کی نشأتِ ثانیہ کے لئے محکم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے اور جس کا ایمان دنیا کو اس وقت کی جاہلیت سے اسی طرح نکال سکتا ہے جس طرح اس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نکالا تھا۔

نیا ایمان

لیکن اس کارِ عظیم کے لئے عالمِ اسلام کو خود تیاری اور اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی اس کے لئے پہلی تیاری یہ ہے کہ عالمِ اسلام، اسلام پر نیا اور تازہ ایمان لائے عالمِ اسلام کو نئے دین، نئے پیغمبر، نئی شریعت اور نئی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں، اسلام آفتاب کی طرح نہ کبھی پرانا تھا نہ اب پرانا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی اور آخری نبوت ہے آپ کا دین محفوظ ہے اور آپ کی تعلیمات زندہ، لیکن عالمِ اسلام کو بلاشبہ نئے ایمان کی ضرورت ہے، نئے فتنوں، نئی طاقتوں، نئی ترغیبوں نئی دعوتوں کا مقابلہ کمزور ایمان اور مجرد رسوم و عادات سے نہیں کیا جاسکتا، کوئی بوسیدہ عمارت کسی نئے طوفان اور کسی نئے سیلاب کو برداشت نہیں کرسکتی، پھر داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی دعوت پر غیر متزلزل یقین ہو، اس میں ایک ایسے انسان کا جوش ہو جو کسی نئے عقیدہ پر نیا ایمان لایا ہے، ایک ایسے انسان کا سرور اور سرخوشی ہو جس نے کوئی نیا خزانہ پالیا ہو یا نیا ملک دریافت کیا ہو، عالمِ اسلام اگر دنیائے انسانیت میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دنیا کی موجودہ مادہ پرستی اور شک و اضطراب پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے اندر نئی ایمانی روح، تازہ یقین اور نیا جوش و خروش پیدا کرنا ہوگا۔

معنوی تیاری

عالمِ اسلامی کو اس مقدس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے معنوی تیاری اور اندرونی

تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ عالم اسلام خدا ناشناس یورپ کا مقابلہ تمدن
و تہذیب کے کھوکھلے مظاہر، مغربی زبانوں کی مہارت اور زندگی کے اس رنگ ڈھنگ کے
اختیار کرلینے سے نہیں کرسکتا جس کو قوموں کی ترقی میں کوئی دخل نہیں، وہ اپنا پیغام
اس ارزاں اور معنوی طاقت کی مدد ہی سے پہونچا سکتا ہے جس میں یورپ روز بروز دیوالیہ
ہوتا جارہا ہے، عالم اسلام اپنے حریف مقابل پر صرف اسی صورت میں غلبہ حاصل کرسکتا ہے کہ
وہ اپنے حریف سے ایمان میں فائق ہو، زندگی کی محبت اس کے دل سے نکل چکی ہو، خواہشات
نفسانی کے بندے سے آزاد ہو چکا ہو، اس کے افراد شہادت کے حریص ہوں، جنت کا شوق
ان کے دل میں چٹکیاں لیتا ہو، دنیا کا ناز و مال و متاع ان کی نگاہ میں وقعت نہ رکھتا ہو
اللہ کے راستہ کی تکلیفیں اور مصیبتیں وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوں، درحقیقت ایک
خدا ناشناس منکر آخرت کے مقابلہ میں مومن کا یہی امتیاز ہے اور اسی بنا پر اس سے
یہ توقع کی گئی ہے کہ اس میں برداشت کی طاقت زیادہ ہوگی، قرآن مجید میں ہے :-

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ
تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ
كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ
مَا لَا يَرْجُونَ۔
(النساء-١٠٤)

اور مخالف قوم کے تعاقب میں سست
نہ ہو، اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو ان کو
بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تم کو پہونچتا ہے
اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں
کی امید رکھتے ہو جن کی وہ امید نہیں رکھتے۔

واقعہ یہ ہے کہ مومن کی طاقت اور اس کی فتح و غلبہ کا راز یہ ہے کہ اس کو آخرت کا
یقین اور اللہ کے اجر و ثواب کی امید ہوتی ہے، اگر عالم اسلامی کے سامنے بھی تمام تر یہی
دنیاوی مقاصد اور مادی منافع ہیں اور وہ بھی محض محسوسات و مادیات کے طلسم میں

گرفتار ہے تو یورپ کو اپنی مادّی طاقت صدیوں کی تیاری اور وسیع ساز وسامان کی بنا پر غلبہ اور اقتدار کا زیادہ حق ہے۔

عالمِ اسلام پر ایک طویل دور ایسا گزرا ہے کہ اس کو معنوی طاقت کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا، اور نہ اس کو اس کی حفاظت کی فکر تھی، نہ وہ اس کو غذا پہونچانے کی طرف متوجہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سوتے خشک ہوتے چلے گئے، اور تیزی سے اس میں انحطاط واقع ہوا، اسی عرصہ میں عالمِ اسلامی کو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں ایسے معرکے پیش آئے جن میں اس کو ایمان ویقین، صبر وتحمل اور ثبات واستقامت کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی اور جو ان صفات کے بغیر جیتے نہیں جا سکتے تھے، جب اسلامی طاقتوں کو دھکا لگا اور انھوں نے اس معنوی طاقت کا سہارا لینا چاہا جس کی جگہ مسلمانوں کے دل تھے تو ان کو اچانک معلوم ہوا کہ یہ طاقت عرصہ ہوا گم ہو چکی ہے اور دل کی انگیٹھیاں سرد ہو چکی ہیں، اس وقت عالمِ اسلامی کو محسوس ہوا کہ اس نے اس روحانی طاقت کی ناقدری کر کے اور اس سے غفلت برت کر اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے، اس وقت اس نے اپنے ذخیرہ کا جائزہ لیا تو اس کو کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو اس خلا کو پُر کر سکے اور اس نقصان کی تلافی کر سکے۔

اسی عرصہ میں عالمِ اسلامی کو ایسے معرکے بھی پیش آئے جن میں اسلام کی عزت وحمیت کا سوال تھا، اس کو خیال تھا کہ تمام عالم کے مسلمانوں میں قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ اسلام کی طرف سے مدافعت، مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور دینی جوش وحمیت میں از خود رفتہ ہو جائیں گے اور تمام اسلامی ممالک میں آگ سی لگ جائے گی، لیکن عالمِ اسلام پر ان واقعات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، زندگی کے کام بدستور ہوتے رہے گویا کہیں کچھ

کچھ آواز بلند ہوئی اور خاموش ہوگئی، اور پھر دنیا اپنے کام میں لگ گئی، اس وقت عالم اسلام کے مفکرین اور اہل نظر کو معلوم ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی احساس کمزور پڑ چکا ہے اور ایمان کا شعلہ اگر پورے طور پر بجھا نہیں تو بہت دب گیا ہے اس وقت دوسروں کو بھی عالم اسلام کی یہ کمزوری معلوم ہوئی اور اندرونی انحطاط اور اضمحلال کا احساس ہوا، اور اس کا وہ رعب جاتا رہا جو اس کی مجاہدانہ تاریخ پڑھ کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔

آج عالم اسلامی کے قائدین و مفکرین اور اس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش کریں، جذبۂ دینی کو پھر متحرک کریں، اور پہلی اسلامی دعوت کے اصول و طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ و رسول اور آخرت کے عقیدہ کی پوری طاقت کے ساتھ دوبارہ تبلیغ و تلقین کریں، اس کے لئے وہ سب طریقے استعمال کریں، جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کئے تھے نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصر جدید نے پیدا کردی ہیں۔

قرآن مجید اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالم اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے، ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے اور ان کی تاثیر سے ایک ٹھٹھری ہوئی قوم ایک پرجوش بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے، ان کے اثر سے (اگر ان کو اثر کرنے کا موقع دیا جائے) پھر ایک بار ایمان اور نفاق، یقین اور شک، وقتی فوائد اور مستحکم عقائد، موقع پرست ذہنیت

اور حق پرست ضمیر، عقل مصلحت بیں اور عشق مصلحت سوز کے درمیان پھر معرکۂ کارزار گرم ہوتا ہے پھر جسمانی راحت اور قلب کے سکون، تن آسانی کی زندگی اور شہادت کی موت کے درمیان کشمکش پیدا ہوتی ہے، وہ مبارک کشمکش جو ہر ضمیر نے اپنے اپنے وقت میں پیدا کی تھی، اور جس کے بغیر حق و باطل کا فیصلہ اور اس دنیا کی اصلاح و انقلاب کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس وقت عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ اور دیار و بلاد کے ایک ایک گھر اور ایک ایک خاندان میں ایسے صاحب ایمان نوجوان پیدا ہوں گے جن کی تعریف قرآن مجید میں اس طرح کی گئی ہے:۔

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَٰهًا لَّقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا (الکہف ۱۳۔۱۴)	وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی، اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے جب کہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی ہی بیجا بات کہی۔

اس وقت پھر دنیا میں ایک بار بلال و عمار، خباب و خبیب، صہیب و مصعب بن عمیر، عثمان بن مظعون اور انس بن النضر کے جوش ایمانی اور ایثار و قربانی کے نمونے نگاہوں کے سامنے آئیں گے، جنت کی ہوائیں اور قرن اول کے ایمانی جھونکے دوبارہ چلیں

اور ایک نیا عالم اسلام ظہور میں آئے گا جس سے موجودہ عالم اسلام کو کوئی نسبت نہیں۔

موجودہ عالم اسلام کی بیماری پریشانی اور بے اطمینانی نہیں ہے بلکہ حد سے بڑھا ہوا اطمینان و سکون، دنیا کی زندگی پر قناعت اور حالات سے مصالحت ہے۔ آج دنیا کا عالمگیر فساد اور انسانیت کا زوال اور ماحول کی خرابی اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتی۔ اس کو زندگی کے اس نقشہ میں کوئی چیز غلط اور بے محل نظر نہیں آتی۔ اس کی نظر اپنے ذاتی مسائل اور مادی فوائد سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی موجودہ افسردگی اور پژمردگی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کا پہلو خلش سے اور اس کا دل تپش سے خالی ہے۔

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا

ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

اس لئے ضرورت ہے کہ یہ مبارک خلش پھر پیدا کی جائے اور اس امت کا سکون برہم کیا جائے۔ اس کو اپنی ذات اور اپنے مسائل کی فکر کے بجائے دعوت جاہلی قوموں کا شعار ہے، انسانیت کا درد و غم، ہدایت و رحمت کی فکر اور آخرت اور محاسبۂ الٰہی کا خطرہ پیدا ہو۔ اس امت کی خیر خواہی اس میں نہیں ہے کہ اس کے لئے سکون و اطمینان کی دعا کی جائے بلکہ اس میں ہے کہ اس کے لئے درد و اضطراب کی دعا کی جائے اور یہ کہا جائے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

شعور کی تربیت

کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو،

ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتیں رکھتی ہو اور دینی و دنیاوی دونوں سے مالا مال ہو
لیکن اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو، وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو، پچھلے تجربوں سے
فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو، اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی
اور تو مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو، وہ خود غرض رہنماؤں کی چرب زبانی
و شیریں کلامی سے مسحور ہو جاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکہ کھانے کے لئے تیار رہتی ہو، وہ قوم
اپنی تمام دینی ترقیات اور دنیاوی سرفرازیوں کے ساتھ قابل اعتماد نہیں، وہ ہمیشہ در اصل
خود غرض رہنماؤں اور منافق قائدین کا کھلونا بن جاتی ہے، ان کو قوم کی سادہ لوحی اور
بے شعوری کی بنا پر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان کو اس کا اطمینان ہوتا
ہے کہ کبھی ان کا محاسبہ اور ان سے بازپرس نہیں کی جائے گی۔

مسلم ممالک کے متعلق اگر ہم یہ کہنے سے احتیاط کریں کہ وہ بیداری اور شعور سے
بالکل محروم ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کا شعور بہت کمزور ہے اور وہ بیداری کی ابتدائی
منزل میں ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خیر خواہ اور بدخواہ کے ساتھ ان کا معاملہ
تقریباً یکساں ہے بلکہ بعض اوقات بدخواہ اور غیر مخلص اشخاص دوستوں سے زیادہ ہمدرد و عزیز
اور معتمد بن جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مومن سانپ کے ایک سوراخ سے
دو بار نہیں ڈسا جاتا، لیکن مسلمان ممالک کے باشندے ہزار ہزار بار ڈسے جانے کے لئے تیار
رہتے ہیں، ان کا حافظہ نہایت کمزور ہے، وہ اپنے قائدین اور رہنماؤں کے ماضی کو اور ماضی قریب
کے واقعات کو فوراً بھول جاتے ہیں، ان کا دینی اور شہری شعور کمزور اور سیاسی شعور تقریباً
نابید ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غالب قوموں اور خود غرض رہنماؤں کا بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں،
اور آسانی کے ساتھ ان کا رخ ہر طرف موڑا جا سکتا ہے، حکومتیں ان کی مرضی کے خلاف فیصلے

کر لیتی ہیں اور جس طرف چاہتی ہیں ایک لاٹھی سے ہانک لے جاتی ہیں۔

مغربی قومیں اپنے روحانی اور اخلاقی افلاس اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جن کی تشریح ہم نے اس کتاب میں کی ہے شہری اور سیاسی شعور کی مالک ہیں وہ سیاسی بلوغ کو پہنچ چکی ہیں وہ اپنے نفع و نقصان کو پہچانتی ہیں وہ مخلص و منافق اہل و نااہل کے فرق کو جانتی ہیں وہ اپنی قیادت ایسوں کے سپرد نہیں کرتیں جو نااہل ضعیف اور خائن ہیں وہ جب اپنے معاملات کسی کے سپرد کرتی ہیں تو ڈرتے ہوئے اور احتیاط کے ساتھ اور جس مرحلہ پر بھی ان کی نااہلی یا خیانت کا اظہار ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھتی ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر چکے اور ان کا کام ختم ہو گیا تو ان کو وہ اپنے منصب سے سبکدوش کر دیتی ہیں اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتی ہیں جو ان سے زیادہ اہلیت کے مالک اور موقع کے مناسب ہوتے ہیں اس موقع پر کسی رہنما یا سربراہ کی سابقہ خدمات شاندار ماضی اور کسی معرکہ میں نمایاں کامیابی اس قومی فیصلہ میں حائل نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں سیاسی پیشہ وروں اور نااہل اور خائن رہنماؤں سے محفوظ ہیں ان کے سیاسی رہنما اور ان کے نمائندے بھی محتاط اور امانت داری پر مجبور ہیں وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں قوم کی سرزنش عوام کے عتاب و احتساب اور پریس کی قہرناکی سے وہ لرزہ براندام رہتے ہیں۔

عالم اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور ان کی عقلی و ذہنی اور سیاسی تربیت کی جائے یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن شعور پیدا کرنے کے لئے ہر جگہ مستقل

جد و جہد کی ضرورت ہے۔ مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاح کا کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس قوم میں خودی کی کمی ہے وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں، خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور سرگرمی دکھائے اور ان کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے اس لئے کہ جب تک اس کا شعور بیدار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلۂ کار بن جائے گی اور آن کی آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا، جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا اور جس میں خود سوچنے اور اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر میدان میں پڑا ہو اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو ادھر سے ادھر اڑائے پھرتی ہوں۔

اسلام اگرچہ ایک آسمانی مذہب ہے اور اس کی بنیاد وحی و نبوت پر ہے لیکن اس نے بھی اپنے پیروؤں میں ایک خاص شعور پیدا کیا جو شعور کی تمام اقسام میں زیادہ مکمل، زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ گہرا ہے، اس نے اپنے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کا طریق فکر پیدا کیا جو جاہلی طریق فکر سے بالکل مختلف ہے، اس نے اپنے ماننے والوں کو ایک بیدار اور خود دار شعور عطا کیا جو اپنی وسعت اور قدرتی لچک کے باوجود ان افکار و نظریات کو انگیز نہیں کر سکتا جو اس کے مسلمات سے جوڑ نہ کھاتے ہوں اور نہ ان عناصر اجزا کو ہضم کرنے کے لئے تیار ہے جو اس کی روح اور اس کے اصول سے تضاد رکھتے ہوں۔

اس اسلامی شعور کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و صحبت سے صحابہ کرام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ ظلم ایک قبیح شئے اور دینی و اخلاقی جرم ہے جو کسی کے لئے جائز نہیں وہ اس پر ایمان

دیکھتے تھے کہ مسلمان کو ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے خواہ وہ قریب ہو یا بعید دوست ہو یا دشمن اپنا ہو یا بیگانہ انھوں نے جاہلانہ حمیت اور قومی قبائلی اور خاندانی تعصبات سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ اسلام میں اس اندھے تعصب کی کوئی جگہ نہیں مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے خواہ حق کسی طرف ہو یہ ان کا عقیدہ بن گیا تھا اور ان کے خمیر میں داخل ہو گیا تھا۔

ایک دن اچانک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ سنتے ہیں کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم" اگر ان کی تربیت میں ذرا بھی خامی اور ان کے ذہن میں کچھ بھی انتشار ہوتا تو وہ خاموشی کے ساتھ اس بات کو سن لیتے اور اس قول کو اس کے جاہلی مفہوم میں قبول کر لیتے جس کے مطابق ان کا نشو ونما ہوا تھا اور ساری عمر اسی پر عمل کرنے میں گزری تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (دین کی) کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ سراسر وحی ہوتی ہے ان سے بڑھ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ادب کرنے والا اور آپ کی تمام باتوں کو بے چون وچرا تسلیم کرنے والا نہیں تھا لیکن اس پر بھی وہ خاموش نہ رہ سکے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے عقیدہ اور اس فکر و فہم سے ٹکرایا جو آپ ہی کی تعلیمات و تربیت کا نتیجہ تھا اس سے ان کے اسلامی شعور پر ایک ضرب لگی اور ان کے دماغ کی چولیں ہل گئیں وہ اپنی اس تکلیف کو چھپا نہ سکے اور انھوں نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ ہم مظلوم کی تو مدد کریں لیکن ظالم کی کیسے مدد کریں؟ اس پر آنحضرت (صلعم) نے اپنے قول کی تشریح فرمائی کہ ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور اس کو ظلم سے باز رکھا جائے یہ سنتے ہی گرہ کھل گئی اور ان کے اسلامی ذہن نے اس ارشاد کو اس طرح قبول کیا جیسے ایک جانی بوجھی

حقیقت ہوتی ہے، یہ اسلامی شعور کی نزاکت اور اسلامی ذکاوت جس کی واضح مثال ہے
ایک دوسری مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی اور ایک
صحابی کو اس کا امیر بنایا اور ان کو امیر کی اطاعت کی تاکید فرمائی۔ وہاں یہ واقعہ پیش آیا
کہ امیر اس سفر میں کسی بات پر ناراض ہو گئے جس کی وجہ سے انھوں نے آگ جلوائی اور
اپنے ماتحتوں کو اس میں داخل ہونے کا حکم فرمایا۔ انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے تو
نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع آگ سے نجات حاصل کرنے ہی کے لیے کیا تھا کیا اب
اسی میں داخل ہو جائیں؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کی تصویب کی
اور فرمایا کہ اگر وہ آگ میں کود پڑتے تو کبھی نہ نکلتے۔ صحابہ کرام کا یہ انکار اسی بنا پر تھا کہ
وہ اس اصول پر ایمان لا چکے تھے کہ خالق کی نافرمانی کے ساتھ کسی مخلوق کی فرمانبرداری
صحیح نہیں۔¹ اور یہ کہ اطاعت اسی وقت فرض ہے جب نیک بات کا حکم دیا جائے۔
اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کی وجہ سے صحابہ کرام کسی غلط کام اور کسی
ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے خواہ اس کا صدور خلیفہ وقت ہی سے کیوں نہ ہوتا
اگر خلیفہ کی کوئی زیادتی دیکھتے تو بر سر منبر اس کو ٹوک دینے میں ان کو تامل نہ ہوتا۔ حضرت عمرؓ
خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں ان کے جسم پر پورا جوڑا ہے جو دو چادروں پر مشتمل ہوتا ہے
اور فرماتے ہیں لوگو! سنتے نہیں؟ مسلمان کہتے ہیں ہم نہیں سنتے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کیوں؟ وہ
کہتے ہیں کہ تم نے ہم کو تو ایک ایک کپڑا تقسیم کیا اور تم پورے جوڑے میں ملبوس ہو۔ وہ فرماتے ہیں
عجلت مت کرو پھر اپنے صاحبزادے عبداللہ کو آواز دیتے ہیں پہلی آواز پر کوئی جواب نہیں ملتا پھر فرماتے
ہیں کہ اے عمر کے بیٹے عبداللہ! عبداللہ ابن عمرؓ جواب دیتے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ میں تم کو قسم دیکر

---

¹ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ (حدیث شریف)

تحیت باندھ رکھی ہے یہ تمہارا ہی کپڑا ہے؟ وہ اس وقت میں جواب لینے میں اس پر مشغول بات

کہتے ہیں — ہاں امیرالمومنین آپ فرمائیے ہم سب سنیں گے۔

اس اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کا نتیجہ تھا کہ بنی امیہ کو اپنا شاہی اقتدار قائم رکھنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں، اسلامی روح نے بار بار اس اقتدار کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بار بار اس طرزِ شاہی کے خلاف علمِ جہاد بلند ہوا، اموی فرمانرواؤں کو اس وقت تک سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوا جب تک وہ نسل ختم نہیں ہو گئی جس نے اسلامی اصولوں پر تربیت پائی تھی اور جو خلافتِ اسلامی اور اسلام کے نظامِ حکومت اور طرزِ حکمرانی سے عشق رکھتی تھی اور اس سے انحراف کو بدعت اور تحریف کا مرادف سمجھتی تھی۔

یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی طرح کی اصلاح اور کوئی معاشرتی یا سیاسی انقلاب شعور کی بیداری اور ذہنوں کی تیاری کے بغیر وقوع میں نہیں آتا، اگرچہ انقلابِ فرانس کا تذکرہ اسلامی دعوت و انقلاب کے تذکرہ کے سلسلہ میں کچھ زیادہ موزوں نہیں، اور وہ ایک قطعاً محدود قسم کا انقلاب تھا جو جذباتی جوش اور بے اعتدالیوں سے پاک نہیں تھا، تاہم اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جب کسی معاشرہ یا ملک کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اور ذہنوں کا رُخ کسی خاص طرف ہو جاتا ہے تو اس سیلاب کا تھامنا بڑی سے بڑی چٹان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے رہنماؤں نے جن میں سے بہت سے لوگ بڑی اچھی ذہنی، علمی اور ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے اور جن کے جلو میں ادیبوں، افسانہ نگاروں اور اہلِ قلم کا ایک لشکر تھا، انھوں نے ایک خاص مقصد کے لئے فرانسیسی عوام کے شعور کی تربیت کی، عوام کے دل میں ملک کے فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا، پرانی اخلاقی قدروں اور تصورات و روایات کے خلاف ایک عام بے اطمینانی اور بیزاری پیدا کر دی اور ماحول اور خارجی دنیا

پہلے دلوں کے اندر انھوں نے غم و غصہ اور نفرت و حقارت کی ایک آگ روشن کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کا سیاسی معاشی اور معاشرتی نظام لوگوں کے لئے ناقابل برداشت بن گیا حریت اخوت و مساوات کے کلمات محبوب اور مقدس بن گئے اور یہ فرانسیسی کا وظیفہ اور تکیہ کلام بن گیا اس وقت یہ بغاوت ابھری جوش و غضب کا وہ آتش فشاں پھٹا اور پرانے معاشرہ کا قصر زمین پر آ رہا۔ اگرچہ اس انقلاب کے رہنما اس کو انسانیت کے لئے زیادہ مفید بنا سکے (اور شاید ان کے پیش نظر یہ تھا بھی نہیں) لیکن انھوں نے ملک میں انقلاب کر دیا اور اس انقلاب کو کوئی طاقت روک نہ سکی اس لئے کہ اس انقلاب کا چشمہ لوگوں کے دل و دماغ کے اندر سے ابلا تھا اور اس کی پشت پر قوم کی رائے عامہ اور جمہور کی خواہش تھی اور شعور اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

آج جس چیز نے یورپ کو تباہی سے پکڑ رکھا ہے اور ان کمزوریوں کے ساتھ جن کے ساتھ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی وہ صرف زندہ ہی نہیں بلکہ برسر اقتدار ہے وہ شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس اور سیاسی شعور ہے ابھی تک انگریزوں اور امریکیوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں شاذ و نادر ہیں جو قومی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوں یا اپنے ملک کو سستے داموں فروخت کر ڈالتے ہوں یا جو حکومت کے اسرار فاش کر دیتے ہوں یا خراب ناکارہ اسلحہ اور ذخیرہ جنگ کی خریداری کے مجرم ہوں ایسی مثالیں مشرقی ممالک اور یورپ میں بہت کمیاب اور تقریباً نایاب ہیں یورپ کا اخلاقی بگاڑ انفرادی دائروں میں محدود ہے اس کے ذمہ دار جنگ میں بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں قوموں کو دھوکا دے سکتے ہیں اور بڑی بڑی قوموں کو پامال کر سکتے ہیں مگر یہ اپنے ذاتی فوائد اور اغراض کے لئے نہیں بلکہ قومی و ملکی مصالح کے لئے یقیناً اسلام میں ان مجرمانہ افعال کی گنجائش نہیں اور بداخلاقی خواہ فرد کے ساتھ ہو یا جماعت کے ساتھ خواہ انفرادی محرکات کی بنا پر یا اجتماعی محرکات و قومی محرکات کی بنا پر بداخلاقی ہی ہے لیکن

مغرب جو کچھ کرتا ہے ایک شعور اور اپنے مخصوص فلسفۂ اخلاق کے تحت، مشرق جو کرتا ہے بے شعوری اور شخصی اغراض و محرکات کے ماتحت۔

مسلمان ممالک کے نمائندوں اور اہل اقتدار سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کبھی اپنے کسی حقیر فائدہ یا لذت و خواہش کے ماتحت اپنے ملک کو رہن رکھ دیں یا اس کا بیعنامہ کر دیں یا اپنی قوم کو بھیڑ بکری کی طرح فروخت کر دیں یا اپنی قوم کو کسی ایسی جنگ میں جھونک دیں جو اس کی مرضی و مصلحت کے خلاف ہو، اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قوم اس کے باوجود بھی ان کی قیادت کا جھنڈا لے کر چلتی ہے، وہ ان کی زندگی کے نعرے لگاتی ہے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے، یہ صورت حال اس کے سوا اور کس بات کی دلیل ہے کہ قوم کا ضمیر مردہ، اس کے قوائے فکریہ معطل اور وہ شعور کی دولت سے محروم ہے۔

بہت سے مسلمان ملک ایسے ہیں جہاں عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے، جہاں عوام صرف محنت و مشقت کے لئے اور خواص صرف عیش و عشرت کے لئے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانیاں ہوتی ہیں اور انسانیت سوز افعال و جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے شریعت کے احکام پامال کئے جاتے ہیں لیکن نہ عوام اور جمہور مسلمین میں اس سے غم و غصہ کی کوئی لہر پیدا ہوتی ہے نہ کسی قلب کو اس سے اذیت پہنچتی ہے، یہ سب درحقیقت انسانی غیرت اور اسلامی خودداری کے فقدان کا نتیجہ ہے اور نہایت خطرناک صورت حال ہے۔

کسی انقلاب اور کسی بغاوت کی کوئی قیمت نہیں (خواہ ظاہری طور پر وہ ملک و قوم کے لئے کتنی ہی مفید ہو) جب تک کہ اس کی بنیادوں کوئی پختہ عقیدہ، فکر صحیح، اور تربیت یافتہ اور بیدار شعور نہ ہو، جب تک کہ رائے عامہ پورے طور پر تیار نہ ہو اس وقت تک کسی بادشاہ کی جلاوطنی، کوئی انقلاب حکومت اور وزارت کی کوئی تبدیلی کوئی اہمیت

نہیں رکھتی اور نہ شکل و نوعیت قابل اعتبار نہیں ہے، اگر قوم غلط افعال اور اس رویہ سے نفرت
نہیں ہے تو ایک غلط شخص یا غلط جماعت کی جگہ پر دوسرا غلط شخص اور دوسری غلط جماعت
آ سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ قوم کو اس کا احساس بھی نہ ہونے پائے اس لئے اصل
قابل اعتبار چیز یہ ہے کہ قوم کی ضمیر اور شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غلط چیز اور مجرمانہ
فعل کو کسی حالت میں اور کسی شخص کے لئے بھی برداشت نہ کر سکے۔

اس لئے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے
ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کر سکے، نہ دین و اخلاق سے انحرافات کو،
جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن، مصلح اور مفسد کے درمیان آسانی
سے تمیز کر سکے، مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے بچ نہ سکیں، مخلص اس کے احترامات
اور قدر شناسی سے محروم نہ رہیں، وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل و معاملات
میں ایک عاقل و بالغ انسان کی طرح غور کر سکے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو
جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو کسی اسلامی ملک و قوم کا جوش عمل، صلاحیت کار، دینی جذبات
اور مذہبی زندگی کے مظاہر و مناظر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

خود غرضی اور نفس پرستی کی گنجائش نہیں

الف لیلہ کی کتاب اس دور کی نمائندگی کرتی ہے جس میں زندگی صرف ایک فرد اور
ایک شخص کے گرد گھومتی نظر آتی ہے جس کو خلیفہ یا بادشاہ کہتے تھے، یا چند افراد کے ایک مختصر
مجموعہ کے اردگرد جو وزراء اور شہزادے کہلاتے تھے، زمین اس خوش نصیب فرد کی ذاتی
ملکیت تصور کی جاتی اور قوم غلاموں اور زر خریدوں کی ایک ٹولی ہوتی تھی اور یہ شخص اپنی

مال و متاع جائداد و املاک اور عزت و آبرو کا مالک سمجھا جاتا اور پوری قوم دراصل اس ایک فرد کا سایہ تھی، پوری زندگی اپنی تاریخ، علوم، ادبیات، شعر و شاعری کے ساتھ اسی کے گرد چکر کاٹتی اور اسی کا طواف کرتی تھی، اگر کوئی شخص اس عہد پر نظر ڈالتا اور اس دور کے ادب و لٹریچر کا جائزہ لیتا تو وہ دیکھتا کہ وہ شخصیت اس زمانہ کی سوسائٹی پر اس طرح حکمراں اور مسلط ہے جس طرح ایک قوی ہیکل درخت اپنے نیچے اُگنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں اور گھاس پھوس پر اپنے بازو پھیلائے رہتا ہے اور ہوا اور سورج کی گرمی روکتا رہتا ہے، بالکل اسی طرح پوری قوم اس ایک فرد کی شخصیت میں جذب ہوجاتی، پھر نہ اس کی کوئی مستقل شخصیت تھی نہ ارادہ نہ آزادی اور نہ احساس خودداری۔

یہ فرد وہ ہوتا جس کے لئے زندگی کا پہیہ گھومتا تھا، اسی کے لئے کسان ہل چلاتا اسی کے لئے تاجر محنت کرتا، اسی کے لئے کاریگر و صناع اپنا جوہر دکھاتے، اسی کی خاطر مصنفین کتابیں لکھتے اور شاعر اپنی قوتِ گویائی کا مظاہرہ کرتے، اسی کے لئے لڑکے پیدا ہوتے اور اسی راستہ میں لشکر حملہ کرتے، بلکہ اسی کی خاطر زمین اپنے خزانے اگلتی اور سمندر اپنی نعمتیں پھینکتا، اور عوام جو درحقیقت اس سب دولت ثروت اور زرخیزی و شادابی کے باعث ہوتے اور ان سب کا دار و مدار انھیں پر ہوتا، وہ غلاموں کی طرح دن کاٹتے، بادشاہ کے خوانِ نعمت سے جو کچھ بچ رہتا ہے، وہ اسی پر خوش ہوتے اور شاہی افراد سے کچھ مل جاتا تو اس پر شکر ادا کرتے اور اگر اس سے بھی محروم رہتے تو صبر و توکل اختیار کرتے، ان کی انسانیت مرجاتی تو ان کو افسوس نہ ہوتا اور وہ چاپلوسی اور موقع پرستی کا راستہ اختیار کرلیتے۔

یہ وہ عہد تاریخ ہے جو مشرق میں خوب پھلا پھولا اور اس نے سوسائٹی پر اثرات

چھوڑے، ادبیات، شاعری، تمدن واجتماع سب پر اثر انداز ہوا، عربی کتب تمام پر اس کے گہرے اثرات پڑے، انھیں اثرات کا ایک جیتا جاگتا مرقع الف لیلیٰ کی کتاب ہے جو اس عہد کی تصویر کشی کرتی ہے جب بغداد کا کوئی خلیفہ یا دمشق اور قاہرہ کا کوئی بادشاہ سب کچھ ہوتا تھا، اس کی حیثیت افسانۂ زندگی کے ہیرو اور مرکزی نقطہ کی ہوتی تھی۔

یہ عہد جس کا نقشہ الف لیلیٰ کے قصوں اور کہانیوں میں کھینچا گیا ہے اور ایرانی کی تاریخ وادب میں جس کی تصویر لی گئی ہے، وہ غیر اسلامی عہد تھا، عقل اور منطق کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا، اس کو اسلام بھی ناقابل قبول قرار دیتا ہے اور عقل بھی اس کا انکار کرتی ہے، اسلام اس غیر فطری عہد کے زوال کا پیغام تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا، اس پر نفرین کی، اس کے علمبرداروں اور فرمانرواؤں، کسریٰ و قیصر کے خاتمہ کی خبر دی۔

یہ عہد کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی حصہ میں بھی زندگی کی صلاحیت اور باقی رہنے کا استحقاق نہیں رکھتا، یہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب لوگ حالات سے بے بس اور مجبور ہوگئے ہوں یا بیداری اور شعور کی دولت سے محروم ہوچکے ہوں، اور ان کی زندگی دم توڑ چکی ہو۔

اس صورت حال کو عقل برداشت نہیں کر سکتی، کون شخص اس کو پسند کرے گا کہ چند افراد کو کھانے پینے کی زیادتی کی وجہ سے تخمہ ہو جائے اور دوسری طرف ہزاروں آدمی بھوک اور فاقہ کشی سے جان توڑ رہے ہوں، کس کو یہ اچھا لگے گا کہ ایک بادشاہ اس کے بیٹے مال و دولت کے ساتھ مجنونوں کی طرح کھیلیں اور لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے ایک وقت کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے ایک کپڑا نصیب نہ ہوا اس پر کون راضی

ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ جو اکثریت میں ہو اس کا کام تو صرف یہ ہو کہ پیدا وار بڑھائے زمین سے غلہ پیدا کرے صبح سے شام تک بیل کی طرح جتا رہے اور ایک طبقہ جو انگلیوں پہ گنا جاتا ہو اس کا کام یہ ہو کہ ان کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ کھائے اور ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور یہ سب شکر و احسان مندی کے ایک کلمہ کے بغیر اور احساس و شعور سے بالکل خالی ہو کر، یہ کون گوارا کر سکتا ہے کہ اہل صنعت و حرفت، اہل عقل و خرد، ارباب کمال اور مختلف صلاحیتیں اور ذہنی طاقتیں رکھنے والے لوگ ہمیشہ تکلیف ہی اٹھاتے رہیں اور وہ لوگ عیش کریں اور رنگ رلیاں منائیں جن کو اسراف وفضول خرچی کے سوا کچھ نہیں آتا جو فسق و فجور میں ڈوبے رہتے اور شراب پینے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتے یہ کس کی نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ اہلیت رکھنے والے ارباب دانش، امین و دیانت دار، عالی دماغ اور دقیق النظر لوگوں سے اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جائے اور بادشاہ اور امراء و رؤساء کے ارد گرد خبیث النفس، دنی الطبع بے دماغ، اور ضمیر فروشوں کی ایک ٹولی ہو جن کی سب سے بڑی فکر حصول دولت اور نفسانی خواہشات کی تسکین ہو، جنھوں نے اس دنیا میں چاپلوسی اور خوشامد اور بے گناہوں کے خلاف سازش کے علاوہ کوئی فن نہ سیکھا ہو اور جن کی آنکھوں کا پانی مر چکا ہو اور ان کا شعور و احساس فنا ہو گیا ہو۔

یہ ایک غیر طبعی حالت ہے جس کو ایک دن بھی باقی نہ رہنا چاہیے نہ کہ برسوں تک، اگر تاریخ کے کسی دور میں یہ صورت حال پیدا ہوئی اور عرصہ دراز تک قائم رہی تو یہ قوم کی غفلت و لاپرواہی کا نتیجہ تھی، یا اس کی مرضی اور رغبت کے خلاف زبردستی اس کے سر تھوپ دی گئی اور اسلام کے ضعف اور جاہلیت کی قوت کی وجہ سے ایسا ہوا

لیکن جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا شعور پیدا ہوا اور قوم میں حقِ عاب اور جائزہ کی شان پیدا ہو گئی تو یہ ساری عمارت فوراً منہدم ہو گئی۔

آج جو لوگ الف لیلہ کی دنیا میں بستے ہیں وہ خواب کی دنیا میں رہتے ہیں وہ ایسے گھر میں بسیرا ڈالے ہوئے ہیں جو مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہے وہ ایسے گھر میں زندگی گزار رہے ہیں جو ہر وقت خطرات سے گھرا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس پر کب کڑیاں چڑچڑانے لگیں اور کب چھت ٹوٹ کر گر پڑے۔

الف لیلہ کا زمانہ گیا اور اس کی بساط الٹ چکی عالمِ اسلام کو اپنے نقش کو دھو نہیں دینا چاہیے اور اپنی گاڑی کے اس پہیہ سے نہیں باندھنا چاہیے جو ٹوٹ چکا ہے خود غرضی اور نفس پرستی ایک چراغ سحری ہے جس کا تیل ختم ہو چکا ہے اس کا فتیلہ جل کر خاک ہو گیا ہے وہ بجھ جائے گا ہوا کا جھونکا آئے یا نہ آئے۔

اسلام میں اس طرح کی انانیت اور خود غرضی کی کوئی گنجائش نہیں اس میں شخصی برتری یا خاندانی برتری اور خود غرضی کو پیر رکھنے کی بھی جگہ نہیں جو آج بعض مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں پائی جاتی ہے اس میں اس وسیع اور منظم خود غرضی کی بھی کوئی جگہ نہیں جو آج یورپ امریکہ اور روس میں نظر آتی ہے یورپ میں اس کی شکل ایک پارٹی اور جماعت کے اقتدار و تسلط کی ہے اور امریکہ میں سرمایہ داروں کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے روس میں وہ اس چھوٹے سے گروہ کی شکل میں سامنے آتی ہے جو کمیونزم پر ایمان لایا ہے وہ اکثریت پر زبردستی سے حاوی ہے اور مزدوروں اور قیدیوں کے ساتھ اس سفاکی اور سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ سلوک کرتا ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

یہ انانیت اور خود غرضی اپنی تمام صورتوں شکلوں کے ساتھ ختم ہو کر رہے گی خواہ وہ شخصی

اس سے سخت انتقام لے گی۔ اس دنیا کا مستقبل اب صرف عدل پسند جمہوری قوتوں اور اسلام
کے ساتھ وابستہ ہے چاہے خود غرضی کو تھوڑی سی اور مہلت مل جائے، چاہے اس کی لگام ذرا
ڈھیلی ہو جائے اور چاہے اس کو اپنی سرکشی، گمراہی، طغیانی میں گزارنے کے لئے کچھ دن اور
مل جائیں۔

خود غرضی اور انانیت شخصی ہو یا خاندانی، جماعتی ہو یا طبقاتی، قوم کی زندگی کے لئے
ایک خطرناک چیز ہے جس سے اس کو اپنی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ نہ اسلام میں اس کی
کوئی جگہ ہے نہ اس بیدار سوسائٹی میں جو بلوغ اور سن رشد کو پہنچ گئی۔ مسلمانوں کے لئے اور
عربوں کے لئے اور ان کے رہنماؤں اور حکمرانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اس سے آزاد ہو جائیں
اور اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیں قبل اس کے کہ وہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے۔

مشرق میں بھی اب اس کوتاہ نظری کا چل چلاؤ ہے اور اس کا وقت سفر قریب ہے۔
اس کے عروج و اقبال کے تارے غروب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ زید و عمرو و بکر کا مسئلہ
نہیں، یہ ایک عہد کا مسئلہ ہے جو ختم ہو رہا ہے، ایک مدرسۂ فکر اور مکتب خیال کا معاملہ ہے
جس کا دم واپسیں ہے، جو ابھی تک اس کے سہارے جی رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ
یہ سفینہ اب ڈوبنے والا ہے۔

صنعتی اور جنگی تیاری

عالم اسلامی کا کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا، اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی
خواہش ہے اور وہ دنیا کی قیادت و رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو
اس کے لئے امتیازی قوت اور تربیت، صنعت، علوم، تجارت اور فن حرب میں مکمل تیاری کی ضرورت

ہوگی اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا،
وہ اس سطح پر ہو کہ اپنے لئے پہننے اور کھانے کا سامان کر سکے اپنے لئے ہتھیار تیار کر سکے اپنی زندگی
کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کر سکے اور اس سے
فائدہ اٹھا سکے اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے اس کے چاروں طرف
پھیلے ہوئے سمندروں میں اس کے بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں وہ دشمن کا مقابلہ اپنے
یہاں کے جنگی جہازوں توپوں اور ہتھیاروں سے کرے اس کی برآمد اس کی درآمد سے زیادہ ہو
اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے اس کو اس کے کسی جھنڈے
کے نیچے نہ آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو۔

جب تک عالم اسلامی علم و سیاست صنعت و تجارت میں مغرب کا محتاج رہے گا
مغرب اس کا خون چوستا رہے گا اس کی زمین کا آب حیات نکالے گا اس کا سامان تجارت اور
مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گی اور اس کی ہر چیز پر
ہاتھ صاف کرتی رہیں گی جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے
اہم اور کلیدی عہدوں کو پُر کرنے اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لئے مغرب کے آدمیوں کا محتاج
رہے گا وہاں کا سامان تجارت و صنعت منگائے گا اور اس کو اپنا اتالیق اور استاذ مربی اور
سرپرست حاکم اور سردار سمجھے گا اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا،
اس وقت تک وہ مغرب کے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

یہ علمی اور صنعتی زندگی کا وہ شعبہ تھا جس کے بارہ میں عالم اسلامی نے عہد ماضی میں
کوتاہی سے کام لیا اور جس کی تعزیر میں اس کو طویل اور ذلیل زندگی کا مزہ چکھنا پڑا اور
اس پر مغربی قیادت اور سرداری مسلط کی گئی جس نے دنیا میں تباہی و غارت گری

قتل و خوں ریزی اور خود کشی برپا ہے۔ اب اگر اس موقع پر بھی عالم اسلام کی نئی علمی و ذہنی تیاری اور اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے بارہ میں عظمت پیدا کی تو اس کو بھی اس سے بہت ترقی ہوگی اور دنیا کی تقدیریں بدل سکیں گی اور تشدد و تعصب دور کیا جائے گا اور انسانیت کے امن کی مدت اور طویل ہو جائے گی۔

نئی علمی تنظیم

عالم اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ علم کی اس طرح تنظیم جدید کرے جو اس کی روح اور اس کے پیغام سے مطابقت رکھتی ہو۔ عالم اسلامی نے قدیم دنیا پر اپنی ذہنی سیادت کا سکہ جمادیا تھا اور دنیا کی عقلیت و ثقافت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا اس نے دین کے ذریعہ سے انہیں تسکین بخشا تھا۔ صدیوں تک متمدن دنیا اس کے دماغ سے سوچتی رہی اسی کے قلم سے لکھتی رہی اور اسی کی زبان میں تصنیف و تالیف کرتی رہی چنانچہ ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے مصنفین اور اہل علم اگر کوئی اہم کتاب لکھنا چاہتے تھے تو عربی ہی میں لکھتے تھے، اور بعض لوگ اصل کتاب عربی میں لکھتے اور اس کی تلخیص فارسی میں کرتے جیسا کہ امام غزالی نے کیمیائے سعادت میں کیا۔ اگرچہ یہ علمی تحریک جو عہد عباسی کے آغاز میں شروع ہوئی تھی یونان اور عجم سے متاثر تھی اور اسلامی اسپرٹ اور اسلامی فکر کی بنیاد پر قائم نہیں تھی اور اس میں علمی و دینی حیثیت سے متعدد خامیاں اور کمزوریاں تھیں لیکن اپنی قوت اور تازگی کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر آندھی پانی کی طرح چھا گئی اور قدیم علمی نظام اس کے سامنے ختم ہو گئے۔

پھر یورپ کی ترقی اور عروج کا زمانہ آیا اس نے اس قدیم نظام کو اپنے تجربات

اور علمی تنقید سے تقویم پارینہ بنا دیا اور اس کی جگہ تعلیم و تدریس کا نیا نظام تیار کیا جو اس کی روح عقلیت اور نفسیات کا کامیاب نمونہ تھا جو طالب علم اس علمی ماحول سے فارغ ہو کر نکلتا اس کے رگ رگ میں یہ اسپرٹ کام کرتی ہوتی دنیا نے دوسری بار اس تعلیمی نظام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور عالم اسلامی کو بھی قدرتی طور پر اس کے سامنے سر جھکانا پڑا جو عرصہ سے علمی انحطاط اور فکری جمود کا بیمار تھا اور احساس کمتری کی بنا پر اپنی نجات صرف یورپ کی تقلید میں منحصر سمجھتا تھا اس نے اس تعلیمی نظام کو اس کی کمزوریوں و خامیوں کے باوجود قبول کر لیا اور وہی نظام آج عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ پر حاوی ہے۔

اس نظام کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی نفسیات اور جدید نفسیات میں ایک کشمکش بپا ہو گئی اسلامی اخلاق اور مغربی طرز اخلاق میں رسہ کشی شروع ہوئی، ذہنیت اور اس کی قدر و قیمت کی جدید میزان اور قدیم میزان میں ایک جنگ شروع ہو گئی اس نظام کا ایک ثمرہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں شک اور نفاق، بے صبری، زندگی سے عشق اور بوالہوسی، تندی اور حارپے تیج کی ذہنیت پیدا ہو گئی اور اس طرح کے دوسرے عیوب پیدا ہو گئے جو مغربی تہذیب کا لازمہ ہیں۔

اگر عالم اسلامی کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو اگر وہ عالمگیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خود مختاری ہی نہیں بلکہ علمی لیڈرشپ بھی بہت ضروری ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں یہ مسئلہ بہت گہرے غور و فکر کا محتاج ہے اس کے لئے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر تصنیف و تالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے اس کام کے سربراہ کار عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق و تنقید کے درجہ تک پہنچتی ہو

اور اس کے ساتھ اسلام کے اصلی سرچشموں سے پورے طور پر سیراب اور اسلامی روح سے ان کا قلب و نظر معمور ہو، یہ وہ کام ہے جس کی تکمیل کسی جماعت یا انجمن کے لئے مشکل ہوگی، یہ اسلامی حکومتوں کا کام ہے، اس مقصد کے لئے اس کو مستقل جامعتیں اور مکمل ادارے قائم کرنے ہوں گے اور ایسے ماہرین فن کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہر فن میں دستگاہ رکھتے ہوں، وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو ایک طرف کتاب و سنت کے محکمات اور دین کے ناقابل تبدیل حقائق پر مشتمل ہو اور دوسری طرف تنقیدی عصری علوم اور تجزیہ و تحلیل پر حاوی ہو، وہ مسلمان نوجوانوں کے لئے علوم عصریہ کی از سر نو تدوین کریں جو اسلام کے اصولوں اور اسلام کی روح کی بنیاد پر ہو، اس میں ہر ایسی چیز ہو جو نوخیز طبقے کے لئے ضروری ہو اور جس سے وہ اپنی زندگی کی تنظیم کر سکے اور اپنی مالیت کی حفاظت کر سکے، وہ مغرب سے مستغنی ہو اور مادی و دماغی جنگ میں اس کے مقابلہ میں آسکے، اپنی زمین کے خزانوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ملک کی دولتوں کو استعمال میں لائے، اسلامی ملکوں کی مالیات کی نئی تنظیم کرے اور اس کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت اس طرح چلائے کہ طرز حکومت اور مالیاتی امور کی تنظیم میں یورپ پر اسلامی نظام کی برتری صاف ظاہر ہو جائے اور وہ اقتصادی مشکلات حل ہو جائیں جن کے حل کرنے کے معاملہ میں یورپ سپر ڈال چکا ہے اور اپنی بے بسی کا معترف ہے۔

اس روحانی، صنعتی اور فوجی تیاری اور تعلیمی آزادی کے ساتھ عالم اسلامی مرتبہ حاصل کر سکتا ہے، اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے، اور دنیا کو اس تباہی سے نجات دلا سکتا ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہی ہے، قیادت کوئی کھیل نہیں، نہایت سنجیدہ معاملہ ہے اور منظم جد و جہد، مکمل تیاری، عظیم الشان قربانی اور سخت جانفشانی کی محتاج ہے۔

عالم عربی کی قیادت

عالم عربی کی اہمیت

دنیا کے سیاسی نقشہ میں عالم عربی بہت اہمیت رکھتا ہے وہ ان قوموں کا گہوارہ ہے جنھوں نے انسانی تاریخ میں سب سے اہم پارٹ ادا کیا اس کے سینہ میں دولت وطاقت کے عظیم الشان خزانے محفوظ ہیں اس کے پاس پٹرول ہے جو آج جنگی اور صنعتی جسم کے لئے خون کا درجہ رکھتا ہے اور یورپ وامریکا اور مشرق بعید کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

وہ عالم اسلامی کا دھڑکتا ہوا دل ہے جس کی طرف روحانی اور دینی طور پر پورے عالم اسلامی کا رُخ ہے جو ہر وقت اس کا دم بھرتا ہے اور اس کی محبت و وفاداری میں سرشار رہتا ہے۔

اس کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کا امکان ہے کہ خدانخواستہ اس کو تیسری جنگ کا میدان بننا پڑے وہاں طاقتور بازو ہیں سوچنے سمجھنے والی عقلیں ہیں اور جنگجو جسم ہیں وہاں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں ہیں اور قابل کاشت زمینیں ہیں۔ مصر وہیں واقع ہے جو اپنی پیداوار آمدنی زرخیزی وشادابی دولت و ترقی تہذیب و تمدن میں خاص درجہ رکھتا ہے جس کی گود میں دریائے نیل رواں دواں ہے یہاں فلسطین ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک ہیں جو اپنی آب وہوا کی لطافت حسن وخوبصورتی اور فوجی اہمیت میں ممتاز ہیں۔

اس کے پاس "عراق" کا ملک ہے جو اپنی بہادری، محنت جانی، شجاعت، عزم اور پٹرول کے ذخیروں کی وجہ سے مشہور ہے۔

یہاں جزیرۂ عرب ہے جو اپنے روحانی مرکز، دینی آثار میں سب سے منفرد ہے جس کے حج کے سالانہ اجتماع کی نظیر دنیا میں نہیں، جہاں تیل کے چشمے سب سے زیادہ تیل پیدا کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں یا ایسی چیزیں جنہوں نے عالم عربی کو اہل مغرب کی نظر کا مرکز اور ان کی خواہشات کی آماجگاہ، اور قیادت و لیڈر شپ کے لئے مقابلہ کا میدان بنا دیا اور جس کا رد عمل یہ ہوا کہ ان ملکوں میں عربی قومیت اور وطن پرستی کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے۔

محمد رسول اللہ عالم عربی کی روح ہیں

ایک مسلمان عالم عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے، بلکہ خود ایک وطن پرست عرب عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت و افتخار کا عنوان، اور اس کا سنگ بنیاد ہیں، اگر اس سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی، آپ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالم عربی عالم وجود میں آیا، اس سے پہلے یہ دنیا منقسم اور منتشر، کا نمونہ

باہم دست و گریباں قبیلوں، غلام قوموں اور بے مصرف صلاحیتوں کا دوسرا نام
تھی اس پر جہل و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے، عرب رومی شہنشاہی سے
جنگ مول لینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اس کا تصور کرنا بھی ان کے لئے مشکل
تھا، شام جو بعد میں عالم عربی کا بہت اہم حصہ قرار پایا، ایک رومی نوآبادی تھی جو
مطلق العنان حکومت اور سخت ترین ڈکٹیٹر شپ کے رحم و کرم پر تھی اس نے ابھی تک
آزادی و انصاف کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔

عراق کیانی حکومت کی اغراض و خواہشات کا شکار تھا، نئے نئے محاصل
اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے اس کی کمر جھک گئی تھی، رومی مصر کے ساتھ ایک گائے کا سا
برتاؤ کرتے تھے جس کو دوہتے اور دانہ و علف میں وہ کمی کرتے لیکن چارہ دیتے
وقت حق تلفی اور بخل سے کام لیتے، پھر وہاں سیاسی استبداد کے ساتھ مذہبی استبداد
کا سلسلہ بھی جاری تھا، وفعتاً اس مشرق منتشر مظلوم دنیا پر اسلام کی بادبہاری کا
ایک جھونکا چلا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اس وقت یہ عربی دنیا
ہلاکت کے قریب تک پہونچ گئی تھی آپ نے اس کی دستگیری فرمائی، اس کی نبضیں
ڈوب رہی تھیں آپ نے اس کو زندگی بخشی، نئی روح عطا کی، کتاب و حکمت کی تعلیم دی
تزکیہ کا سبق پڑھایا، آپ کی بعثت کے بعد اس دنیا کی نوعیت بدل گئی اب وہ
اسلام کی سفیر تھی، امن و سلامتی کی پیامبر تھی، تہذیب تمدن کی علمبردار تھی، قوموں کے لئے
رحمت کا پیغام تھی، اب ہم شام کا بھی نام لے سکتے ہیں، عراق کا بھی ذکر کر سکتے ہیں،
ہم مصر پر بھی فخر کر سکتے ہیں، اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت نہ ہوتی
تو آج نہ شام کا کہیں پتہ ہوتا نہ عراق کا کہیں ذکر ہوتا نہ مصر کا وجود ہوتا اور نہ عالم عربی

عالم عربی ہی نہ ہوتا۔ اور یہ بھی یقینی ہے کہ دنیا بھی تمدن و ثقافت، علم و فن، تہذیب و ترقی کی اس سطح پر نہ ہوتی۔ اب اگر عرب قوموں اور حکومتوں میں کوئی دین اسلام سے مستغنی ہوتا جاتا ہے اور اپنا رخ مغرب کی طرف پھیرتا ہے یا عرب کے عہد قدیم کی طرف جو بیجا نعرہ بازی ہے، یا اپنے نظام زندگی اور سیاست و حکومت میں مغربی و مشرقی دستور و قوانین کی پیروی کرتا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا تنہا امام، رہبر اور اسوہ نہیں سمجھتا تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی نعمت کو ٹھکرا دیتا ہے اور اپنے پچھلے دور جاہلیت کی طرف واپس چلا جاتا ہے جہاں رومیوں اور ایرانیوں کا سکہ چلتا تھا، جہاں ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا، جہاں سامراج کی فرمانروائی تھی، جہاں جہل و گمراہی تھی، جہاں غفلت اور بیکاری تھی، جہاں دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کے گوشہ میں ایک مجہول زندگی گذاری جا رہی تھی، اس لئے کہ یہ شاندار اور روشن تاریخ، یہ تابناک تہذیب، یہ باذوق ادب، یہ عرب سلطنتیں اور حکومتیں صرف محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت کا فیض اور آپ کی آمد کا نتیجہ ہے۔

ایمان عالم عربی کی طاقت ہے

اسلام عالم عربی کی قومیت ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے امام اور قائد ہیں۔ ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسہ پر اس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور غالب ہوا۔ اس کی طاقت کا راز اور اس کا کارگر ہتھیار جو کل تھا وہی آج ہے جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، اپنی ہستی کی حفاظت کر سکتا ہے اور دوسروں تک اپنا پیغام پہونچا سکتا ہے۔

عالم عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دوسرے دشمن کا
مقابلہ کرنا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کر سکتا جو یورپ یا نیز اس کو عطا کرتا
ہے یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے یا پٹرول کی قیمت کے طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے وہ اپنے
دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس روح اور اسپرٹ کے ساتھ کر سکتا ہے جس
اسپرٹ کے ساتھ کبھی اس نے بیک وقت رومی و ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی اور
فتح حاصل کی تھی، وہ اس قوم کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے
نفرت ہو، اس جسم سے مقابلہ نہیں کر سکتا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو، اس عقل کے ساتھ
مقابلہ نہیں کر سکتا جس کو شک و شبہ کا گھن لگ چکا ہو، اور افکار و خواہشات باہم دست و گریباں
ہوں، اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ ضعیف الایمان اور متزلزل قلب اور میدان میں ساتھ
چھوڑ دینے والی قوت کے ساتھ میدان جنگ کبھی نہیں جیتا جا سکتا، عرب کے قائدین اور
عرب لیگ کے ذمہ داروں کے لئے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ عربی فوج، کسانوں، تاجروں
اور جمہور کے ہر طبقہ میں ایمان کی تخم ریزی کریں، ان میں جہاد کا جذبہ، جنت کا شوق اور
ظاہری آرائشوں کی تحقیر و اہانت کا احساس پیدا کریں، ان کو خواہشات نفس اور زندگی
کی مرغوبات پر قابو حاصل کرنے، خدا کے راستہ میں مصائب اور تکلیفیں برداشت کرنے
مسکراتے چہروں کے ساتھ موت کے استقبال اور اس پر پروانوں کی طرح گرنے کا سبق دیں۔

شہسواری اور فوجی زندگی کی اہمیت

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عربی اقوام نے اپنی بہت سی فوجی خصوصیات کو
ضائع کر دیا، خاص طور پر شہسواری ان کی زندگی سے بالکل خارج ہو گئی ہے، ایک

بہت بڑا نقصان اور میدان جنگ میں ہزیمت اور کمزوری کا بہت اہم سبب جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں کی فوجی اسپرٹ جو ان کا طغرائے امتیاز تھی ختم ہو گئی جسم کمزور ہو گئے، لوگ ناز و نعم میں زندگی گزارنے لگے، موٹروں نے گھوڑوں کی جگہ لے لی اور تربیت کردہ عربی گھوڑے جن کی دنیا میں دھوم ہے جزیرۂ عرب تک میں نیست و نابود ہو جائیں لوگوں نے کشتی، شہسواری، جنگی مشقوں اور دوسری جسمانی ورزشوں کو فراموش کر دیا اور ان کھیلوں کو اختیار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں، اس لئے تعلیم و تربیت کے رہنماؤں کے لئے ضروری ہے کہ عرب نوجوانوں میں شہسواری، فوجی زندگی، سادگی، استقلال، عزیمت اور مصائب پر صبر و استقامت کی اہلیت پیدا کریں۔

امیر المومنین عمر بن الخطابؓ عجمی ممالک میں اپنے عرب عمال کو لکھتے ہیں:-

ایاکم والتنعم وزی العجم

وعلیکم بالشمس فانها	تن آسانی و راحت طلبی کی زندگی اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دور دور
حمام العرب وتمعددوا	رہنا، دھوپ میں بیٹھنے اور چلنے کی
واخشوشنوا واخلولقوا	عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں
واعطوا الرکب اسنتها	کا حمام ہے، جفاکشی، سادہ زندگی
وانزوا نزوا وارموا	صبر و تحمل، موٹے جھوٹے پہننے کے
الاغراض[1]	عادی رہو، گھوڑے پر جست لگا کر
	بے تکلف بیٹھنے کی مشق رکھنا چاہئے
	نشانے درست ہوں۔

---

[1] بغوی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ارموا بنی اسماعیل	اے اہل عرب تیر اندازی کی مشق
فان ابا کم کان	رکھو اس لئے کہ تمہارے جد امجد
رامیاً۔[1]	(حضرت) اسماعیل تیر انداز تھے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

الا ان القوۃ الرمی	یاد رکھو جس قوت کے تیار رکھنے کی
الا ان القوۃ الرمی۔[2]	قرآن مجید میں تاکید ہے وہ تیر اندازی
	ہے وہ تیر اندازی ہے۔

تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی و شجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز و تخنث پیدا کرتی ہو عریاں صحافت نگاری فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں، جو نوجوانوں میں نفاق بے حیائی، فسق و فجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو ان پیشہ وروں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں جو نسل اسلامی کے قلب و اخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے اور فسق و معصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لئے خوبصورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی قوم میں مردانگی اور غیرت انسانی کو زوال ہوا عورتوں نے اپنی نسائیت اور فطرت مادری کے خلاف بغاوت کی اور آزادی و بے حجابی کی راہ اختیار کی ہر چیز میں مردوں کی مسابقت کی کوشش کی، خانگی زندگی سے نفرت و غفلت بڑھی اور ضبط تولید کی رغبت پیدا ہوئی اس کا ستارۂ اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات بھی

---

[1] بخاری [2] مسلم

مٹ گئے۔ یونانی، رومی اور ایرانی اقوام کا انجام یہی ہوا اور یورپ بھی آج اسی راہ پر گامزن ہے جو اس انجام تک لے جاتی ہے، عالم عربی کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا نہ ہو۔

طبقاتی تفاوت اور اسراف کا مقابلہ

عربوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے اور بہت سے دوسرے اسباب کی بنا پر عیش و عشرت، غیر ضروری لوازم زندگی کے شدید اہتمام، اسراف، لذت و خواہش اور فخر و آرائش کے لئے فضول خرچی کی عادت پڑ چکی ہے، اس عیش و تنعم اور بیدردی کے ساتھ خرچ کے پہلو بہ پہلو فقر و فاقہ اور عریانی بھی موجود ہے، جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف وہ آدمی ہے جس کو اپنی ضرورت سے زائد غذا، لباس کا مصرف نظر نہیں آتا، دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جس کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے کپڑا بھی نصیب نہیں، جب عرب کے امراء و اصحاب ثروت ہوا سے باتیں کرنے والی موٹروں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں، اسی وقت چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں اور بچیوں کی ایک فوج سامنے آتی ہے جن کا لباس تار تار ہوتا ہے، جو ایک پیسے کے لئے ان کی موٹروں کے ساتھ دوڑنے لگتی ہے۔

جب تک عرب ملکوں میں فلک بوس محلوں، بہترین کاروں کے ساتھ ساتھ حقیر جھونپڑیاں اور تنگ و تاریک مکانات نظر آئیں گے جب تک تخمہ و فاقہ ایک شہر میں شباب پر ہوگا اس وقت تک کیونزم کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہیں، ہنگامے، جھگڑے ہونا لازمی ہیں، کوئی پروپگنڈا اور طاقت اس کو روک نہیں سکتی، وہاں اگر اسلامی نظام اپنے جمال و اعتدال کے ساتھ قائم نہیں ہوگا تو تعزیر خداوندی کے طور پر اور رد عمل کے طریقہ پر اس کی جگہ

ایک ظالم و جابر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔

تجارت اور مالی نظام میں خود مختاری

عالم اسلامی کی طرح عالم عربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت و حرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو وہاں کے رہنے والے انھیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت و محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں، اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلات حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دست نگر اور مغرب کے پروردۂ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لئے جنگ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہے جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہے وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدان جنگ میں اسی گولی کو استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیار شدہ ہے، عالم عربی کے لئے یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ نہ اٹھا سکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اسی کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہونچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹ اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو، اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی انھیں کے سپرد ہوں، عالم عربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت و مالیات کی تنظیم، درآمد برآمد، قومی صنعت، فوج کی ٹریننگ اور مشینوں اور آلات حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو ایسے افسروں کی تربیت کی جائے

جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت، تندہی، دیانت اور خیرخواہی کے ساتھ انجام دیں۔

انسانیت کی سعادت کے لئے عربوں کی ذاتی قربانی

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس وقت ہوئی جبکہ انسانیت کی شقاوت بدبختی انتہائی حد کو پہنچ چکی تھی، اس وقت انسانیت کی اصلاح کا مسئلہ ان افراد کی دسترس سے باہر تھا جن کی زندگی ناز و نعمت میں بسر ہو رہی تھی، اور جو محنت و مشقت کے برداشت کرنے اور مالی و جانی نقصانات کو جھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اور جن کے لئے ہمہ وقت عیش و نشاط کا سامان موجود تھا، اس وقت انسانیت کو ایسے افراد درکار تھے جو انسانیت کی خدمت میں اپنے مستقبل کو قربان کر سکتے تھے اور منافع سے دست بردار ہو کر اپنے جان و مال، عیش و آرام اور اپنے تمام دنیاوی مفاد کو خطرات و مشکلات کے مقابلہ میں پیش کر سکتے تھے، ان کو اپنے پیشہ و تجارت کی کساد بازاری اور کسی طرح کے مالی نقصان و خطرات کی پرواہ نہ تھی، جن کو اپنے آبا و اجداد، اپنے دوستوں اور قرابت مندوں کی قائم کی ہوئی امیدوں پر پانی پھیر دینے میں تامل نہ تھا، صالح علیہ السلام کی قوم نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہی ان تعلق والوں کی زبان پر بھی جاری ہو جاتا۔

قَالُوا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود ۶۲) — اے صالح! اس سے تو ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

جب تک دنیا میں ایسے مجاہد تیار نہ ہوں اس وقت تک انسانیت کا بقاء و استحکام اور کسی اہم دعوت کا کامیاب ہونا ناممکن ہے، یہ کردار رکھنے والے گنتی کے چند افراد دنیا کی

اصطلاح میں محروم اور کوتاہ قسمت سمجھے جاتے ہیں انہیں کی بلند ہمتی اور جذبۂ قربانی
پر انسانیت کی فلاح و کامرانی اور عیش و شادمانی کا دار و مدار ہے وہ چند افراد جو اپنی جان کو
مصائب میں ڈال کر ہزاروں بندگانِ خدا کے ابدی مصائب سے بچنے کا سبب بنتے ہیں
اور دنیا کے ایک بڑے گروہ کو شر سے خیر کی طرف لاتے ہیں اگر چند افراد کی محرومی و ہلاکت
ایک پوری ملت کے لئے خوشحالی اور سرفرازی کا باعث ہو اور اگر کچھ مال و زر اور تجارت
و حرفت کے نقصان اور گھاٹے سے بے شمار اور لاتعداد انسانوں کے لئے دینی و دنیوی
فلاح کا دروازہ کھلتا ہو تو یہ سودا ہر طرح سستا ہے۔

جب اللہ تبارک وتعالے نے حضرت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو
دیکھا جاتا تھا کہ روم و فارس اور دنیا کی متمدن قومیں جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم
کی باگ ڈور ہے ہرگز اپنے عیش و نشاط کو نہیں چھوڑ سکتیں وہ اپنی ناز پروردہ زندگی کو
خطرہ میں نہیں ڈال سکتیں وہ بے یار و مددگار انسانیت کی خدمت دعوت و جہاد کے
لئے مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتیں ان کے اندر اتنی استطاعت
ہرگز نہیں کہ اپنی پر تکلف زندگی اور زیب و زینت کا ایک معمولی سا جز بھی قربان کریں
ان میں ایسے لوگ بالکل مفقود تھے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھتے ہوں اپنی حرص و طمع
کو روک سکیں اور جو تمدن کے لوازم اور فیشن کی پابندی سے بے نیاز ہو کر واجبی گزران
پر قناعت کر سکیں اس لئے اللہ تعالے نے اسلام کے پیغام اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی
صحبت کے لئے ایسی قوم کا انتخاب فرمایا جو دعوت و جہاد کے بوجھ کو اٹھا سکتی تھی اور
ایثار و قربانی کے جذبہ سے بھرپور تھی یہ وہی عربی قوم تھی جو طاقتور سادہ و خشن اور
جفاکش تھی جس پر مصنوعی تمدن کا کوئی وار کارگر نہ ہوا اور دنیا کی رنگینیوں کا کوئی جادو

نہ چل سکا۔ یہی لوگ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جو دل کے غنی علم سے بھرپور اور تکلفات سے کوسوں دور تھے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس عظیم الشان دعوت کو لے کر اٹھے اور آپ نے جدوجہد و جانفشانی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ اس دعوت کو ہر اس چیز پر ترجیح دی جو آپ کے لئے رکاوٹ کا سبب بن سکتی تھی، آپ خواہشات سے بالکل کنارہ کش تھے دنیا کی دلفریبیوں کا آپ پر کوئی جادو نہ چل سکا یہی وہ چیز تھی جو دنیا کے لئے اسوۂ حسنہ اور رہنمائی۔ — جب قریش کے وفد نے آپ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور آپ کے لئے وہ تمام چیزیں پیش کیں جو ایک نوجوان کے دل کو فریفتہ اور نفسانیت رکھنے والے انسان کو خوش کر سکتی تھیں، مثلاً حکومت و ریاست، عیش و عشرت، دولت و ثروت تو آپ نے ان تمام چیزوں کو بے تامل ٹھکرا دیا۔ اسی طرح جب آپ کے چچا نے گفتگو کی اور چاہا کہ آپ کو اس دعوت کے پھیلانے اور اس میں حصہ لینے سے روک دیں تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ اے چچا خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اس کام سے باز نہیں آ سکتا اور اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک کہ اللہ تعالےٰ اس دعوت کو غالب نہ کر دے یا میں خود اس سلسلہ میں کام نہ آ جاؤں۔ یہی جدوجہد اور قربانی دنیا کی نفع اندوز ذہنیت سے بے تعلقی اور پُرمسرت زندگی کے مقابلہ میں تکلیف و مشقت کی زندگی کی ترجیح اہل دعوت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نمونہ اور اسوہ بن گیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اوپر عیش و آرام راحت و آسائش کے دروازے بند کر لئے اور خود اپنے ہی اوپر نہیں بلکہ اپنے پورے خاندان اہلبیت اور تمام عزیزوں کو بھی عیش و عشرت کے مواقع سے منتفع ہونے کا موقع نہیں دیا

وہی لوگ جو آپ سے زیادہ قریب و عزیز تھے زندگی کے عیش و راحت میں ان کا حصہ سب سے کم تھا اور جہاد و قربانی میں وہ سب سے آگے رکھے گئے تھے جب آپ کسی چیز کی حرمت کا ارادہ کرتے تو اس کی ابتدا اپنے قبیلہ اور اپنے ہی لوگوں سے کرتے اور جب کسی حق کی باری آتی یا کوئی نفع پہونچانا ہوتا تو دور کے لوگوں سے شروع کرتے اور بسا اوقات آپ کے قرابت دار اور قبیلہ والے اس سے محروم ہی رہ جاتے آپ نے جب سودی کاروبار ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کا کاروبار کو ختم کیا اور ان کے تمام سودی منافع کو ختم کر دیا اسی طرح جاہلیت کے انتقامات و مطالبات کو باطل کرنے اٹھے تو ربیعہ بن حارث ابن عبد المطلب کے خون کو پہلے باطل کیا اور جب آپ نے زکوٰۃ کا قانون جاری فرمایا (جو درحقیقت ایک بہت بڑی مالی منفعت ہے اور تا قیامت باقی رہنے والی چیز ہے) تو آپ نے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کے لئے اس کو قیامت کے لئے حرام کر دیا فتح مکہ کے دن جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ سے بنی ہاشم کے لئے سقایت زمزم کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کی کلید برادری کا مطالبہ کیا تو آپ نے شدت سے انکار فرما دیا اور عثمان بن طلحہ کو بلا کر خانہ کعبہ کی کنجی ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ اے عثمان! دیکھو یہ تمہاری کنجی ہے تم اس کو لے لو آج احسان اور وفا کا دن ہے اور اب یہ تمہارے خاندان میں ہمیشہ رہے گی کوئی اس کو تم سے نہیں لے سکتا. الا یہ کہ کوئی ظالم اس کی جرأت کرے آپ نے ازواج مطہرات کو زہد و قناعت اور دکھی پھیکی زندگی گزارنے کی ترغیب دی اور صاف صاف فرمایا کہ اگر تم فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے لئے آمادہ ہو تو میری رفاقت اختیار کر سکتی ہو ورنہ ناز و نعمت و راحت کے ساتھ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھ کر سنایا:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ	اے نبی آپ اپنی بیویوں سے فرمادیجئے
إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا	کہ تم اگر دنیوی زندگی اور اس کی بہار
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ	چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ متاع دیدوں
وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا	اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کردوں
وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسول
وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ	کو اور عالم آخرت کو تو تم میں سے نیک
أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ	کرداروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے
أَجْرًا عَظِيمًا (الاحزاب ۲۸، ۲۹)	اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

لیکن اس انتخاب میں آپ کے گھر والوں نے اللہ اور رسول ہی کو اختیار کیا،

اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب سنا کہ آپ کے پاس کچھ غلام و خادم آئے ہیں اور چونکہ ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے گھٹے پڑ گئے تھے تو آپ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچیں کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ایک خادم عنایت فرمادیجئے تاکہ میں کچھ آرام حاصل کر سکوں تو آپ نے ان کو تسبیح و تحمید کی وصیت فرمائی اور کہا کہ تمہارے لئے یہ چیز خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہے یہی معاملہ آپ کا اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ تھا اور جو جتنا ہی قریب ہوتا جاتا اسی قدر اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی۔

مکہ کے لوگ جب ایمان لائے تو ان کی اقتصادی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا ان کی تجارت کساد بازاری کا شکار ہو گئی اور بعض اپنے راس المال سے بھی محروم ہو گئے تھے کہ جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں جمع کیا تھا، ان میں ایسے بھی ایمان لانے والے تھے جو راحت و آرام کے سامان اور آرائش و زینت کے اسباب بھی ختم کر چکے تھے حالانکہ

جیسے ان کی امتیازی شان یہی تھی کہ وہ زینت و آرائش کے دلدادہ تھے۔ اسی طرح
اس دعوت کے پھیلانے اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے سلسلے میں بعضوں کی کوتاہ
ہی ہو گئی اور کتنے اپنے آبائی دولت کے حصوں سے محروم ہو گئے۔

اسی طرح جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ کا ساتھ دیا تو اس کا
اثر ان کے کھیتوں، ان کے باغات پر پڑا مگر بایں ہمہ جب انھوں نے اپنا کچھ تھوڑا سا
وقت ان کی نگہداشت کے لئے چاہا تو اس کی اجازت نہیں ملی اور اللہ تعالیٰ کی
جانب سے ان کو تنبیہ کیا گیا ارشاد ہوا:—

وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا	اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے
بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ ۱۹۵)	آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہی حال عرب اور ان تمام لوگوں کا ہوا جو اس دعوت سے متاثر اور اس پر عمل پیرا ہوئے
جب تک جہاد کی مشقت اور جان و مال کے خسارہ میں ان کا اتنا بڑا حصہ تھا جو دنیا کی
کسی قوم کے حصہ میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:—

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے
وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ	بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں
وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا	اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا	ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا
وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ	تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند
إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ	کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا	اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ	ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالے
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۠	اپنا حکم بھیجے اور اللہ تعالے بے حکمی کرنیوالوں
(سورۃ التوبہ ـ ۲۴)	کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ	مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو
حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ	جو ان کے اطراف میں بستے ہیں لائق نہ تھا کہ
يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا	اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور پیچھے
يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ	رہ جائیں اور نہ یہ بات لائق تھی کہ حضور کی
(التوبہ ۱۲۰)	جان کی پرواہ نہ کرکے محض اپنی جانوں
	کی فکر میں پڑ جائیں۔

اس لئے کہ انسانی سعادت کی عمارت انھیں لوگوں کی قربانیوں کے ستونوں پر قائم ہونے والی تھی اور حالات کی تبدیلی میں صرف اسی بات کا انتظار تھا کہ یہ مہاجرین و انصار اپنے کو مٹا کر انسانیت کی سرسبزی اور قوموں کی ہدایت و فلاح کا فیصلہ حاصل کرلیں اللہ تعالے فرماتا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ	ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ تھوڑے خوف
وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ	بھوک اور جانوں اور پھلوں کی کمی
وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ (البقرہ ۱۵۵)	اور نقصان کے ساتھ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ	کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ کہکر چھوٹ جائیں گے کہ
يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝	ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش

(العنکبوت ۔ ۲) ختم ہو گئی۔

اگر عرب اس سرفرازی کو قبول کرنے سے جھجکتے اور انسانیت کی اس عظیم خدمت میں تردد سے کام لیتے تو بدبختی اور عالم کے فساد کی مدت اور بڑھ جاتی اور جاہلیت کی تاریکی بدستور دنیا پر چھائی رہتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (الانفال ۷۳)

اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہے پر کھڑی تھی، اس وقت دو ہی راستے تھے، یا تو عرب کے لوگ اپنے جان و مال، آن اولاد اور تمام محبوب چیزوں کو خطرہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہو کر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی اور انسانیت کی قسمت بدلتی جنت شوق ابھرتا اور ایمان کی ہوائیں چلتیں، یا پھر وہ اپنی خواہشات و مرغوبات اور اپنی انفرادی لذت و عیش کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی اور غفلت و مدہوشی کے عالم میں پڑی رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لئے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی اور ان کو آخرت اور اس کے بے پایاں ثواب کی ترغیب دی تو انھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا اور اللہ کے لئے نوعِ انسانی کی سعادت کی امید میں انھوں نے دنیا کے تمام عیش و آرام سے آنکھیں بند کر کے اپنے جان و مال کو اللہ کے راستے میں جھونک دیا اور ان تمام چیزوں کو تج دیا جن پر لوگ حریصانہ نظریں اٹھاتے ہیں انھوں نے پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ

راہ خدا میں جانیں دیں اور محسنین کہیں تو اللہ نے ان کو دنیا اور آخرت کے بہتر اجر سے نوازا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے۔)

آج دنیا بہت ہٹ کر پھر اسی نقطہ پر پہونچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی عیسوی میں تھی یہ عالم پھر اسی دوراہہ پر نظر آرہا ہے جس دوراہہ پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا، آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لئے جان کی بازی لگادے اور اپنی تمام آسائش و ثروت دنیا کی نعمتوں، ترقی و خوشحالی کے امکانات اور اپنے سامان راحت کو خطرہ میں ڈال دے تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی و ترقی، عہدہ و منصب، تنخواہوں کی بیشی، آمدنی کے اضافہ اور کاروبار کی ترقی کی فکر میں رہیں اور سامان عیش اور اسباب راحت کی فراہمی میں مشغول رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے اگر پچھے ذہین عرب نوجوان بڑے بڑے شہروں میں خواہشات کے غلام بن کر بیٹھے رہیں اور اگر ان کی زندگی کا محور صرف مادہ اور معدہ ہے اس کے علاوہ ان کی کوئی اور فکر نہیں ہے اور ان کی تمام جد و جہد صرف اپنی ذاتی زندگی اور اپنی مرفہ الحالی کے گرد چکر لگا رہی ہے تو ایسی صورت حال میں انسانی سعادت کا تصور بھی مشکل ہے بعض جاہلی قوموں کے نوجوان ان سے زیادہ حوصلہ مند تھے اور ان کا ذہن ان سے کہیں زیادہ بلند تھا جب کہ انھوں نے اپنے پسندیدہ مقاصد کی راہ میں اپنی تمام راحت و آرام اور اپنے مستقبل تک کو قربان کر دیا

جاہلی شاعر امرؤ القیس ان سے کہیں زیادہ باہمت تھا کہتا ہے :-

ولو أنّ ما أسعى لأدنى معيشة ... كفاني ولم أطلب قليل من المال

ولكنما أسعى لمجد مؤثّل ... وقد يدرك المجد المؤثّل أمثالي

(اگر میں کسی ادنیٰ درجہ کی زندگی کے لئے کوشش کرتا ہوتا تو مجھے تھوڑا سا مال بھی کافی ہوتا اور اس کے لئے ایسی جدوجہد کی ضرورت نہ ہوتی۔
لیکن میں تو ایسی عظمت کا طالب ہوں جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور مجھ جیسے آدمی بھی ایسی عظمت کو حاصل کر لیتے ہیں۔)

دنیا کی سعادت و کامرانی کی منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں اس پل پر سے گزر کر دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے وہ وہی انفرادی خواہش و ہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اس کی زمین پر امن و سلامتی پھیلانے کے لئے قربان کریں۔ آج انسانیت کی افتادہ زمین کھاد مانگتی ہے یہ کھاد راحت و آرام کے مواقع انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کر دینے کا ارادہ کر لیں۔ چند انسانی جانوں کی جدوجہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ سستا سودا ہے اس لئے کہ جو نعمت حاصل ہوگی وہ بہت ہی قیمتی گراں مایہ ہے اور اس کے لئے جو کچھ قربان کرنا پڑے وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی اور ارزاں ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

عالم اسلامی کی توقع عالم عربی سے

عالم عربی اپنی خصوصیات، محل وقوع اور اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر اسلام کی دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کا حقدار ہے، وہ یہ کر سکتا ہے کہ عالم اسلامی کی قیادت کا بیڑا اٹھائے اور مکمل تیاری کے بعد یورپ سے آنکھیں ملا سکے اور اپنے ایمان و دعوت کی طاقت اور خدا کی نصرت سے اس پر غالب آ جائے اور دنیا کو شر سے خیر کی طرف، تباہی و بربادی سے امن و سلامتی کی طرف لے آئے جیسا جس طرح مسلمانوں کے قاصد نے یزدگرد کی مجلس میں کہا تھا:۔

• انسانوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی پرستش میں، دنیا کی تنگی سے دین کی کشادگی میں، اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کی عدل گستری میں داخل کرے۔

عالم انسانی عالم اسلامی کی طرف اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے اور عالم اسلامی عالم عربی کی طرف اپنے لیڈر اور رہبر کی حیثیت سے نظریں اٹھائے ہوئے ہے کیا عالم اسلامی عالم انسانی کی توقع کو پورا کر سکتا ہے اور کیا عالم عربی عالم اسلامی کے سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ عرصہ سے مظلوم انسانیت اور برباد شدہ دنیا اقبال کے پُر درد الفاظ میں مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہے اس کو اب بھی یقین ہے کہ جن مخلص ہاتھوں نے کعبہ کی تعمیر کی تھی وہی دنیا کی تعمیر نو کا فرض انجام دے سکتے ہیں ؎

ناموس ازل را تو امینی تو امینی ‎ ‎ ‎ دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی ‎ ‎ ‎ صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم همه ویرانه ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم! باز به تعمیر جهان خیز

از خواب گران، خواب گران، خواب گران خیز

از خواب گران خیز
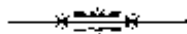
INDEX

INSANI DUNIYA PAR MUSALMANAUN KE UROOJ-O-ZAWAL KA ASAR

اشاریہ

"اِنسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

گیارھواں ایڈیشن

١٤١٣ھ ـــــ ١٩٩٢ء

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

اشخاص

غ

قبائل وخاندان اور طبقات

کتابیات

مقامات

متفرقات

ادارے تحریکیں اور کتب خانے

مذاہب و نظریات

سماج، تہذیب، تمدن اور معاشرہ

سلطنتیں اور ادوار حکومت

اہم تاریخی واقعات، حوادث اور جنگیں

دیگر متفرقات

INDEX

"INSANI DUNYA PAR MUSALMANON KE UROOJ-O-ZAWAL KA ASAR"